پاکستان کی جنگ

پختونخواہ میں دہشت گردی سے مقابلے کے لیے حکمت عملی پر پالیسی مضامین

ترجمہ: تنویر اقبال۔ محمد اختر

مشعل

پاکستان کی جنگ

دہشت گردی سے مقابلے کے لئے حکمت عملی پر پالیسی مضامین

ترجمہ: محمد اختر۔ تنویر اقبال

مشعل

آر۔بی 5 ' سیکنڈ فلور ' عوامی کمپلیکس

عثمان بلاک ' نیو گارڈن ٹاؤن ' لاہور 54600 ' پاکستان

MashalBooks.org

پاکستان کی جنگ

ترجمہ: محمد اختر۔تنویر اقبال

کاپی رائٹ اردو (c)2011 مشعل بکس

ناشر : مشعل بکس
آر۔بی۔۵، سیکنڈ فلور،
عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیوگارڈن ٹاؤن، لاہور۔54600، پاکستان
فون وفیکس 042-35866859
E-mail: mashbks@brain.net.pk
http://www.mashalbooks.org

MashalBooks.org

ترتیب

1	بغاوت کا سیاسی پیش منظر	5
2	پاکستان میں سیاسی جماعتیں	7
3	شمالی مغربی سرحدی صوبے میں سیاست	9
4	ضمیمہ (صوبہ پختونخواہ کے چوبیس اضلاع میں نسلی، قبائلی اور سیاسی گروہ	19
5	کرّم ایجنسی میں محاذ آرائی اور تصادم	25
6	کرم میں بیرونی طالبان گروپس کا کردار	27
7	شمالی وزیرستان میں محاذ آرائی اور عسکریت پسندی	36
8	باجوڑ میں عسکریت پسندی اور تصادم	61
9	خیبر میں عسکریت پسندی اور تصادم	76
10	خیبر ایجنسی میں عسکریت پسند گروپس	80
11	مہمند میں شدت پسندی اور تصادم	88
12	جنوبی وزیرستان میں شدت پسندی اور تصادم	98
13	وزیرستان میں چھوٹے چھوٹے محسود جنگ جو گروپس	112
14	ملا نذیر مخالف وزیر گروپس	114
15	وزیرستان میں بھٹانی گروپس	115
16	جنوبی وزیرستان میں فوجی آپریشنز اور امن معاہدوں کی مختصر تاریخ (2004-08ء)	118
17	وادی سوات میں شدت پسندی اور تصادم	126
18	عسکریت اور اوراک زئی کا تنازعہ	144
19	طالبان کے مالی وسائل	205

MashalBooks.org

MashalBooks.org

بغاوت کا سیاسی پیش منظر

حسن عباس۔اپریل 2010ء

فروری 2008 کے صوبائی انتخابات میں کامیابی کے بعد ترقی پسند قوتوں کے پاکستانی شمال مغربی صوبے پر کنٹرول کے باوجود، ابھی تک وہاں استحکام ایک خواب ہی ہے اور امن وامان کی صورتِ حال بتدریج بگڑتی ہی گئی ہے جس سے صوبے میں سیاست اور عسکریت پسندی کی نوعیت اور وسعت کے مابین Correlation کے بارے میں مختلف سوالات جنم لے رہے ہیں۔ زیرِنظر مضمون حالیہ برسوں میں صوبائی صورتِ حال کو متاثر کرنے والے مختلف سیاسی اور مذہبی عناصر کی سرگرمیوں کا احاطہ کرتا ہے۔

صوبہ سرحد میں دہشت گرد حملوں کی تعداد میں ایک دم بہت اضافہ ہو گیا ہے۔ 2009ء میں پولیس، سکیورٹی فورسز، سیاسی افراد، مارکیٹوں اور سماجی تقریبات کو 49 خودکش حملوں کے ذریعے نشانہ بنایا گیا۔ صوبائی دارالحکومت پشاور بہت سے حملوں کا نشانہ بنا۔ یہ حملے عوامی نیشنل پارٹی اور پیپلز پارٹی کی مخلوط حکومت کے لیے انتہائی سنجیدہ چیلنج ہے۔ فاٹا سے آنے والے عسکریت پسندوں اور جنوبی پنجاب (جہاں فرقہ پرست اور کشمیر کے متعلق گروپ بھرتی کیے جاتے ہیں) کے جنگ جوؤں کی سرحد کے مختلف راستوں سے فاٹا میں نقل وحرکت نے صوبہ سرحد کو عسکری طور پر بے حد مخدوش بنا دیا ہے۔

صوبہ سرحد کی سماجی اور سیاسی ڈائنا مکس کا بھی، دائمی متلون مزاج قبائلی علاقوں میں پرامن ماحول کے ساتھ انتہائی پیچیدہ سا تعلق ہے فاٹا (جسے پاکستان میں عموماً علاقہ غیر کہا جاتا ہے) میں عسکریت پسندی نے ساتھ ہی واقع صوبہ سرحد میں امن وامان کی صورت حال پر عموماً اور 1980ء کے عشرے کے بعد خصوصاً منفی اثرات ڈالے ہیں۔ اسی طرح صوبہ سرحد میں ہونے والے سیاسی واقعات فاٹا کی سیاسی حرکیات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ دونوں علاقوں میں واضح مختلف سیاسی اور انتظامی ڈھانچوں کے باوجود، وہی سیاسی جماعتیں دونوں طرف کام کرتی ہیں۔ 9-2007ء کے درمیان عسکریت پسندی کے جارحانہ ابھار پر پاکستان کے حفاظتی اداروں کا ردعمل کوئی خاص تیز

MashalBooks.org

نہیں تھا، دہشت گردی کے خلاف موثر پالیسی تشکیل دینے میں حکومتی ناکامی میں سیاسی عدم استحکام کا بڑا ہاتھ تھا۔ ادھر فروری 2008ء میں منتخب ہونے والا، سیاسی جماعتوں کا اتحاد بری طرح سوات کے بحران میں الجھ کر رہ گیا، جہاں عسکریت پسندوں نے سوات (کے بڑے مراکز) اور اس کے اردگرد کے علاقوں کو فتح کرنے کے لیے سیاسی حربوں اور تشدد کا بھرپور استعمال کیا۔ 2009ء کے موثر فوجی ایکشن نے بہرحال علاقے میں حکومتی کنٹرول قائم کر دیا لیکن مالاکنڈ ڈویژن میں حالات معمول پر آنے میں ابھی کچھ وقت لگے گا۔ یاد رہے، سوات، مالاکنڈ، چترال، دیر کے اضلاع ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔

صوبہ سرحد کی یہ بحرانی کیفیت راتوں رات پیدا نہیں ہوئی۔ سالوں پہ محیط خراب حکمرانی، علاقائی تناؤ اور معاشی بدحالی نے حالات کو خراب سے خراب تر کر دیا۔ مزید براں ہمسایہ ملک افغانستان میں طالبان حکومت کے خاتمے کے بعد عسکریت پسندوں کی بڑھتی ہوئی طاقت نے بھی معاملات کے بگاڑ میں اپنا حصہ ڈالا۔ افغانستان میں غیر ملکی افواج کی طویل موجودگی اور علاقے میں بغاوت کو کھینچنے کے لیے عسکری قوت پر زیادہ سے زیادہ انحصار نے بھی صوبہ سرحد کے باسیوں پر منفی اثرات ڈالے۔

سیاسی ڈھانچہ:

پاکستان ایک وفاق ہے اور اس کی دو ایوانی مقننہ ہے، قومی اسمبلی میں اکثریتی پارٹی یا مخلوط اتحاد وزیراعظم کا انتخاب کرتا ہے جبکہ صدر کے حلقہ انتخاب میں چاروں صوبائی اسمبلیاں اور پارلیمنٹ شامل ہیں۔ شمال مغربی سرحد صوبہ پاکستان کے چار صوبوں میں سے ایک ہے۔ لیکن بعض علاقے جن میں فاٹا (وفاق کے زیر انتظام علاقہ) سرحد کے سرحدی علاقے، گلگت بلتستان (انھیں پہلے شمالی علاقہ جات کہا جاتا تھا) اور پاکستان کے زیر انتظام کشمیر شامل ہیں، خصوصی قوانین کے تحت ان کا انتظام چلایا جاتا ہے۔ ایک شاندار ریاستی ڈھانچے اور جمہوری سیٹ اپ کے باوجود پاکستانی فوج کا اس پر غیر معمولی اثر ورسوخ بھی ہے۔ 32 سال پر محیط مارشل لا کے چار ادوار نے قومی سلامتی اور خارجہ پالیسی کے معاملات میں فوج کا عمل دخل بڑھا دیا ہے۔ مزید براں، پاکستانی آئین (فوجی حکومتوں کے دوران کئی گئی ترامیم کے مطابق) نے عمومی قانونی پراسس کو معطل کر کے مختلف اختیارات صدر کو دے رکھے تھے اور یہی نہیں بلکہ وہ تو بغیر کسی وجہ کے حکومتوں کو بھی ڈس مس کر سکتا تھا۔ حال ہی میں ان آئینی دفعات کو اٹھارویں ترمیم کے ایک اصلاحاتی پیکج کے ذریعے ختم کر دیا گیا ہے اور اس طرح وزیراعظم کی سفارش کے بغیر پارلیمنٹ کو تحلیل کرنے، یک طرفہ

ایمرجنسی کے نفاذ، ججوں کی تعیناتی اور خاص طور سے افواج پاکستان کے سربراہوں کی تعیناتی کے اختیارات صدر کے پاس نہیں رہے۔

پاکستان میں سیاسی جماعتیں

پاکستان مسلم لیگ نواز:

پی ایم ایل (ن) دراصل جنرل ضیاء الحق کے فوجی دور (88-1977ء) کی پیداوار ہے۔ حقیقی مسلم لیگ جس نے قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں قومی تحریک آزادی میں اہم کردار ادا کیا تھا، 1950ء کے عشرے میں ہی شکست وریخت کا شکار ہوگئی تھی۔ اس کے بعد تقریباً ہر فوجی آمر نے اس جماعت میں روح پھونکنے کی کوشش کی تاکہ سیاسی یتیموں اور فوجی حکمرانی کے حمایتیوں کو ایک جھنڈے تلے اکٹھا کیا جائے اور اس طرح اپنے لیے سیاسی اور قانونی جواز مہیا کر سکے۔ ضیاء کی مسلم لیگ 1985ء میں پیدا ہوئی اور 1988ء میں دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ ان دو گروہوں میں سے ایک 1993ء میں نواز شریف کی قیادت میں پی ایم ایل (ن) کے نام سے ابھری۔

1990ء کے عشرے کی ابتداء اور 99-1997ء کے دوران مسلم لیگ نواز نے عوامی نیشنل پارٹی کی حمایت اور شراکت سے مخلوط حکومتیں تشکیل دیں، اکتوبر 1999ء میں جنرل مشرف کے مارشل لا نے نواز شریف حکومت کو برطرف کر دیا۔ 2001ء میں مسلم لیگ نواز ایک بار پھر دو حصوں میں تقسیم ہوگئی جب چودھری شجاعت نے علیحدہ ہو کر مسلم لیگ (ق) بنانے اور مشرف کی حمایت کا فیصلہ کیا۔

متحدہ مجلس عمل:

ایم ایم اے کی تشکیل 2001ء میں ہوئی اور اس میں درج ذیل پانچ مذہبی سیاسی جماعتیں شامل تھیں: دیوبندی نقطہ نظر کی حامل جمعیت علمائے اسلام (JUI) بریلوی عقیدے کی حامل جمعیت علمائے پاکستان، روایتی اسلام پسند جماعت اسلامی (اس کی بنیاد ابوالاعلیٰ مودودی نے رکھی تھی) شیعہ فرقے کی تحریک جعفریہ اور وہابیوں سے متاثر جمعیت اہل حدیث۔

جمعیت علمائے اسلام کی بنیاد 1945ء میں مولانا شبیر احمد عثمانی نے رکھی تھی۔ مفتی محمود نے 1970ء میں اس کا احیاء کیا۔ 1980ء کے ابتدائی سالوں میں ان کے صاحبزادے مولانا فضل الرحمان نے اس کی قیادت سنبھالی۔ 1980ء کے عشرے کے درمیان جمعیت (سیاسی اختلافات

MashalBooks.org

کے باعث) دوحصوں میں تقسیم ہوگئی۔فضل الرحمٰن کی قیادت میں جے یوآئی (ایف) اورمولانا سمیع الحق کی قیادت میں جے یوآئی (ایس)۔

1980ء کےعشرے میں افغان جہاد کے دوران جے یوآئی نے بڑااہم کردار ادا کیا۔ جمعیت علمائے اسلام کے دونوں گروپس سے متعلقہ سکولوں اور مدارس کے پڑھے ہوئے لوگوں نے طالبات میں شمولیت اختیار کر لی۔احمد رشید کے مطابق کابل حکومت میں کم از کم آٹھ طالبان وزراء سمیع الحق کے دارالعلوم حقانی کے گریجوئیٹ تھے۔2002ء میں جمعیت کے دونوں گروپس ایم ایم اے میں شامل ہوگئے۔جمعیت علمائے اسلام کے منشور کےمطابق وہ پاکستان میں ایک اسلامی ریاست کے قیام کی پابند ہے۔

عوامی نیشنل پارٹی:

یہ جماعت قوم پرست اور سیکولر نظریات کی حامل ہے۔اوراس کا تعلق معروف سرخ پوش رہنما عبدالغفار خاں سے ہے جنھیں مہاتما گاندھی سے قریبی ذاتی اور سیاسی روابط کی بنا پر سرحدی گاندھی بھی کہا جاتا ہے۔ 75-1957ء کے دوران غفار خان کے بیٹے ولی خان اس کے سربراہ رہے۔ 1975ء میں بھٹو حکومت نے متنازعہ (SEDITION) الزامات کے تحت اسے غیر قانونی قرار دے دیا۔تاہم 1986ء میں نام کی معمولی سی تبدیلی کے ساتھ جماعت کام کرتی رہی۔ اس وقت ولی خان کے بیٹے اسفندیار ولی پارٹی کے رہنما ہیں۔نیب کو سابقہ مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) میں بھی سیاسی حمایت حاصل تھی۔ 70-1960ء کے عشروں میں اسے سوویت یونین کی حامی سمجھا جاتا تھا۔نیپ سالہا سال تک بائیں بازو کےنظریات کی حامل رہی۔ اسے اے این پی کی نسبت دوسرے صوبوں میں وسیع تر سیاسی حمایت حاصل تھی۔ 90-1980ء کے دوران اے این پی (صوبائی اور وفاقی سطح پہ) مختلف حکومتوں کا حصہ رہی تاہم 2008ء تک وہ صوبہ سرحد میں اپنا وزیراعلیٰ نہیں لا سکی تھی۔پہلی دفعہ، 2008ء کے الیکشن میں اس نے سندھ اسمبلی میں کراچی کے کئی حلقوں سے (جہاں خاصی پختون آبادی ہے) بھی کئی نشستیں حاصل کیں۔

پاکستان پیپلز پارٹی:

یہ پارٹی بھی ایک ترقی پسند جماعت ہے اور اسے ملک کے گوشے گوشے میں سیاسی حمایت حاصل ہے۔ 1967ء میں ذوالفقار علی بھٹو نے دانش وروں اور سوشلسٹ ذہن رکھنے والے سرگرم لوگوں کے ایک گروپ کے ہمراہ یہ جماعت بنائی تھی۔مختلف اوقات میں اس کی حکومت رہی۔ 1971ء میں بھٹو پاکستان کے صدر بن گئے۔بعدازاں نئے آئین کے نفاذ کے

بعد وہ 77-1973ء کے دوران ملک کے وزیرِاعظم رہے۔ جولائی 1977ء میں جنرل ضیا نے ان کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور ایک متنازعہ عدالتی فیصلے کے تحت انھیں پھانسی دے دی۔ پارٹی بدستور مقبول جماعت رہی اور بھٹو کی بیٹی، بے نظیر بھٹو 90-1988ء اور 96-1993ء کے دوران ملک کی وزیرِاعظم رہیں۔ اسی دوران پی پی پی صوبہ سرحد کی مخلوط حکومتوں میں بھی اہم پارٹنر رہی۔ مارچ 2008ء میں پیپلز پارٹی نے (اے این پی کی مدد سے) نہ صرف مرکز میں حکومت بنائی بلکہ سرحد میں بھی اے این پی کی مخلوط حکومت میں شریک ہوگئی۔

شمال مغربی سرحدی صوبے میں سیاست

شمال مغربی سرحدی صوبے کی تاریخ:

اس صوبے کا جغرافیائی محلِ وقوع اس کی سیاست اور ثقافت پر گہرے اثرات ڈالتا رہا ہے مگر اسے عموماً نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ایک جانب درہ خیبر ہے جو پاکستان کو افغانستان سے ملاتا ہے اور دوسری جانب شمالی علاقہ جات ہیں جو قراقرم کی خوبصورت شاہ راہ کے ذریعے پاکستان کو چین سے جوڑتے ہیں۔ اگرچہ اسے پختونوں کی سرزمین کہا جاتا ہے مگر ثقافتی اور نسلی طور پر یہ صوبہ انتہائی متنوع ورثے اور روایات کا حامل ہے اور ایک زمانے میں عظیم ہندو اور بدھ سلطنتوں کا مرکز رہا ہے۔ آج کے لوگ ان تاریخی حقائق سے خاص واقف نہیں۔ شاید اس کی وجہ جزوی طور پر اسّی کے عشرے میں ہونے والے افغان جہاد بھی ہو جس نے علاقے کے سماجی اور سیاسی حقائق کو انقلابی طور پر بدل کر رکھ دیا۔

شمال مغربی سرحدی صوبہ خاصا متنوع علاقہ ہے۔ چترالی اور ہندکو بولنے والے (ہزارہ ڈویژن) صوبے کی آبادی کا 30% ہیں سیاست پر البتہ پختونوں کا راج ہے۔ اردو میں اسے سرحد کہا جاتا ہے۔ اپنی نسلی اور قبائلی شناخت پر نازاں پختونوں کا ایک بڑا حصہ اس نام سے مطمئن نہیں۔ انہی قوم پرست اور نسلی جذبات کا عکس، اے این پی کی، صوبے کا نام بدلنے کی کوششوں میں دکھائی دیتا ہے۔ وہ سرحد کا نام پختون خواہ رکھنا چاہتے تھے۔ خیبر کا لاحقہ لگانے پر، اس نام پر عمومی اتفاق کر لیا گیا تاہم پشتو نہ بولنے والے علاقے میں (جسے مسلم لیگ کا انتخابی گڑھ سمجھا جاتا ہے) اس نام کے خلاف شدید مزاحمت تھی۔ اسی بحث و تمحیص کی وجہ سے اٹھارویں آئینی ترمیم کو حتمی شکل دینے میں بھی مزید وقت لگا۔ پیپلز پارٹی ابتدا ہی سے اس مسئلے پر اے این پی کی حمایت کر رہی تھی۔ کیونکہ وہ مذہبی عصبیت کے بجائے، علاقے میں سیکولر شناخت کو تقویت دینا چاہتی تھی۔ نام کی تبدیلی نے ہزارہ ڈویژن کے غیر پختون علاقے میں خاصا اشتعال پیدا کر دیا ہے اور اس کے

اضلاع ہری پور، مانسہرہ، بٹ گرام، کوہستان اور ایبٹ آباد میں متشدد مظاہرے اب بھی جاری ہیں۔

صوبہ سرحد میں قبائلی تعلقات سیاسی گروہ بندیوں یا جماعتی تشکیل پر فاٹا کی نسبت کم اثر انداز ہوتے ہیں۔ فاٹا میں قبائل اپنے اپنے علاقے میں مرتکز ہونے کی وجہ سے، جغرافیائی کنٹرول کے حامل ہیں جبکہ صوبہ سرحد میں اس کے برعکس قبائل مختلف اضلاع اور شہری اور دیہاتی علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس لیے صوبے کے سیاسی منظر نامے کی تشکیل میں طبقاتی شناخت نسبتاً زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ اسی طرح مذہبی اور فرقہ وارانہ عصبیت بھی ایک اہم عنصر ہے۔ فاٹا کی نسبت صوبہ سرحد قومی دھارے میں شامل ہے اور یہاں ترقی پسند سیاسی قوتوں کا زور ہے۔ دراصل، یہاں سوویت یونین کی حامی، بائیں بازو کی جماعتوں کو تاریخی طور پر زبردست حمایت حاصل رہی ہے۔ بہتر گورننس کے ذریعے، صوبہ سرحد مضبوط معیشت کو جنم دے کر مکمل معاشی خود کفالت حاصل کر سکتا تھا۔ اس علاقے میں خاصے قدرتی وسائل موجود ہیں۔ سیاحت کے نقطہ نظر سے دلکش مقامات ہیں اور زرخیز زرعی زمین بھی کم نہیں لیکن تعلیمی شرح خاصی کم ہے، صحت کی بنیادی سہولتیں انتہائی ناکافی ہیں اور قانون کے نفاذ کی صلاحیت بہت کمزور ہے۔ غیر قانونی تجارت، اسمگلنگ اور ناکافی انفراسٹرکچر معیشت کو ترقی نہیں کرنے دیتے۔ گزشتہ سال صوبائی محکمہ خزانہ نے معاشی صورتِ حال کی تصویر کشی کچھ اس طرح کی تھی:

> ''صوبہ سرحد میں ٹیکس بیس (Base) بہت محدود ہے اور اسے اپنی آمدنی کے 92% حصے کے لیے وفاقی حکومت پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ تمام لازمی سماجی اور معاشی اشاریے دوسرے صوبوں کے مقابلے میں انتہائی کم ہیں۔ صوبے کو دہشت گردی کے خلاف جنگ کا بھی سامنا ہے جس کی بدولت بے پناہ انسانی جانیں، کاروبار اور پراپرٹی مسلسل نقصان اور تباہی کا شکار ہو رہی ہے۔''

2001ء سے صوبے کے عدم استحکام اور منفی تبدیلیوں میں تین عوامل کا اہم کردار رہا ہے۔ پہلا: 7-2002ء کے دوران ایم ایم اے کی حکومت کی سیاست اور اس کی کارکردگی۔ دوسرا: صوبہ سرحد کے مدرسوں میں اصلاحات کا نہ کیا جانا اور تیسرا: پڑوسی علاقے فاٹا میں بغاوت (اس بغاوت کی بنیادی وجوہات میں عشروں تک معاملات سے ریاستی عدم توجہی اور سرحد پار (افغانستان میں) مسلسل جنگی صورتِ حال ہیں۔

ایم ایم اے کی حکومت 2002ء میں انتخابات جیت کر تشکیل پائی تھی لیکن 2008ء کے عام انتخابات میں اس کا صفایا ہو گیا کیونکہ اس حکومت نے اپنے ہی حامیوں کو بھی بری طرح مایوس کیا تھا۔ کرپشن، اقرباء پروری اور نااہلیت اس دور کا خاصا رہیں حالانکہ ایم ایم کی حکومت اپنی

MashalBooks.org

بدعنوانیوں کے خاتمے کے وعدے پر اقتدار میں آئی تھی۔ وہ انصاف کی فراہمی اور نوکر شاہی کو عوام کے سامنے جواب دہ بنانے کے وعدے پورے کرنے میں بری طرح ناکام رہی۔ ایم ایم اے کی پالیسیوں کی بدولت شہری آزادیاں محدود ہوئی۔ ترقی پسندانہ قانونی اصلاحات رک کر رہ گئیں اور مذہبی رواداری بری طرح متاثر ہوئی۔ خواتین کے حقوق کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ یہی حال مدرسوں کی اصلاحات کا ہوا۔

سائنسی تعلیم کی شمولیت اور غیر ملکی طلبہ کی رجسٹریشن ان اصلاحات کا اہم حصہ تھے۔ اس کے برعکس ایم ایم اے نے عام تعلیمی نظام کو بھی اسلامائز کرنا شروع کر دیا اور پبلک ٹرانسپورٹ اور گانے بجانے پر پابندی عائد کر دی۔ سرحد اسمبلی نے قانون پاس کیا کہ خواتین کا علاج صرف خواتین ڈاکٹرز ہی کر سکتی ہیں۔ یہ اندازہ ہی محال ہے کہ علاج معالجے کے لیے خواتین ڈاکٹرز کی موزوں تعداد نہ ہونے کی بنا پر، مریض عورتوں کو، خصوصاً دیہی علاقوں میں کن مشکلات اور خطرات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔

جولائی 2005ء میں اہم ترین پیش رفت یہ ہوئی کہ اسمبلی نے (اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے) حسبہ بل پاس کر دیا جو ایم ایم کے رہنماؤں کے اپنے فہم و ادراک اور تصورات کا عکاس تھا۔ اپوزیشن جماعتوں کی زبردست مخالفت اور وفاقی حکومت کے اعتراض کے باوجود ایم ایم اے کی حکومت متنازعہ شریعت بل کے معاملے کو آگے بڑھاتی گئی۔ انتہائی قابل اعتراض قانونی دفعہ وہ تھی جس کے ذریعے (سرحد میں ایسے ادارے بنائے گئے جن میں) ایم ایم اے کے مذہبی اتحاد منسلک مولویوں کو قاضی کے برابر عہدے کی ملازمتیں دی جا سکتی تھیں۔ محتسب کا نیا عہدہ تخلیق کیا گیا جس کے ذریعے پبلک کرپشن کی روک تھام کی جاتی اور لوگوں کے انفرادی اور اخلاقی کردار پر نظر رکھی جاتی۔ پشاور میں ایسے بڑے بڑے بل بورڈز کو، جن پر خواتین ماڈلز کی تصاویر تھیں، سیاہ کر کے، صوبے میں خوف و ہراس کی فضا پیدا کر دی گئی۔

سپریم کورٹ نے قانون کی بہت سی شقوں کو غیر آئینی قرار دے دیا تو ایم ایم اے حکومت نے ان قانونی شقوں کو نیا نام دے کر اور قواعد و ضوابط میں تبدیلی لا کر، نہ صرف چیک اینڈ بیلنس کے نظام کو نظر انداز کیا بلکہ سپریم کورٹ کے احکامات کی بھی صریحاً خلاف ورزی کی۔

جنرل پرویز مشرف نے ایم ایم اے کی بہت سی دست درازیوں سے صرف نظر کیا کیونکہ انھیں صدر اور آرمی چیف کے عہدوں پر فائز رہنے کے لیے قومی اسمبلی میں ان کے ووٹوں کی حمایت درکار تھی۔ مشرف کے ساتھ، پس منظر میں موجود، اس اتحاد کی بدولت ہی ایم ایم اے کو ''ملا ملٹری الائنس'' کا مشہور نام ملا۔ پاکستان انسانی حقوق کمیشن کے سابقہ سربراہ اور سرحد حکومت کے

MashalBooks.org

موجودہ سفیر برائے امن افراسیاب خٹک کے مطابق ''2002ء کے الیکشن میں ایم ایم اے کی زبردست فتح محض ایک اتفاق نہیں تھا بلکہ یہ فوج کی سیاسی منصوبہ بندی کا باقاعدہ حصہ تھا۔ مذہبی انتہا پسندوں کے خطرے کی عدم موجودگی، مغربی طاقتوں کی نظر میں فوج کی افادیت ختم کر سکتی تھی۔'' اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے برآئن کلاؤلی (Brian Cloughley) رقم طراز ہے:

''بدقسمتی سے مشرف نے اس موقع پر بائرن کے تجربے سے فائدہ اٹھایا جس نے پروں کو بے پناہ قوت دے کر فولاد کو متحرک کر دیا تھا۔ 2002ء میں انہوں نے بکھرے ہوئے مذہبی گروہوں کی انتخابی مہم کی بھرپور حمایت کی اور اس طرح دو بڑی قومی سیاسی پارٹیوں کو ایک کنارے پر لگا دیا۔ اسی طرح انٹرنیشنل کرائسس گروپ کی ایک فکر انگیز رپورٹ کچھ یوں بتاتی ہے۔ ''اقتدار پر مکمل گرفت کرنے کے لیے، مشرف کی حمایت کے صلے میں، ایم ایم اے کو اسلامائزیشن کا ایجنڈا آگے بڑھانے کی کھلی چھٹی مل گئی۔''

اے این پی اور پیپلز پارٹی کی 2008ء میں انتخابی فتح دراصل ایم ایم اے کی متنازعہ پالیسیوں کے خلاف شدید عوامی ردعمل کا نتیجہ تھی۔ لیکن ایم ایم اے کی پانچ سال سے زاید حکمرانی نے انھیں اپنی کئی پالیسیوں کو ادارتی شکل دینے میں مدد کی۔ مثلاً انتہا پسند نظریات کے حامل بہت سے افسروں کو اہم جگہوں پر لگا دیا گیا اور اس طرح حکومتی شعبوں میں ان کے وسیع رابطے پیدا ہو گئے۔ مدرسوں پر بھی اس کا اثر اہم تھا۔ یہ مذہبی سکول اسّی کے عشرے میں جنرل ضیا کی فوجی حکومت کی سرپرستی میں قائم کیے گئے تھا تاکہ وہ افغانستان میں جنگ کے لیے افغان مہاجرین کی بھرتی، ذہنی تیاری اور جنگی تربیت کا کام سرانجام دے سکیں۔ ایک بین الاقوامی کرائسس گروپ کی رپورٹ کے مطابق، جمعیت علمائے اسلام کی زیرنگرانی چلائے جانے والے یہ مدرسے، پاکستان کی قبائلی پٹی میں مذہبی اور سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے جہادی کلچر کی حوصلہ افزائی میں انتہائی اہم کردار کے حامل تھے۔ 1990ء کے عشرے میں بھی یہی رجحان جاری رہا۔ گزشتہ عشرے میں ان مدرسوں میں انتہا پسندی کے خاتمے کے لیے کچھ نیم دلانا کارروائیاں بھی کی گئیں مگر ایم ایم اے کی حکومت نے (7-2002ء) انھیں بھی ایک حد تک ہی محدود رکھا۔ پاکستان کے قانون نافذ کرنے والے اداروں کی ایک قابل اعتماد رپورٹ کے مطابق، مالاکنڈ ڈویژن میں خودکش بمباروں کے تربیتی کیمپوں کو 2009ء میں سوات کے علاقے میں فوجی آپریشن کے دوران ختم کیا جا سکا۔ ظاہر ہے یہ ایم ایم اے کی حکومت کے دوران ہی قائم ہوئے ہوں گے۔ کیونکہ علاقے میں انہی دنوں میں تشدد پسندی زیادہ متحرک ہو رہی تھی۔ بعض مدرسے آج بھی مذہبی نفرت اور انتہا پسندی کا ماحول پیدا کرنے میں مشغول ہیں۔

سرحد میں موجود رجحانات:

شدت پسندی کی نشوونما: مشرف کے دور صدارت میں خصوصاً (7-2004ء کے دوران) دہشت گردی کے خلاف کارروائی میں ایم ایم اے (کی چشم پوشی نے) طالبان کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ علاقے میں اپنے نیٹ ورکس قائم کرلیں۔ سیاسی اور سماجی حلقے انتہائی پسندی کے خلاف سخت اقدامات کرنے پر زور دیتے رہے مگر ایم ایم اے حکومت نے ان پر کان نہیں دھرے۔ طالبان نے اپنے پیر جماتے ہی فاٹا میں فوجی اور حکومتی انفراسٹرکچر پر حملے شروع کر دیئے۔ لیکن ابتداً سرحد میں انہوں نے حکومت سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی اور وہاں، وہ بعض نظریاتی موضوعات، مثلاً: لڑکیوں کے سکولوں، قدیم بدھ پگوڈوں، خواتین کے حقوق کی سرگرم اراکین، ویڈیو اور میوزک کی دوکانوں اور حجاموں کی دوکانوں (جہاں اسلام پسندوں کی خواہش کے خلاف داڑھیاں مونڈی جاتی ہیں) پر اپنی توجہ مرکوز کیے رہے۔ 2005ء کی ابتداء میں شدت پسندوں نے صوبہ سرحد میں خواتین کو وارننگ دینا شروع کردی کہ وہ بغیر برقع کے گھر سے باہر نہ نکلیں، یہ تحریک صوبہ سرحد کے جنوبی علاقوں، ٹانک، ڈیرہ اسماعیل خان، لکی مروت اور بنوں سے شروع ہوئی اور جنوبی اور شمالی وزیرستان تک پھیل گئی جو فاٹا میں طالبان کی سرگرمیوں کا اہم ترین مرکز تھے۔ کچھ وقت کے بعد یہی سرگرمی شمال میں بھی کوہاٹ، چارسدہ، مردان، دیر، سوات اور سرحد کے دارالحکومت پشاور اور نزدیکی علاقوں کرم، اورکزئی، خیبر اور مہمند ایجنسی تک پھیل گئی۔

ظاہر ہے سرحد میں ہونے والی عسکریت پسند سرگرمیوں کے ڈانڈے براہ راست فاٹا میں پیدا شدہ صورت حال سے جا ملتے تھے۔ مثلاً وزیرستان اور خیبر ایجنسیوں میں 6-2004ء کے دوران ہونے والے ''امن معاہدوٗ'' کے بعد، سرحد میں انتہا پسندوں کی سرگرمیوں میں زیادہ شدت پیدا ہوگئی۔ فاٹا سے شدت پسندوں کی سرحد میں دراندازی کو مانیٹر کرنے کے لیے ایم ایم اے کی حکومت نے کوئی حفاظتی قدم نہیں اٹھائے۔ شدت پسندوں اور پاکستان کی مذہبی سیاسی جماعتوں میں کافی نظریاتی قدر مشترک کے ساتھ ساتھ ان کی معاشرتی حمایت کا حلقہ بھی لگ بھگ ایک ہی ہے۔ ایم ایم اے کی کئی اتحادی جماعتیں، خصوصاً جمعیت علمائے اسلام کے دونوں (سمیع اور فضل الرحمٰن گروپ) حصوں کے مدرسوں میں سے فاٹا میں شدت پسندوں کے تربیتی کیمپوں کے لیے، افرادی قوت مہیا ہوتی ہے۔ 2009ء میں صورتِ حال کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک صحافی طلعت فاروق نے یہ دلیل دی:

''نائن الیون کے بعد طالبان اور القائدہ کے عناصر، جنھیں اپنے پاکستانی ہمدردوں کی مکمل

MashalBooks.org

حمایت حاصل تھی، سرحد پار کر کے فاٹا میں آ گئے۔ نتیجتاً، جنرل مشرف کی اس دورخی پالیسی کی وجہ سے پاکستانی طالبان کو مضبوط ہونے کا موقع ملا۔ اس پالیسی کو نہ مذہبی جماعتوں نے اور نہ ہی قدامت پسندوں نے کبھی تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مقامی جرائم پیشہ گروہوں، ڈرگ مافیا، ہتھیار فروخت کرنے والوں اور غیر ملکی سرپرستوں کی بھرپور مدد سے، یہ لوگ طاقت پکڑتے چلے گئے۔''

فاٹا اور صوبہ سرحد کے درمیان چھ قبائلی علاقوں میں موجود نوکر شاہی کے نمائندے بھی بڑھتی ہوئی شدت پسندی کے بارے میں وفاقی حکومت کو الرٹ کرنے میں ناکام رہے۔ ایک طرف نوکر شاہی کی نااہلیت تھی اور دوسری جانب ان کی شدت پسندوں سے ہمدردیاں، دونوں ہی باتیں بروقت روبہ عمل تھیں۔

سرحد میں آج پشاور اور اردگرد کے علاقوں کو انتہائی سنگین مسائل کا سامنا ہے جہاں طالبان اور ان کے حامی شدت پسند جب چاہتے ہیں، سرکاری عمارتوں، قانون نافذ کرنے والے حکام اور اے این پی اور پیپلز پارٹی کے رہنماؤں کو نشانہ بنا ڈالتے ہیں۔ پشاور اور اس کے گردونواح میں 2010ء کے ابتدائی مہینوں میں سکولوں پر ان کے حملے ایک اور پریشان کن رجحان کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اکتوبر 2009ء میں جنوبی وزیرستان میں فوجی آپریشن کے نتیجے میں 221 افراد مارے گئے اور تقریباً 500 افراد زخمی ہوئے۔ کسی حد تک یہ صورتِ حال خیبر ایجنسی کے دو گروہوں لشکر اسلام اور انصار الاسلام کے مابین ٹکراؤ کے مرہون منت بھی تھی لیکن تحریک طالبان پاکستان بھی وہاں اتنی ہی سرگرم ہے اور اس نے سرحد میں ہونے والے بہت سے دہشت گرد حملوں کی ذمہ داری قبول بھی کی ہے۔ انہوں نے واضح طور پر یہ کہا کہ پشاور کے پرل کانٹینینٹل ہوٹل پر حملہ دراصل فاٹا کی اورک زمی ایجنسی کے ایک دوسرے پر حملے کا جواب تھا۔ طالبان کے دعوؤں سے قطع نظر، اس کی تمام سرگرمیاں، ایک خاص علاقے میں اس کے لاجسٹک نیٹ ورک (مضبوط) پر منحصر ہوتی ہیں۔ بہت سے شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ پشاور میں ہونے والے اکثر دہشت گرد حملوں کا مرکز قریبی خیبر ایجنسی کا ایریا ہی رہا ہے۔ تحریک طالبان پاکستان کے ان حملوں کے پیچھے ایک اہم وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ پشاور کے مضافات میں مقامی جرگوں کے ذریعے، مقامی لشکر ترتیب دیئے گئے ہیں جنھیں طالبان کے حملوں کو روکنے کے سلسلے میں پولیس اور صوبائی انتظامیہ کی مکمل حمایت حاصل ہے۔

سوات اور فوج:

Mashalbooks.org

سوات میں صوفی محمد کی تحریک نفاذ شریعت محمدی (TNSM) کی شدت پسندی سے براہِ راست ٹکراؤ سے پہلے، حکومت نے ایک لمبے عرصے تک خاصے صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا۔ 2009ء کے وسط میں، جب حفاظتی اداروں نے ضلع سوات میں شدت پسندی کا خاصی حد تک صفایا کیا نتیجتاً اس کے انتہائی نزدیکی علاقوں میں 20 لاکھ سے زاید بے خانماں افراد کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا تو سول حکومت حیرت زدہ رہ گئی حالانکہ فوجی حکام اسے اس امکان کے بارے میں خبردار کر چکے تھے۔ عارضی اور نامکمل حفاظتی اقدامات کی بدولت بہت سے انتہا پسند گرویوں کو ان بے گھر افراد کے درمیان اثر و رسوخ بڑھانے کا موقع مل گیا۔ مثلاً جماعت اسلامی کی تنظیم ''الخدمت'' اور جماعت دعوۃ نے اپنے نئے روپ ''فلاحِ انسانیت'' کے ذریعے سوات کے علاقے میں فلاحی کیمپ قائم کر لیے تاکہ نیک نامی کما سکیں اور مستقبل کے لیے ممکنہ کارکنوں کو متاثر کر سکیں۔ اگرچہ ان گروہوں کی یہ ساری سرگرمیاں انسانی فلاح و بہبود کے حوالے سے تھیں لیکن اس صورتِ حال میں حکومتی ناکامی نے شدت پسندوں کی علاقے میں اثر و نفوذ کے امکانات کو مزید بڑھا دیا۔

جب حالات حد سے زیادہ بگڑ گئے اور امریکی دباؤ میں بھی شدت آ گئی تو حکومت نے تحریک نفاذ محمدی کے خلاف کریک ڈاؤن شروع کر دیا۔ کئی ہزار شدت پسندوں کے خاتمے کی اطلاعات بھی آئیں لیکن تحریک کا رہنما مولانا فضل اللہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ عوامی اور سیاسی حمایت کی بدولت، فوج کو شدت پسندوں کے خلاف بھرپور ایکشن لینے میں بہت مدد ملی۔ تاہم سوات کی صورتِ حال کے بارے میں بہت سے سوال ابھی تک عقدۂ لاینحل ہیں۔ مثلاً 8-2007ء کے دوران فضل اللہ کا ایف ایم ریڈیو، جسے اس نے پراپیگنڈے اور رابطے کا ذریعہ بنایا ہوا تھا، بند کیوں نہیں کیا جا سکا؟ وہ ریڈیو پر ہی لڑکیوں کے سکولوں کی استانیوں اور طالبات کو دھمکیاں دیا کرتا تھا اور 2008ء میں پولیس کے ایک محاصرے کے دوران اسے وہاں سے بچ نکلنے کی اجازت کیوں دی گئی؟ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ حفاظتی اداروں کی نااہلی کی وجہ سے ہوا جبکہ بعض سمجھتے ہیں کہ فضل اللہ نے اپنی شدت پسند مہم کے آغاز میں ہی حفاظتی اداروں سے کوئی ڈیل کر لی تھی۔ پاکستانی فوج نے اب ان معاملات کی طرف توجہ کی ہے۔ اس نے پولیس کے پانچ ہزار افراد کو دہشت گردی کے خاتمے اور اس کے طور طریقوں سے نمٹنے کے لیے بھرپور ٹریننگ دی ہے۔

سوات کے جھگڑے میں مالاکنڈ ڈویژن کے قریب واقع ضلع صوابی کے پانی پیروں کا بھی بڑا موثر کردار رہا۔ پانی پیر وسعودی وہابیت کو مقامی رنگ دے کر، اس نظریے کی پیروی کرتے ہیں۔ پاکستان میں اس نظریے کے پیش رو مولانا طاہر تھے۔ مولانا طاہر آئی ایس آئی کے ایک اہم رکن میجر عامر کے والد ہیں۔ وہی میجر عامر جس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے بے نظیر بھٹو کی

پہلی حکومت کا تختہ الٹنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ میجر عامر کے بھائی مولانا طیب کے پانی پیر میں قائم مدرسے کا پاکستان میں انتہا پسند لیڈروں سے خاصا گہرا تعلق ہے۔ ان لیڈروں میں تحریک نفاذِ محمدی کے صوفی محمد، باجوڑ کے طالبان کمانڈر مولوی فقیر محمد اور خیبر ایجنسی کے بدنام زمانہ دہشت گرد منگل باغ شامل ہیں۔ تحریک نفاذ محمدی کا ملٹری چیف فضل اللہ بھی پانی پیر گروپ سے بہت متاثر تھا۔ 1980ء کے عشرے میں یہ مدرسہ نہ صرف افغان جنگ کے لیے بھرتی کا اہم مرکز رہا بلکہ اس دوران اہم ترین تزویراتی منصوبہ بندی کے لیے تھنک ٹینک کا کردار بھی ادا کرتا رہا۔

صوبہ سرحد میں سیاسی پارٹیوں کی طاقت اور ان کا کردار:

2002ء کے انتخابات میں ایم ایم اے کی فتح کے بعد، سرحد کی سیاسی ڈائنامکس میں تیزی سے تبدیلیاں آئیں۔ 2008ء میں اے این پی کی کوہاٹ، ہنگو، نوشہرہ اور پشاور میں کامیابی اور اسی طرح پیپلز پارٹی کی نوشہرہ، ڈی آئی خان، اپر دیر، لوئر دیر اور سوات میں فتح یابی بہت اہم تھیں کیونکہ یہ علاقے ہمیشہ سے مذہبی جماعتوں کا گڑھ سمجھے جاتے تھے لیکن ووٹروں نے جمعیت علمائے اسلام اور جماعت اسلامی کو مکمل طور پر مسترد کر دیا کیونکہ وہ طالبانائزیشن کی کاروائیوں کو مقتدر مذہبی جماعتوں کی پشت پناہی سے تعبیر کر رہے تھے۔ ماہر تعلیم جوشواواہٹ کے مطابق، جو سرحد کا تجزیاتی مطالعہ کر رہا تھا، ایم ایم اے کی شکست کی اہم توجیہ یہ بھی دی جا سکتی ہے کہ اس کی کولیشن حکومت کو تعلیم، صحت اور انٹی کرپشن پالیسیوں میں واضح ناکامی کا سامنا تھا اور ساتھ ہی ساتھ وہ عمومی پاکستانی سیاست کے رجحانات کے برعکس نظریات پر اٹکے ہوئے تھے۔ (ایم ایم کے دور میں) نوکر شاہی کی کرپشن اور نااہلی کے بارے میں تو مقامی میڈیا میں بے تحاشا شور مچتا رہا۔

مارچ 2008ء میں اے این پی اور پیپلز پارٹی کی کولیشن حکومت وجود میں آئی تو عوام کو ان سے بہت توقعات تھیں لیکن ان کا حسن ظن زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکا کیونکہ اے این پی نے فوراً ہی سوات میں امن و امان قائم کرنے کے لیے، تحریک نفاذ محمدی سے مذاکرات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اے این پی رہنماؤں کو فاٹا میں تحریک طالبان پاکستان اور سوات میں تحریک نفاذ محمدی کے حمایتیوں کی جانب سے مسلسل قاتلانہ حملوں کا سامنا تھا۔ اے این پی کے کارکنوں اور لیڈروں کو منظم طریقے سے نشانہ بنایا جا رہا تھا، انھیں عوامی منظر نامے سے ہی غائب ہونے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ یہ دھمکیاں اور حملے آج بھی جاری ہیں۔ تحریک نفاذ شریعت محمدی سے اپنے مذاکرات کے آغاز کی وجوہات اے این پی نے یوں پیش کیں کہ اگر فوج ہی طالبان کی بڑھتی ہوئی آفت کا مقابلہ کرنے میں دلچسپی نہیں رکھتی تو ہم اپنی جانیں کیوں قربان کرتے پھریں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اے این

پی کے لیڈر اسفندیار ولی نے مئی 2008ء میں واشنگٹن کا خفیہ دورہ کیا تا کہ وہ امریکی حکومت کو متوقع معاہدے کے بارے میں اعتماد میں لے سکیں۔ اور بالآخر 2008ء میں اے این پی نے تحریک کے قائد صوفی محمد سے، جو اس وقت جیل میں تھے اس امید پر معاہدہ کر لیا کہ وہ اپنے داماد فضل اللہ کی زیر قیادت لڑنے والے جنگجوؤں کو اعتدال پسندی پر راضی کر لیں گے۔

وزیر اعلیٰ سرحد، امیر حیدر خاں ہوتی نے اس کی یوں وضاحت کی۔ ''سیاسی ڈائیلاگ ہماری پالیسی ہے اور اسی کے ذریعے کوئی راستہ کھلے گا۔ انہوں نے صوفی محمد کی رہائی کا بھی یہ کہتے ہوئے دفاع کیا۔ ''انھیں انسانی بنیادوں پر رہا کیا گیا۔'' تاہم صوفی محمد نے اپنی رہائی کے فوراً بعد ہی ''خفیہ'' معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے متنازعہ بیانات دینا شروع کر دیئے۔ مثلاً انہوں نے واضح انداز میں کہا کہ جمہوریت غیر اسلامی ہے۔ انہوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ خواتین صرف حج کی غرض سے ہی اپنے گھروں سے باہر نکلیں۔ انھیں طبی علاج معالجے کے لیے بھی گھر سے باہر نہیں نکلنا چاہیے۔

اس قسم کے متشددانہ پبلک بیانات نے پاکستانی سیاست کو ہلا کر رکھ دیا اور اس پر مستزاد امریکی دباؤ تھا چنانچہ زرداری حکومت اور فوج کے سامنے تحریک نفاذ شریعت محمدی کے معاملے کو سنجیدگی سے نمٹانے کے علاوہ کوئی اور چارہ کار نہ رہا، سو آپریشن راہ راست کے ذریعے تحریک کو نہ صرف سوات سے بے دخل کر دیا گیا بلکہ انھیں اس قابل بھی نہیں رہنے دیا گیا کہ وہ دوبارہ علاقے پر اپنی گرفت کر سکیں۔ انسانی حقوق کے لیے سرگرم گروپس کا کہنا ہے کہ اس دوران فوج نے انسانی حقوق کی شدید خلاف ورزیاں کیں تاہم فوج نے ایسی کسی بھی کارروائی سے صریحاً انکار کیا ہے۔ تاہم اس صورتِ حال نے اے این پی کی ریپوٹیشن کو شدید نقصان پہنچایا اور اس کی سیاسی حمایت میں خاصی دراڑیں پڑ گئیں۔ اس کا ایک امکانی نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آنے والے انتخابات میں مذہبی جماعتیں دوبارہ اقتدار میں آ جائیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک نئی ہارڈ لائن قوم پرست جماعت وجود میں آ جائے۔

سیاسی اثرات کچھ بھی ہوں، سرحد میں طالبان مخالف جذبات بہرحال عروج پر ہیں۔ نومبر، دسمبر 2009ء کے ایک سروے کے مطابق سرحد کے باشندوں میں سے صرف 1% لوگوں کی رائے میں طالبان کا کوئی مثبت اثر ہے جبکہ جون 2009ء میں یہی شرح 11% تھی۔ سرحد میں 2009ء کے آخر سے 2010ء کے ابتدائی مہینوں میں خودکش حملوں اور فوجی آپریشن کی وجہ سے عوامی تکالیف اور پریشانیوں میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔ معاشی مواقع اور ترقیاتی فوائد سے محرومی کی بدولت سرحد (کے اور بالخصوص اس) سے منسلک علاقوں کے مایوس نوجوان متشددانہ رجحانات کا

شکار ہو کر، قومی منظر میں نظر آتی سیاسی جماعتوں میں شامل ہونے کے بجائے، عسکری گروہوں کے ساتھ جا رہے ہیں۔

عمومی عوامی پریشانیاں:

طالبان نوجوانوں کی بھرتی کے لیے سرحد میں موجود عمومی مسائل اور مشکلات کا بھرپور طریقے سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ بہت سے پختون اس صورت حال میں عجیب بے بسی کا شکار ہیں۔ انھیں لگتا ہے کہ جیسے طالبان، پاکستان اور امریکہ سبھی پختونوں پر حملہ آور ہیں۔ بعض پختون نالاں ہیں کہ آہستہ آہستہ سارے پاکستانی انھیں طالبان کا حامی اور عادی تشدد پسند سمجھنے لگے ہیں۔ یہ سماجی مسائل معاشی مشکلات کے (اور انھیں حل کرنے میں وفاقی حکومت کی نااہلی) کے ساتھ مل کر مزید گمبھیر ہوتے رہے ہیں۔ پشاور میں سرحد کے چیمبر آف کامرس کے مطابق، جنوری 2009ء میں صوبے کے پچیس سو صنعتی اداروں میں سے صرف پانچ سو چورانوے ادارے چل رہے تھے۔ شہری اس بات پر بھی نالاں ہیں کہ پولیس اور امن عامہ کے ذمہ دار سول ادارے انھیں مناسب تحفظ فراہم کرنے میں بری طرح ناکام ہو گئے ہیں حالانکہ زیادہ تر انہی حفاظتی اداروں کے افراد دہشت گردوں کا نشانہ بنتے نظر آتے ہیں۔

مستقبل کے امکانات:

سرحد کا مستقبل طے کرنے میں سیاسی جماعتوں کی گھٹتی بڑھتی حمایت ہی نہیں، کئی اور عوامل بھی اثر انداز ہوں گے۔ 2009ء میں فاٹا میں کی گئی سیاسی اصلاحات کی کامیابی یا ناکامی کا بھی اہم حصہ ہو گا۔ ان اصلاحات کا مقصد سیاسی عمل میں شراکت میں اضافہ اور اجتماعی فوجداری سزاؤں کو محدود کرنا ہے۔ اسی طرح جنوبی پنجاب میں سیکورٹی آپریشن بھی کم اہم نہیں جہاں بہت سے دہشت گرد، جنوبی وزیرستان کے فوجی آپریشن کے دوران، (2009ء کے آخر میں) جا چھپے تھے۔ اگر ان لڑاکوں کا خاتمہ نہیں کیا جاتا تو وہ دوبارہ علاقے میں اپنی دہشت گردانہ کارروائیاں کر سکتے ہیں۔ مزید برآں، پنجاب میں حکومتی پریشر انھیں دوبارہ فاٹا یا سرحدی علاقوں کی طرف دھکیل سکتا ہے چنانچہ صوبہ سرحد میں پولیس اصلاحات بھی اتنی ہی اہم ہیں تاکہ مستقبل میں پولیس مقامی شدت پسندی کا اسی طرح مقابلہ کر سکے جیسے آج کل فوجی کارروائی کے ذریعے ہو رہا ہے۔ دہشت گردی سے پاک حکومتی فعالیت اور اعتماد کی بحالی بھی اہم عوامل ہیں جو سرحد کی عوامی نفسیات پر مثبت اثرات پیدا کریں گے معاشی ترقی بہر حال اہم ترین کردار کی حامل ہو گی اور آخر میں شدت پسند عناصر میں سے ایسے لوگوں کی واضح تمیز پیدا کرنا ہو گی جنھیں دوبارہ معاشرے میں جذب کیا جا سکتا ہے۔ سوات کی صورتِ حال میں بھی یہ دیکھا گیا کہ شدت پسندوں میں گھر جانے کے بعد،

بہت سے لوگوں کو جب کوئی دوسرا راستہ نظر نہیں آیا تو انہوں نے ان کا ساتھ دینا شروع کر دیا تھا۔ شکستہ حال لوگوں کی مدد کے لیے، مقامی لوگوں کو اختیارات کا دیا جانا تاکہ وہ ان میں اچھے مستقبل کا تصور پیدا کرسکیں، عوام میں امید کی نئی روشنی پھیلا سکتا ہے۔ پختونوں میں مایوسی اور محرومی کو بہتر حکومتی اقدامات اور مکمل تحفظ کے احساس کے ذریعے ختم کیا جانا چاہیے۔ عوامی سطح پر موجود مایوسی اور محرومی کے خاتمے کے بعد ہی حکومت کو ان مخالف شدت پسند گروہوں سے بات چیت کا سوچنا چاہیے جن کے ساتھ مصالحت ممکن ہے۔

پختون تاریخ اندرونی تنازعات اور متشدد قبائلی رقابتوں سے عبارت ہے تاہم انھیں اپنے اندرونی قبائلی اختلافات کو بات چیت کے ذریعے حل کرنا بخوبی آتا ہے کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ کبھی بھی اپنا نسلی وجود برقرار نہ رکھ سکتے۔ لیکن ایسے مذاکرات کے موثر ہونے کے لیے ریاستی عمل داری کا استحکام بہت ضروری ہے۔ فوجی ایکشن سول سوسائٹی اور سیاسی عناصر کے لیے صرف ایک موقع فراہم کرسکتا ہے کہ وہ صورت حال کو سنبھالا دیں اور تعمیرنو کی ذمہ داریاں ادا کرنا شروع کر دیں۔ سرحد میں اہم سیاسی قوتوں کو چاہیے کہ وہ 2009ء کے سوات آپریشن اور اس کے نتیجے میں پیدا شدہ صورتِ حال کا پوری طرح غیر جذباتی تجزیہ کریں تاکہ آئندہ کبھی صوبے کے کسی بھی حصے میں ایسے خطرناک حالات اور چیلنجز کو رونما ہونے سے روکا جاسکے۔

ضمیمہ

صوبہ پختونخواہ کے چوبیس اضلاع میں نسلی، قبائلی اور سیاسی گروہ

(1) ضلع ایبٹ آباد: یہاں بڑی برادریاں سردار، عباسی، جدون، تنولی، سیّد، اعوان اور راجپوت ہیں۔ عباسی اور جدون اکثریت میں ہیں اور بہت بااثر خاندان ہیں جو برادری کے طور پر اکٹھے ...... رہتے ہیں۔ چند ہندو اور سکھ خاندان بھی یہاں رہتے ہیں لیکن اکثریت سنی ہے جو دیوبندی مسلک سے تعلق رکھتی ہے۔ ایبٹ آباد شہر کے اردگرد شیعہ آبادیاں بھی ہیں۔ یہاں کے ممتاز لوگوں میں امان اللہ خاں جدون، ائیر مارشل اصغر خاں، سردار یعقوب، گوہر ایوب اور سردار مہتاب خاں شامل ہیں۔ اس ضلع میں مسلم لیگ نون کا زیادہ اثر ہے۔ 2008ء کے انتخابات میں قومی اسمبلی کی تینوں نشستیں نون لیگ نے جیتی تھیں۔ صوبہ کے نام خیبر پختونخواہ رکھنے کے بعد یہاں اپریل 2010ء میں صوبہ ہزارہ کے قیام کے لئے تحریک چلائی گئی تھی۔

(2) **ضلع بنوں**: اس ضلع میں جو بڑے پختون قبیلے آباد ہیں ان میں نبوچی، وزیر، مروت، بھتانی اور دور شامل ہیں۔ نبوچی قبیلے کے لوگ زیادہ تر بنوں شہر میں رہتے ہیں۔ وزیر شہر کے نواحی علاقوں میں آباد ہیں۔ دور قبیلے کے لوگ جو فاٹا کی شمالی وزیرستان ایجنسی سے تعلق رکھتے ہیں وہ بھی اس علاقے میں آباد ہو گئے ہیں اور یہاں کاروبار کرتے ہیں۔ فاٹا کے اثرات کی وجہ سے صوبے کے دوسرے علاقوں کے مقابلے میں بنوں میں جرگہ سسٹم بہت مضبوط ہے۔ ضلع میں عیسائی، ہندو اور احمدی بھی تھوڑی تعداد میں آباد ہیں۔ اس ضلع میں جمعیت علماء اسلام (فضل الرحمٰن)، عوامی نیشنل پارٹی اور کسی حد تک پیپلز پارٹی کا اثر ہے۔ باز محمد خاں (اے این پی) اور اکرم خاں درانی (جے یو آئی ایف) ضلع کے بااثر سیاسی رہنما ہیں۔ 2008ء کے انتخابات میں مولانا فضل الرحمٰن اسی ضلع سے کامیاب ہوئے تھے۔

(3) **ضلع بٹ گرام**: اس ضلع کی بڑی برادری گجر، سواتی، اخون خیل اور سیڑا خیل ہے۔ سیاسی میدان میں سواتی بہت زیادہ بااثر ہیں لیکن اخون خیل، جو ملائی کے علاقے میں آباد ہیں وہ بھی اثر رکھتے ہیں۔ ضلع میں سیاسی گروہ بندی کے بجائے قبائلی گروہ بندی الیکشن میں اثر انداز ہوتی ہے۔ بٹ گرام کا مدرسہ دارالعلوم اشاعت الاسلام، جس کے مہتمم ایم ایم اے کے قاری محمد یوسف ہیں اپنی شدت پسندی کے لئے مشہور ہے۔ سیاست دانوں میں ملنگ خاں اور یوسف خاں زیادہ اثر و رسوخ رکھتے ہیں۔ مسلم لیگ (ن) کا یہاں زیادہ اثر ہے۔ 2008ء کے انتخابات میں اسی کا امیدوار کامیاب ہوا تھا۔

(4) **ضلع بونیر**: ضلع بونیر میں زیادہ تر یوسف زئی قبیلے کے لوگ آباد ہیں۔ دوسرے قبائل میں سندر، سیہہ، گجر اور مہمند شامل ہیں۔ گجر سب سے زیادہ پسماندہ لوگ ہیں۔ سیاسی اور اقتصادی میدان میں یوسف زئی بہت بااثر ہیں۔ بونیر کئی صوفی بزرگوں کا علاقہ بھی ہے۔ ان میں پیر بابا اور شال بندی بابا کے مرید بہت زیادہ ہیں۔ سکھوں اور ہندوؤں کی بھی کچھ آبادی ہے۔ سیاسی جماعتوں میں اے این پی اور پیپلز پارٹی زیادہ مقبول ہیں۔ بااثر سیاسی شخصیات میں شیر اکبر خاں (شیر پاؤ گروپ) عبدالمتین خاں (اے این پی) اور علی شیر خاں (مسلم لیگ (ن) شامل ہیں۔ 2008ء کے الیکشن میں قومی اسمبلی کی نشست اے این پی سے حاصل کی تھی۔

(5) **ضلع چارسدہ**: اس ضلع کے ممتاز قبائل مہمد زئی، مہمند اور گیگیانی ہیں۔ سب سے بڑا اور بااثر قبیلہ مہمد زئی اس کے بعد مہمند ہیں۔ یہاں جرگہ سسٹم بہت بااثر ہے۔ یہ ان چند علاقوں میں سے ہے جہاں خاتون صوفی کا مزار ہے۔ یہ اے این پی کا علاقہ ہے جہاں سے خان عبدالغفار خاں کے خاندان کے لوگ الیکشن میں کامیاب ہوتے ہیں البتہ شیر پاؤ گروپ بھی یہاں اپنا اثر رکھتا ہے۔

(6) **ضلع چترال**: اس ضلع کی بڑی آبادی ''خو'' نسل کے افراد پر مشتمل ہے جو ''کھوار'' زبان بولتی

ہے۔ یہ چترالی زبان ہے جو گلگت، شمالی علاقوں اور سوات کے چند مقامات پر بھی بولی جاتی ہے۔ بڑی برادریوں میں آدم زادہ اور ارباب زادہ شامل ہیں۔ چترالی کلاش لوگوں کا علاقہ بھی ہے جو شہر کے جنوب مغرب کی تین وادیوں میں بستے ہیں۔ یہ ضلع پیپلز پارٹی کا کہلاتا ہے۔ مولانا عبدالاکبر خاں چترالی (ایم ایم اے) اور شہزادہ غلام محمد ایوب، مسلم لیگ (ن) جو پہلے پیپلز پارٹی میں تھے۔ 2008ء کے الیکشن میں قومی اسمبلی کی نشست پر کامیاب ہوئے تھے۔

(7) ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خاں: اس ضلع کے خاص گروپ بلوچ، مہاجر اور پشتون (موتانی قبیلہ) ہیں۔ اکثریت کی زبان سرائیکی ہے البتہ پشتو اور اردو زبان بھی یہاں بولی جاتی ہے۔ صوبہ خیبر پختونخواہ کا یہ واحد سرائیکی بولنے والا علاقہ ہے جو جنوبی پنجاب اور سندھ تک پھیلا ہوا ہے۔ یہاں چھوٹی سی سکھ برادری بھی ہے۔ اس ضلع کا نام ایک بلوچ سردار اسمٰعیل خاں کے نام پر رکھا گیا تھا۔ مولانا فضل الرحمٰن اور ان کے بھائی اس ضلع سے ہی الیکشن میں کامیاب ہوتے ہیں۔ ان کا مدمقابل کندی قبیلہ ہے۔ پیپلز پارٹی کے فیصل کندی نے یہاں مولانا فضل الرحمٰن کو الیکشن میں شکست دی تھی۔

(8) ضلع ہری پور: ایبٹ آباد کی طرح یہاں بھی کئی برادریاں اثر ورسوخ رکھتی ہیں۔ ان میں جدون، ترین، دلازے، تنولی (جو غازی کے علاقے یں زیادہ ہیں) سردار، اعوان اور راجہ شامل ہیں۔ یہاں ایوب خاں کے خاندان کا بہت اثر ہے۔ البتہ 2008ء میں مسلم لیگ (ن) کا امیدوار یہاں سے کامیاب ہوا تھا۔

(9) ضلع ہنگو: اس ضلع میں فاٹا کی کرم ایجنسی کا بہت اثر ہے۔ یہاں بنگش، اورکزئی، خٹک، شنواری اور آفریدی قبیلے آباد ہیں یہاں شیعہ سنی جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ جمیعۃ العلماء اسلام اور اے این پی یہاں کی بڑی سیاسی جماعتیں ہیں مگر امیدوار کا مسلک بھی الیکشن میں اثر انداز ہوتا ہے۔

(10) ضلع کرک: اس ضلع میں زیادہ تر خٹک آباد ہیں۔ خٹک ڈانس اسی علاقے سے منسوب ہے۔ اس ضلع نے ممتاز فوجی اور سرکاری افسر پیدا کئے ہیں۔ جے یو آئی، اے این پی اور پیپلز پارٹی کا سیاسی اثر ہے۔ افراسیات خٹک اسی علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ 2008ء کے الیکشن میں جے یو آئی نے یہاں سے قومی اسمبلی کی نشست حاصل کی تھی۔

(11) ضلع کوہاٹ: یہ ضلع دو اہم قبیلوں بنگش اور خٹک میں منقسم ہے۔ بنگش وسطی، شمالی اور شمالی مغربی علاقوں میں آباد ہیں۔ خٹک شیری، اکوڑہ اور سگری میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اکوڑہ خٹک زیادہ تر شمال مشرق اور پشاور کے ملحقہ علاقوں میں آباد ہیں۔ کوہاٹ فوجی شہر ہے۔ جہاں فضائیہ کا اڈہ ہے۔ یہاں کی ممتاز شخصیتوں میں سیّد افتخار حسین گیلانی، امتیاز گیلانی اور جاوید ابراہیم پراچہ شامل ہیں۔ پراچہ کا تعلق ایم ایم اے سے تھا اور وہ طالبان کے لیڈر ملا عمر اور القاعدہ کے اسامہ بن لادن کے حامی مانے

MashalBooks.org

جاتے ہیں۔البتہ 2008ء کے الیکشن میں عوامی نیشنل پارٹی کا امیدوار کامیاب ہوا تھا۔
(12) ضلع کوہستان: اس ضلع میں یہ قبیلے بااثر ہیں۔منظر، لونی، کوکا، مانکے خیل اور درم خیل، خواندگی کی کمتر شرح اور دشوار گزار علاقوں کی وجہ سے اس ضلع میں رائے دہندوں کی تعداد ہمیشہ کم ہوتی ہے۔ جمعیۃ العلماء اسلام کا اثر یہاں زیادہ ہے لیکن 2008ء کے الیکشن میں پیپلز پارٹی کا امیدوار کامیاب ہوا تھا۔
(13) ضلع لکی مروت: یہ پشتون قبیلہ مروت کی سرزمین ہے۔مروت لوہانی قبیلے (جسے سپین لوہانی یا سفید لوہانی بھی کہا جاتا ہے) کے چار ذیلی قبیلوں میں سے ایک ہے۔مروت عربی کے لفظ مروت سے ماخذ ہے جس کا مطلب رحم دلی اور سخاوت ہے۔مروت قبیلے کے افراد لمبے قد اور گوری رنگت کے ہوتے ہیں۔ یہاں سیاسی وابستگی کے مقابلے میں برادری کو ترجیح دی جاتی ہے۔اس لئے مروت ہی الیکشن میں کامیاب ہوتے ہیں۔جمعیت علماء اسلام اور ق لیگ کا بھی یہاں کچھ اثر ہے۔ سلیم سیف اللہ اور ان کے بھائی انور سیف اللہ اس علاقے کی سب سے زیادہ بااثر سیاسی شخصیت ہیں۔جمعیت کا امیدوار بھی فروری 2010ء میں مروت قبیلے کی حمایت سے کامیاب ہوا تھا۔
(14) ضلع لوئر دیر: اس ضلع میں کئی پشتون قبیلے اور برادریاں آباد ہیں۔شورنی، شنواری، یوسف زئی، شاہ خیل، مست خیل، عمر خیل، دش خیل، میار، رنی خیل، سلطان خیل اور اکا خیل قبیلے مشہور ہیں۔ یہاں سیّد اور گجر بھی آباد ہیں۔سیاسی طور پر یہ جماعت اسلامی کا علاقہ ہے۔ 2002ء میں جماعت اسلامی کے......امیر قاضی حسین احمد نے یہاں سے الیکشن لڑا تھا حالانکہ وہ نوشہرہ کے رہنے والے ہیں۔عوامی نیشنل پارٹی دوسری بااثر جماعت ہے۔جماعت اسلامی کے سراج الحق اور اے این پی کے زاہد خاں یہاں کے فعال سیاسی رہنما ہیں لیکن حیرت انگیز طور پر 2008ء کے الیکشن میں یہاں سے پیپلز پارٹی نے کامیابی حاصل کی تھی۔
(15) ضلع مالاکنڈ: اس ضلع کے بڑے قبیلے اکزئی یوسف زئی (خان خیل، پائی زئی اور رنی زئی) اور اتمان خیل ہیں۔غیر پشتونوں میں سیّد اور گجر ہیں۔رنی زئی اور پائی زئی کئی صدی پہلے افغانستان سے یہاں آئے تھے اور ابھی تک ان کے تعلقات وہاں ہیں۔مولانا عنایت الرحمٰن جن کے طالبان کے ساتھ رابطے ہیں اور پیپلز پارٹی کے لال محمد خاں علاقے کے بااثر افراد میں شامل ہیں۔2008ء کے الیکسن میں اس ضلع سے پیپلز پارٹی ہی کامیاب ہوئی تھی۔
(16) ضلع مانسہرہ: اس ضلع میں مختلف قبیلے اور برادریاں آباد ہیں۔ان میں پشتون، ہندووان، راجپوت اور پنجابی شامل ہیں۔ ہندوران میں تنولی زیادہ ہیں۔ بخاری سیّد، مشہدی سیّد اور ترمذی سیّد بھی یہاں اثر ورسوخ رکھتے ہیں۔ بالاکوٹ کے محمد شاہ اور قاسم شاہ (درگی کے) وجیہہ الزماں

اور اعظم سواتی اور تناول علاقے کے نوابزادہ صلاح الدین، زرگل خاں اور حبیب الرحمٰن تنولی بڑے سیاسی رہنما ہیں۔ مسلم لیگ ق اور جمیعت العلماء اسلام بڑی سیاسی جماعتیں ہیں۔

(17) ضلع مردان: یہاں یوسف زئی، خٹک اور مہمند بڑے پشتون قبیلے ہیں۔ اسے عوامی نیشنل پارٹی اور پیپلز پارٹی کا گڑھ مانا جاتا ہے۔ خیبر پختونخواہ کے موجودہ وزیر اعلیٰ امیر حیدر خاں ہوتی کا تعلق اسی علاقے سے ہے۔ ہوتی خاندان یہاں کا سب سے بااثر خاندان ہے لیکن اس کے افراد پیپلز پارٹی اور اے این پی میں بٹے ہوئے ہیں۔

(18) ضلع نوشہرہ: خٹک قبیلے کا ذیلی قبیلہ اکوڑہ خٹک علاقے کا بااثر قبیلہ ہے۔ یہ مزید چھ قبیلوں اکوڑہ خیل، خار خٹک، سویرا خٹک، اُریا خیل، سمی خیل اور کاکا خیل میں بٹا ہوا ہے۔ یہاں گمریانی قبیلہ بھی آباد ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ قبیلہ پشتونوں کی مدد کے لئے افغانستان سے آیا تھا پھر وہ یہیں آباد ہو گیا۔ دوسرے قبیلوں میں درانی اور غیر پشتونوں میں اعوان اور ملہار شامل ہیں۔ مشہور مدرسہ دار العلوم حقانی اکوڑہ خٹک میں ہے۔ طالبان کے رہنماؤں نے اسی مدرسے میں تعلیم حاصل کی ہے۔ عوامی نیشنل پارٹی اور پیپلز پارٹی یہاں کی بڑی سیاسی جماعتیں ہیں۔

(19) ضلع پشاور: اس ضلع میں پشتون اور غیر پشتون سب آباد ہیں۔ ممتاز پشتون قبیلوں میں آفریدی، خٹک اور کرزئی، وزیر، محسود، مہمند، داؤدزئی اور چمکنی شامل ہیں۔ پشاور مختلف نسلوں اور قبیلوں کا شہر ہے۔ شہر کے رہنے والے زیادہ تر ہندکو بولتے ہیں۔ یہاں سیاست پر بلور چھائے ہوئے ہیں جن کا تعلق خان عبدالغفار خاں کی جماعت سے ہے۔ یہاں پیپلز پارٹی کا اثر بھی ہے۔ 1988ء میں بے نظیر بھٹو یہاں سے کامیاب ہوئی تھیں۔ 2008ء کے الیکشن میں چار نشستوں پر پیپلز پارٹی اور اے این پی کے امیدوار کامیاب ہوئے۔

(29) ضلع شانگلہ: ضلع کی قریب قریب تمام آبادی یوسف زئی قبیلے پر مشتمل ہے۔ یوسف زئی کی ذیلی شاخیں ازی خیل اور بابزئی ہیں۔ مرزی خیل زیادہ تر چکیسر، مارتنگ اور شاہ پور میں آباد ہیں۔ بابوزئی پران کے علاقے میں آباد ہیں۔ سیّد اور قریشی یہاں رہتے ہیں۔ مسلم لیگ (ق) کے امیر مقام نے 2008ء میں یہاں سے الیکشن جیتا تھا۔

(21) ضلع صوابی: ضلع کی اکثریت یوسف زئی ہے۔ دوسرے قبیلوں میں جدون، رزڑ اور خٹک ہیں۔ افغان مہاجرین کے لئے سب سے بڑا کیمپ یہاں بنایا گیا تھا۔ 2008ء کے الیکشن میں عوامی نیشنل پارٹی کا امیدوار یہاں سے کامیاب ہوا تھا۔

(22) ضلع سوات: اس ضلع کے باشندوں کی اکثریت یوسف زئی پشتونوں سے تعلق رکھتی ہے البتہ کالام کی وادی میں کوہستانی اور گجر بھی آباد ہیں۔ شدت پسندوں کی ریشہ دوانیوں کے باوجود

2008ء میں عوامی نیشنل پارٹی نے ہی یہاں کامیابی حاصل کی تھی۔ جمعیت العلماء اسلام اور جماعت اسلامی کا بھی یہاں اثر ہے۔

(23) **ضلع ٹانک**: یہاں پشتو بولنے والوں اور سرائیکی بولنے والوں کی تعداد برابر برابر ہے۔ کتی خیل قبیلہ زیادہ بااثر ہے۔ اسی قبیلے نے انیسویں اور بیسویں صدی کے کئی عشروں میں یہاں حکومت کی۔ دوسرے قبیلوں میں بھیتانی، گُندی اور مروت وادی گومل میں بااثر ہیں۔ وزیر اور محسود آپس میں جھگڑتے رہتے ہیں کہ یہ علاقہ ان کا ہے۔ ٹانک میں جمعیت العلماء اسلام کا اثر ہے۔

(24) **ضلع اپر دیر**: اس ضلع میں پشتون اور غیر پشتون یوسف زئی، کتالی، ادغانی اور سواتی سب کی ملی جلی تعداد ہے۔ 2008ء میں پیپلز پارٹی کے امیدوار نے قومی اسمبلی کی نشست حاصل کی تھی۔

حسن عباس کولمبیا یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں اور نیویارک میں ایشیا سوسائٹی کے برنارڈ شوارٹز فیلو ہیں۔

کرّم ایجنسی میں محاذ آرائی اور تصادم

منصور خان محسود، اپریل 2010

فرقہ واریت کی تاریخ

فاٹا کے دوسرے علاقوں کے برعکس، کرم میں محاذ آرائی کی بنیادی وجوہ قبائلی یا سیاسی معاملات کے بجائے فرقہ وارانہ تعصّبات سے عبارت ہیں۔ سوویت یونین کے خلاف افغان جہاد کے بعد، ہزار ہا افغانیوں کو سرحد پار، کرم کے علاقے میں پناہ لینی پڑی جہاں پاکستانی حکومت نے ان کے لیے مہاجر کیمپ قائم کر دیئے۔ سینکڑوں قسم کے ہتھیار، جن میں معمولی ہتھیار سے لے کر مشہور سٹنگر میزائل تک شامل تھے، بھی ان پناہ گزینوں کے ساتھ اس علاقے میں آ گئے۔ مقامی خاندانوں نے انھیں خریدنا شروع کر دیا کیونکہ وہ ان کے ذریعے اپنا بہتر تحفظ بھی کر سکتے تھے اور دشمنوں پر حملے کے لیے بھی استعمال کر سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ کرم میں شیعہ سنی محاذ آرائی محض فرقہ وارانہ تصادم سے کہیں زیادہ ایک مکمل جنگ نظر آئی۔ افغان پناہ گزین زیادہ تر سنیوں کا ساتھ دیتے تھے۔ اس طرح یہ محاذ آرائی 90-1980ء کے عشروں میں مسلسل جاری رہی۔ (دونوں جانب کے) قبائلی عمائدین کے بیچ میں پڑنے کی وجہ سے بعض اوقات یہ تصادم رک بھی جاتا تھا۔

کرم میں فرقہ وارانہ تصادم کی ایک بڑی وجہ افغان جہاد میں پاکستان کا کردار رہا ہے۔ جن دنوں پاکستانی انٹیلی جنس ایجنسیوں نے گلبدین حکمت یار کی حزب اسلامی جیسے افغان سنی گروہوں کو فنڈز اور ہتھیار دینے شروع کیے تھے، طوری نامی شیعہ قبیلے کو اسی وقت نو آمدہ خطرات کا احساس ہو گیا تھا۔ (وہ سوویت یونین کے خلاف جنگ میں اس لیے شامل نہیں ہوئے کیونکہ

MashalBooks.org

سوویت یونین نے پاکستان پہ حملہ نہیں کیا تھا) تاہم افغان جہاد میں شریک نہ ہونے کے باوجود انہوں نے مطالبہ کیا تھا کہ حکومت انھیں بھی ہتھیار مہیا کرے۔

کرم کے شیعہ افغان پناہ گزینوں کو اپنے علاقے میں پناہ دینے کے بھی خلاف تھے ان کا خیال تھا کہ پاکستانی حکومت ان سنی گروہوں کو استعمال کر کے، کرم میں ان کے جنت سماں پرامن معاشرے کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ 1980ء کے عشرے میں پاکستان بھر میں فرقہ واریت کو خوب ہوا دی گئی اور 1987ء میں پہلا شیعہ سنی فساد کرم کے علاقے سدا(Sada) میں ہوا۔ محرم کے جلوس کے موقع پر اس تصادم میں سینکڑوں سنی اور شیعہ مارے گئے۔ افغانستان میں طالبان کی سنی قیادت کے اقتدار میں آنے کے بعد کرم میں فرقہ وارانہ جنونیت اپنے عروج پر جا پہنچی۔ 1997ء میں پاراچنار اور بلائی کرم میں سکول کے طلبہ نے شہر کی بہت سی عمارتوں پر شیعہ مخالف نعرے لکھ ڈالے جس کے نتیجے میں ہونے والے خون ریز فساد میں مزید سینکڑوں جانیں ضائع ہو گئیں۔ محاذ آرائی میں شدت آئی اور یوں تصادم نے پوری ایجنسی کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ دونوں اطراف کے شیعہ مخالف ایجنڈے کے پھیلاؤ نے پاکستان اور افغانستان دونوں ہی جانب فرقہ وارانہ عصبیت میں مزید شدت پیدا کر دی۔

گیارہ ستمبر 2001ء کے نیویارک اور واشنگٹن پر دہشت گرد حملوں کے بعد، بہت سے غیر ملکی عسکریت پسند اور القاعدہ کے جنگ جو سرحد پار کر کے پاکستان آ گئے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ فاٹا میں اپنے محفوظ مراکز بنا کر، وہاں سے پاکستان مخالف کارروائیاں کر سکیں گے کرم وہ واحد جگہ ہے جہاں سے ان عسکریت پسندوں کو نکالا گیا۔ (دسمبر 2001ء میں تورا بورا کی لڑائی کے بعد راتوں رات بہت سے عرب پناہ لینے یہاں آئے) لوئر کرم میں شیعہ باشندوں نے القاعدہ سے متعلق دو سو عربوں کو حکومت پاکستان کے حوالے کیا۔

2000ء کی ابتداء میں، شیعہ مخالف ایک گروپ سپاہ صحابہ پاکستان نے، جو کرم میں فرقہ وارانہ فسادات کو ہوا دیتے رہتے تھے، اسی علاقے میں مثلاً ہنگو، کوہاٹ، اورک زئی وغیرہ میں اپنے گروپ کی مضبوط بنیادوں پر منظم کر لیا۔ سپاہِ صحابہ کے سابق لیڈر اعظم طارق کرم میں بھی اتنے ہی مقبول تھے جتنے کہ پنجاب میں۔

کرم میں حالیہ فرقہ وارانہ فسادات:

برسوں سے یہ ہوتا آ رہا ہے کہ ہر پانچ دس بعد کرم میں کوئی نہ کوئی بڑا فرقہ وارانہ فساد برپا ہو جاتا ہے۔ اپریل 2007ء میں پاراچنار میں سنیوں نے ربیع الاول کے جلوس کے دوران (رسول

اکرم کے یوم پیدائش کے موقع پر) شیعہ مخالف نعرے لگائے ۔جس سے شیعہ کمیونٹی کو غصہ آیا اور انہوں نے مقامی پولیٹیکل اتھارٹیز سے اس کی شکایت کی ۔ پولیٹیکل ایجنٹ نے اس ہنگامے میں ملوث بعض سنی رہنماؤں کو گرفتار کر لیا۔ سنیوں نے کہا کہ ان کے جلوس پر پتھراؤ کیا گیا تھا۔ صورتِ حال بگڑتی گئی ۔ اگلے روز شیعوں نے دعویٰ کیا کہ پاراچنار میں ان کے مذہبی جلوس پر، سنیوں کی ایک مسجد سے راکٹ اور دستی گرینیڈ فائر کیے گئے ہیں ۔ جلد ہی فسادات پورے شہر میں پھیل گئے ۔ (پیوار، کرمان، پاراچمکنی، تیرہ منگل، بلشٹ کھیل، باگازئی اور علی زئی جیسے) قریبی گاؤں بھی ان کی آگ سے نہ بچ سکے ۔ پاک فوج اور فرنٹیئر کور نے مداخلت کرنے کی کوشش کی تو دونوں جانب سے ان پر بھی حملہ کیا گیا۔ اور اس طرح درجنوں سپاہی موت کا شکار ہو گئے ۔ اس سلسلہ فسادات میں سو سے زیادہ لوگ جاں بحق ہوئے۔

جب خونی فسادات پورے کرم میں پھیل گئے تو ہنگو سے شیعہ اور سنی عمائدین کا جرگہ بلایا گیا اور اس طرح (دونوں فرقوں کے درمیان) پاراچنار میں جنگ بندی ممکن ہوئی ۔ جنگ ضرور بند ہو گئی مگر علاقے کے باشندوں کو 45 روز تک کرفیو کا سامنا کرنا پڑا۔ حالات میں ٹھہراؤ آنے کے بعد بھی علاقے میں چھوٹے چھوٹے جھگڑے چلتے رہے ۔ کبھی زبردستی سڑکیں بند کر دی جاتیں اور کبھی مختلف شیعہ اور سنی افراد کو ان کے اپنے گاؤں سے پکڑ لیا جاتا رہا۔

اسی قسم کے بدامنی اور شدت پسندی کے واقعات پاراچنار میں بھی 2008 میں ہوتے رہے اور تا حال بھی جاری ہیں ۔ بعض راستے آج بھی بند ہیں اور اب کرم میں منگل جیسے سنی قبائل اپنے علاقے میں محصور ہیں کیونکہ (کرم اور ہنگو کو ملانے والی) ٹل پاراچنار روڈ طالبان جنگجوؤں نے بلاک کر رکھی ہے اور شیعہ علاقوں کے متبادل راستے وہ فرقہ وارانہ خوف کے مارے استعمال نہیں کر سکتے ۔ 2007ء اور 2010ء کے دوران ہونے والے فسادات میں پندرہ سولوگوں کو موت کا نشانہ بننا پڑا۔

کرم میں بیرونی طالبان گروپس کا کردار

تحریک طالبان پاکستان:

کرم میں محاذ آرائی کی دوسری وجہ، 2006ء کے شروع میں شمالی اور جنوبی وزیرستان کے محسود اور وزیر قبائل کے طالبان کی آمدورفت بنی 6-2005ء کے دوران حکومت اور وزیرستانی قبائل کے درمیان ہونے والے متعدد ناکام معاہدوں کے بعد، عسکریت پسندوں نے دعویٰ کیا کہ افغانستان میں داخلے کے لیے انھیں وزیرستان کی سرحد استعمال کرنے دی جائے کیونکہ انھیں سرحد

پار حملوں اور جنگ کے لیے مجبوراً کرم کے راستوں کو استعمال کرنا پڑ رہا ہے۔ شیعہ طوری قبائل نے اس استدلال کو قطعاً کوئی وزن نہیں دیا، اور طالبان کے ہاتھوں اپنے علاقے کے استعمال کے خلاف بھرپور احتجاج کیا۔

کرم میں جیو کے ایک مقامی نمائندے کے مطابق تحریک طالبان پاکستان کے ڈپٹی کمانڈر ولی الرحمان نے ان شیعہ قبائل کو اگست 2008ء میں پیش کش کی کہ اگر شیعہ افغانستان کی جانب جانے والے راستوں کو طالبان کے لیے کھلا رہنے دیں تو طالبان انھیں فاٹا میں ہر جگہ سفر کرنے دیں گے اور یہی نہیں بلکہ دوران سفر انھیں مکمل تحفظ بھی فراہم کریں گے۔ طوریوں نے یہ پیش کش مسترد کر دی۔ ان کا خیال تھا کہ طالبان بلاوجہ پاک فوج کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں۔ انھیں یہ بھی شک تھا کہ طالبان ان کے علاقے پر قبضہ کر لیں گے۔ اپنی پیش کش کے مسترد ہونے پر ولی الرحمان کو سخت غصہ آیا اور طالبان کی سرگرمیاں بہرحال آج بھی اسی طرح جاری ہیں۔

کرم میں فرقہ وارانہ محاذ آرائی بڑھنے کے ساتھ ساتھ شمالی اور جنوبی وزیرستان کے طالبان نے شیعوں سے لڑنے کے لیے کرم/ شمالی وزیرستان سرحد کو اپنا راستہ بنا لیا۔ وزیرستانی طالبان تو پہلے ہی کرم کے شیعوں پر پیچ پاتے تھے کیونکہ انہوں نے افغانستان پران کے حملوں کے لیے کرم کو لانچنگ پیڈ بنانے سے انکار کر دیا تھا۔ فرقہ وارانہ محاذ آرائی نے انھیں کرم پر حملہ کرنے کا ایک اور مناسب بہانہ مہیا کر دیا۔

وزیرستانی طالبان کا پہلا لشکر (اکتوبر 2007ء میں) تحریک طالبان کے بانی بیت اللہ محسود نے کرم بھیجا۔ جس کی کمان تحریک طالبان کا ڈپٹی لیڈر اور کٹر شیعہ مخالف قاری حسین کر رہا تھا۔ لگ بھگ چار سو محسود اور وزیر جنگجو بالشت خیل، سنگینہ، صدا، باگ زئی اور علی زئی کے دیہات میں شیعوں پر حملہ آور ہوئے۔ انہوں نے گاؤں کے گاؤں جلا کر رکھ کر دیئے اور درجنوں شیعہ افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ دو ماہ بعد قاری حسین جنوبی وزیرستان واپس لوٹا تو تحریک طالبان کے حکیم اللہ محسود نے سینکڑوں مزید لڑاکے کرم بھیج دیئے۔ یہ لوگ اتنے تھے کہ بعض علاقوں میں سنیوں کی تعداد شیعوں کے مقابلے میں بڑھ گئی۔

حکیم اللہ محسود نے اپریل 2008ء میں فقیر عالم محسود کو کرم میں محسود طالبان کا امیر مقرر کر دیا تا کہ اس کی اپنی ذمہ داریوں کا بوجھ کم ہو سکے۔ متزئی قبیلے کا فقیر عالم، جو اس وقت بمشکل پچیس سال کا تھا، اپنی سفاکی اور بربریت کے باوصف خاصا مشہور تھا۔ اس کی ہمراہی میں رہنے والے طالبان کے مطابق، اس نے کرم کے ستر شیعہ باشندوں کو اپنے ہاتھوں سے ذبح کیا۔ بعض ایسے سنی

افراد بھی اس کے ہاتھوں مارے گئے جن پر شیعوں سے معاونت کا الزام تھا۔ایک سال کے بعد فقیر عالم کو محسود طالبان کی سربراہی سے ہٹا دیا گیا کیونکہ اس کے بعض سابقہ کمانڈروں کا خیال تھا کہ وہ ذہنی توازن کھو بیٹھا ہے چنانچہ اسے مہینہ بھر پشاور کے ایک اسپتال میں زیر علاج رکھا گیا۔اپریل 2009ء میں حکیم اللہ محسود نے کرم میں دوبارہ محسود طالبان کی کمان سنبھال لی اور قریبی اورک زئی ایجنسی سے سینکڑوں جنگجو طالبان کو اپنے ہمراہ کرم میں لے آیا تا کہ وہ جاری فرقہ وارانہ فسادات میں شریک ہوسکیں۔

طالبان سے متعلقہ ایک فساد کے دوران تیس سنی جنگ جو لوئر کرم کے مرکزی شہر صدا کی جیل سے فرار ہو گئے اور صرف ایک دن بعد، انھوں نے امدادی سامان لانے والے ایک قافلے پر حملہ کر دیا جو فرنٹیئر کور کی جانب سے صدا بازار کے لیے بھیجا گیا تھا۔فرار ہونے والے قیدیوں نے سینکڑوں وزیرستانی طالبان اور لوکل سنیوں کے ساتھ مل کران سارے ٹرکوں کا سامان لوٹ لیا اور) ٹرکوں کو آگ لگا کر جلا ڈالا۔ یہ امدادی سامان شیعوں کے اہم مرکز پاراچنار بھیجا جا رہا تھا۔ پندرہ شیعہ ڈرائیور اغوا کر لیے گئے۔

ان میں سے اٹھارہ سالہ ایک لڑکا اس لیے اپنی جان بچا سکا کیونکہ اس نے انھیں اپنے سنی ہونے کا یقین دلایا تھا، باقی سب ڈرائیوروں کے سر قلم کر دیئے گئے۔فرنٹیئر کور کے دستے، جو اس امدادی سامان کو بحفاظت منزل تک پہنچانے کے ذمہ دار تھے، طالبان اور مقامی سنیوں کو اس لوٹ مار سے روک نہیں سکے۔ممکن ہے وہ انھیں روکنا ہی نہ چاہتے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان میں انھیں روکنے کی صلاحیت ہی نہ ہو۔حیرت ہے کہ پہلے امدادی سامان لے جانے والے گن شپ ہیلی کاپٹرز نے جب طالبان جنگ جوؤں پر فائرنگ کی تو اس سے کوئی بھی زخمی نہیں ہوا۔

صدا، ٹل اور درہ آدم خیل کی تمام سڑکیں طالبان نے بلاک کر رکھی ہیں جہاں وہ باقاعدہ شیعہ سواریوں کو چیک کرتے ہیں اور بعض اوقات انھیں مار بھی ڈالتے ہیں۔کوئی مدد یا رسد کرم کے بہت سے علاقوں تک پہنچ ہی نہیں سکتی۔

اورک زئی طالبان:

گزشتہ تین سالوں میں اورک زئی طالبان نے بھی کرم کے فرقہ وارانہ فسادات میں اہم کردار ادا کیا ہے۔اگست 2009ء میں تحریک طالبان کے سربراہ بیت اللہ محسود کی موت کے بعد حکیم اللہ محسود کو طالبان کا مرکزی امیر بنایا گیا اور اس نے ملا نور جمال کو کرم میں بھیج دیا۔ ملا نور جمال طوفان کے نام سے مشہور ہے اور انتہائی سفاک شیعہ مخالف لیڈروں میں سے ہے پہلے وہ

اوزک زئی کے علاقے ماموزئی کے مقامی مدرسے میں پڑھایا کرتا تھا۔ پہلے اورک زئی میں اور بعد میں کرم میں ڈپٹی لیڈر کی حیثیت سے، کرم کے مرکزی شہر پاراچنار کو، جہاں حالیہ سالوں میں شیعہ فرقے نے خود کو مرتکز کیا ہے، مکمل طور پر بلاک کر دیا ہے۔

آفریدی طالبان:

2008ء میں خیبر کے علاقے کے منگل باغ (لشکر اسلام) اور حاجی محبوب (انصار الاسلام) نے شیعوں کو نشانہ بنانے کے لیے سینکڑوں آفریدی جنگ جو کرم بھیجے۔ کرم کے ان فسادات میں منگل باغ کے لڑاکوں کی قیادت عبدالواحد کر رہا تھا جو آج کل خیبر میں نائب کے طور پر کام کر رہا ہے۔ اس تصادم میں درجنوں شیعہ اور سنی جنگ جو مارے گئے۔ بالآخر ستمبر 2009ء میں آفریدی واپس خیبر کی جانب پسپا ہو گئے۔ تاہم اب بھی کرم کے گرد ونواح میں اکا دکا جنگ جو موجود ہیں۔ کوہاٹ کے سرحدی علاقے سے بھی آفریدی طارق آفریدی کی قیادت میں کرم آ کر بس گئے تا کہ شیعہ مخالف فسادات جاری رکھے جا سکیں۔ یاد رہے طارق آفریدی درہ آدم خیل میں تحریک طالبان کا سربراہ ہے۔

طالبان کے مابین اختلافات:

شمالی، جنوبی وزیرستان اور اوزک زئی سے آنے والے طالبان جنگجو مرکزی اور زیریں کرم میں انتہائی طاقتور پوزیشن میں ہیں کیونکہ یہ علاقے سنی اکثریت کے ہیں۔ 2010ء کی ابتدا میں طالبان کے مقرر کردہ رہنما ملا طوفان اور کرم زیریں میں واقع صدا کے کمانڈر رفیق بنگش کے لڑاکا دستوں کے درمیان کئی خطرناک تصادم ہوئے۔ وجہ یہ تھی کہ ملا طوفان نے فروری 2010ء میں رفیق کو تاوان کے لیے اغوا کی وارداتیں کرنے سے روکا کیونکہ اس سے مقامی آبادی میں طالبان کی شہرت کو نقصان پہنچ رہا تھا مگر رفیق بنگش نے اس کی بات ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ اس تصادم میں دونوں طرف کے طالبان نے ہلکا اور بھاری اسلحہ استعمال کیا۔ اس میں پچیس طالبان ہلاک ہوئے تاہم رفیق بنگش کو ملا طوفان کے لڑاکوں نے پکڑ لیا اور غالباً وہ اب بھی انہی کی تحویل میں ہے۔

وزیرستانی، آفریدی اور اورک زئی طالبان کی کرم میں موجودگی سے مقامی سنی بہت پریشان ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ یہ جنگ جو ان کے علاقے سے نکل جائیں اور کرم کے شیعہ سنی لوگوں کو اپنے اختلافات خود ہی حل کرنے دیں۔ مثلاً مارچ 2010ء کے وسط میں ملا طوفان کے دستوں نے شیعوں سے ہمدردی کے شبے میں مسوزئی کے دو باشندوں کو اغوا کرنے کی کوشش کی

تو مقامی لشکر نے ان پر زبردست حملہ کر کے انھیں ناکام بنا دیا۔ ملا طوفان کے لڑاکوں میں سے کم از کم درجن بھر لوگ مارے گئے اور زخمی طالبان کو قید کر لیا گیا۔

مارچ 2010ء کے دوران ہی ملا طوفان کے دستوں نے دوبارہ مسوزئی کے لشکر پر حملہ کیا اور کئی گھنٹوں کی جنگ کے بعد، لشکر اور اس کے قبائل عمائدین نے طالبان سے شکست مان لی۔ اس تصادم میں دونوں اطراف کے 30 لوگ مارے گئے۔ قبائلی لشکر نے طالبان کی وفاداری کا عہد کیا اور بعض ضمانتوں کے بعد ملا طوفان نے 22 قیدی لشکریوں کو رہا کر دیا۔

کرم کے جنگ جو پاکستانی طالبان اور کوئٹہ کے شورائی طالبان کے مابین آپریشنل تعلق غیر واضح ہے تاہم جنوبی وزیرستانی تحریک طالبان پاکستان کے رہنماؤں کا کہنا ہے کہ وہ ملا عمر کو تحریک کا امیر سمجھتے ہیں اور ان سے عقیدت رکھتے ہیں۔

کرم میں فرقہ پرست جنگ جو گروپس:

شیعہ گروپس:۔ کرم میں شیعہ کمیونٹی کے دو لڑاکا گروپس ہیں لیکن وہ پاکستان، امریکہ یا نیٹو افواج کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کرتے ان کی تمام تر توجہ شیعہ مفادات کے تحفظ پر مرکوز رہتی ہے۔ کرم کے شیعہ اپنے ان لڑاکا گروپس کے نام کو خفیہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں تاہم ان کی مختصر تفصیل کچھ یوں ہے۔

کرم حزب اللہ:

حزب اللہ کے یہ لڑاکے نظریاتی طور پر ایران سے متاثر ہیں اور پاراچنار میں خاصے سرگرم ہیں۔ زکوٰۃ و خیرات اور خمس کے تمام تر عطیات ایران بھیجتے ہیں تاہم یہ ایک چھوٹا سا گروپ ہے۔

مہدی ملیشیا:

مہدی ملیشیا کے اراکین ایجنسی کے تقریباً تمام علاقوں میں ہیں۔ یہ گروپ عراق کے مقتدی الصدر سے متاثر ہے اور اپنے نظریات میں خاصا قدامت پرست اور سخت ہے۔ یہ گروپ کرم حزب اللہ کی نسبت کہیں زیادہ طاقتور ہے۔

سنی گروپس:

کرم کے سنی کسی خاص جنگی گروپ کی شکل میں منظم نہیں ہیں تاہم جب ضرورت ہو، شیعوں سے لڑنے کے لیے وہ قبائلی لشکر ترتیب دے دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں انھیں پاکستانی طالبان خیبر کے لشکر اسلام اور انصار الاسلام کی مکمل مدد حاصل ہوتی ہے۔ بہت سے سنی جنگجو طالبان 2009ء کی خزاں کے دوران پاکستانی فوج کے حملے سے بچنے کے لیے وزیرستان سے

مرکزی اور زیریں کرم کی طرف بھاگ گئے تھے۔ سپاہِ صحابہ پاکستان جو ملک بھر میں شیعہ مخالف کارروائیوں کے لیے مشہور ہے، کرم میں بھی سرگرم ہے تاہم ملک کے دوسرے علاقوں کی نسبت یہاں وہ زیادہ معروف نہیں۔

کرم کے سب ڈویژن اور قبائل:

کرم بالا:۔ یہ کرم ایجنسی کا سب سے زیادہ آبادی والا علاقہ ہے۔ یہاں طوری اور بنگش قبائل کی اکثریت ہے۔ اس سب ڈویژن میں کرمان، زیاران، شلاوزان، پیوار (Peuwar) اور طوری منگل کے علاقے شامل ہیں۔ یہاں طوری قبیلہ وہ واحد پختون قبیلہ ہے جو پورے کا پورا شیعہ مسلک کا حامل ہے۔ بنگش قبیلے کے آدھے لوگ شیعہ اور آدھے سنی ہیں۔ منگل اور مقبل جیسے کچھ چھوٹے چھوٹے سنی قبائل بھی کرم بالا میں آباد ہیں۔ ایجنسی کا انتظامی مرکز پاراچنار بھی یہیں واقع ہے۔ اور پاکستان کے قیام کے بعد فاٹا میں قائم ہونے والا پہلا کالج بھی یہیں واقع ہے۔ پاراچنار میں تعلیم کی سطح کسی بھی پاکستانی علاقے سے کم نہیں۔ یہاں سو سے زائد ہائی اسکول، خواتین کا کالج اور ایک کامرس کالج بھی موجود ہیں۔ پورے فاٹا کے برعکس پاراچنار میں سینکڑوں کرسچین خاندان بھی رہائش پذیر ہیں۔ سرکاری دفتروں میں صفائی ستھرائی کا کام یہی لوگ کرتے ہیں۔

مرکزی کرم:

یہاں پاراچمکنی، اودی زئی، علی شیرازی، مسوزئی، مقبل، خونی خیل اور زیخ مست خیل کے سنی قبیلوں کی آبادی ہے پہلے یہ ''سرحدی علاقہ'' ہوتا تھا۔ لیکن 2004ء میں سرحد کے گورنر افتخار حسین شاہ نے اس کا نام بدل کر مرکزی کرم رکھ دیا۔ اس کا انتظامی ہیڈکوارٹر ''صدا'' دراصل کرم زیریں میں واقع ہے کیونکہ مرکزی کرم میں تاریخی طور پر حکومتی رٹ ہمیشہ ہی کمزور رہی ہے۔ مرکزی کرم کے باشندے اپنے جھگڑے نمٹانے کے لیے سرکاری عدالتی نظام کے بجائے مقامی جرگوں سے رجوع کرنا پسند کرتے ہیں۔ ایجنسی کا سب سے پس ماندہ علاقہ بھی یہی ہے۔ لوگ جاہل ہیں۔ تعلیمی ادارے نہ ہونے کے برابر ہیں اور کسی قسم کا سماجی اور معاشی ڈھانچہ موجود ہی نہیں۔ ماضی میں یہاں کے لوگ اسپتال اور سڑکیں بنانے کی حکومتی کوششوں کے خلاف باقاعدہ مزاحمت کرتے تھے۔ وہ اسے اپنی آزادی پر حملہ تصور کرتے تھے لیکن اب مقامی لوگ ترقیاتی کاموں کا مطالبہ کرنے لگے ہیں اور حکومت علاقے کو جدید بنانے کے لیے بہت سی سڑکوں اور اسپتالوں کی تعمیر کے منصوبوں کی منظوری دے چکی ہے۔

حشیش اور ہتھیاروں کے حوالے سے بھی مرکزی کرم کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اگرچہ

2003ء میں حشیش کی کاشت بالکل ختم کر دی گئی تھی تاہم گزشتہ کئی سالوں سے مرکزی کرم کے علاقوں میں دوبارہ یہ کاشت شروع کر دی گئی ہے۔ جہاں تک ہتھیاروں اور گولہ بارود کا تعلق ہے۔ کوہاٹ کے درہ آدم خیل کے بعد یہاں ڈوگر مارکیٹ کا نمبر آتا ہے۔ ہتھیاروں کی خرید وفروخت کے علاوہ یہاں چھوٹے ہتھیار بنائے بھی جاتے ہیں۔

کرم زیریں:

دریائے کرم کی وجہ سے یہ سارا علاقہ انتہائی سرسبز اور زرخیز ہے۔ صدا اس کا مرکزی شہر ہے۔ فرقہ وارانہ تصادم کی زد میں آنے سے پہلے، مقامی لوگ اخروٹ، بادام، گندم، مکئی، چاول اور مختلف پھل اور سبزیاں کاشت کرتے تھے۔ یہ سب چیزیں پشاور اور لاہور کی منڈیوں میں بھیجی جاتی تھیں۔

یہاں زیادہ تر بنگش قبیلے کے لوگ آباد ہیں۔ ان میں سنی بھی ہیں اور شیعہ بھی لیکن ساتھ ہی منگل، حاجی اور مقبل قبائل بھی یہاں رہتے ہیں۔ 2007ء کے موسم گرما کے بعد سے یہاں کی زیادہ تر شیعہ آبادی کو کرم بالا منتقل ہونے پر مجبور کر دیا گیا۔ اسی طرح پاراچنار کے سنی باشندوں کو بھی، فسادات کی شدت بڑھنے کے بعد، کرم زیریں ہجرت کرنا پڑی۔

کرم میں امن کے لیے کام کرنے والے قبائلی عمائدین:

اگر شیعہ سنی تصادم کے خاتمے کی کوششیں تا حال کامیاب نہیں ہو پائیں مگر درج ذیل عمائدین اس سلسلے میں مسلسل مصروف کار ہیں۔

شیعہ لیڈرز:

(۱) علامہ محمد نواز خطیب جامع مسجد (پاراچنار کی مرکزی شیعہ مسجد)۔ (۲) علامہ سید عابد حسین۔ پرنسپل پاراچنار مدرسہ۔ (۳) کیپٹن (ر) حاجی محمد یوسف۔ سیکرٹری جنرل۔ انجمن حسینیہ (پاراچنار کی شیعہ سیاسی تنظیم)

سنی لیڈرز:

(۱) حاجی بخت جمال۔ صدر انجمن فاروقیہ۔ (کرم کی سنی سیاسی تنظیم)۔ (۲) میر زمان ایڈوکیٹ۔ سابقہ سیکرٹری انجمن فاروقیہ۔ (۳) عید نظر منگل (قبائلی بزرگ)

آبادی کے مسائل اور مشکلات:

کرم میں 2007ء کے حالیہ فسادات پھوٹ پڑنے کے بعد سے حکومت پاکستان نے

MashalBooks.org

انھیں روکنے یا ختم کرنے کے لیے کوئی خاص کوشش نہیں کی۔ زیادہ تر علاقے میں فوج محض خاموش تماشائی بنی رہی اور طالبان ہی قبائلی لشکروں سے ٹکراتے رہے اور شیعہ، سنی دونوں اطراف کے لوگوں کو بری طرح دق کرتے رہے۔ شیعہ کمیونٹی حکومت کو موردِ الزام ٹھہراتی ہے کہ وہ ان کے تحفظ میں ناکام رہی ہے اور اس نے طالبان جنگ جوؤں اور سنیوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ معاشی گرانی بھی شیعوں کے لیے ایک بڑا مسئلہ ہے۔ پاکستان بھر میں (تین ہزار روپے میں 35 ڈالر میں) بکنے والے آٹے کی بوری یہاں دس ہزار روپے یعنی 120 ڈالر میں فروخت ہو رہی ہے۔ اور بہت سے مقامی حکومتی ملازمین کو کئی سال سے تنخواہ ہی نہیں ملی۔

شیعہ کمیونٹی کا الزام ہے کہ حکومت جان بوجھ کر کرم کے حالات کو ٹھیک نہیں کر رہی۔ اس سلسلے میں وہ سابقہ پولیٹیکل ایجنٹ سلیم خاں کی تقاریر کو ثبوت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اس نے دسمبر 2006ء میں کہا تھا کہ مارچ 2007ء میں کرم کی صورتِ حال اور زیادہ خراب ہو جائے گی اور فسادات پوری ایجنسی کو اپنی گرفت میں لے لیں گے۔ مارچ 2007ء کو (دریائے کرم کی تباہ کن طغیانی کے فوراً بعد ایک دورے میں) اس وقت کے گورنر علی محمد جان اورک زئی نے کہا تھا کہ ایجنسی کو ابھی اور بھی بہت سے مسائل کا سامنا کرنا ہے اور مقامی لوگوں کو اس کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ ظاہر ہے دونوں سرکاری زعما، مقامی لوگوں کو وہی کچھ بتا رہے تھے، جس کی اطلاعات انھیں سرکاری ذرائع سے مل رہی تھیں۔

سنیوں کے محاصرے کی وجہ سے، کرم سے نکلنے کے خواہاں شیعوں کے لیے تین آپشنز ہیں۔ (۱) سرحد پار کر کے افغانستان جائیں اور وہاں سے خیبر کے راستے پشاور آئیں۔ سرحد کا دارالحکومت ہونے کی وجہ سے یہاں تک رسائی زیادہ مشکل نہیں۔ (۲) فوجی قافلوں کے ساتھ سفر کیا جائے مگر یہ بہت خطرناک ہے کیونکہ فوجی قافلے مسلسل سنی طالبان کے نشانے پر رہتے ہیں یا پھر (۳) ہوائی جہاز کے ذریعے وہاں سے نکلیں لیکن نجی پائلٹ پاراچنار آنے یا وہاں سے نکلنے کے لیے تین گنا کرایہ لیتے ہیں۔

فرنٹیئر کور کے کمانڈر توصیف اختر کی کارروائیوں سے البتہ شیعہ کمیونٹی کافی مطمئن دکھائی دیتی ہے۔ جس نے ستمبر 2009ء سے اب تک کرم میں ستر سے زیادہ طالبان کو گرفتار کیا ہے، سو سے زیادہ طالبان کو مار ڈالا گیا۔ ایف سی کمانڈر نے طالبان کے کئی مضبوط مراکز کو ختم کر دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وزیرستانی اور اورک زئی طالبان کے زیرِ استعمال راستوں پر (کرم میں آنے جانے والے) سکیورٹی فورسز کا مکمل کنٹرول ہو گیا ہے۔

سنیوں کا کہنا ہے کہ شیعہ سنی تصادم کے دوران حکومت انھیں کوئی مدد نہیں دیتی۔ مثلاً

2010ء مارچ کے تصادم کے مصداق سنی لیڈر اس بات پر خاصے ناراض تھے کہ فرنٹیئر کور اور فوج، قریب ہی موجود ہونے کے باوجود ان کی مدد کو نہیں آئے۔ وہ حالیہ سالوں کے دوران مسلسل دربدر ہونے کی وجہ سے بھی بہت پریشان ہیں۔ پاراچنار سے نکالے جانے والے سنی گروپس صدا اور مرکزی کرم کے علاقوں میں پناہ گزین بن کر رہنے پر مجبور ہیں اور منگل کا سنی قبیلہ کرم بالا میں نقل وحرکت کے لیے پریشانیوں کا شکار ہوتا ہے کیونکہ اسے پاکستان میں کہیں بھی جانے کے لیے شیعہ علاقوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

طالبان لڑاکوں سے شیعہ اور سنی دونوں ہی تنگ ہیں۔ شروع شروع میں سنی آبادی نے ان کا خاصا خیر مقدم کیا تھا۔ لیکن طالبان کے ہاتھوں، سر قلم کیے جانے، ٹارگٹ قتل وغارت اور اغوا برائے تاوان کی وارداتوں کی وجہ سے دونوں فرقے ہی پاکستانی طالبان کی موجودگی اور پاکستانی فوج کی غیر موثر کارکردگی کے ہاتھوں بری طرح تنگ آئے ہوئے ہیں۔

منصور خاں محسود اسلام آباد میں قائم تھنک ٹینک فاٹا ریسرچ سنٹر میں ریسرچ کوآرڈی نیٹر ہیں ان کا تعلق جنوبی وزیرستان کے محسود قبیلے سے ہے۔ اور کئی این جی او کے ساتھ کام کرتے رہے ہیں۔

شمالی وزیرستان میں محاذ آرائی اور عسکریت پسندی

آنند گوپال، منصور خاں محسود[1] اور برائن فش مین

فاٹا میں آج جہادی عسکریت پسندی کا اہم ترین مرکز شمالی وزیرستان ہے۔ وہ عرصے سے بلاخوف وخطر پوری ایجنسی میں کارروائیاں کرتے پھرتے ہیں۔ دوسرے علاقوں میں پاکستان مخالف گروہوں کا پوری قوت سے قلع قمع کرنے والی پاکستانی فوج نے بھی شمالی وزیرستان کے عسکریت پسندوں کی سرگرمیوں کو زیادہ تر نظرانداز کیا ہے۔

پاکستان کے زیرانتظام قبائلی علاقوں میں شمالی وزیرستان دوسرا سب سے بڑا علاقہ ہے اور ساتھ ہی ساتھ کئی عشروں سے افغانستان میں دراندازی اور شدت پسند کارروائیوں کے لیے انتہائی اہم مرکز بھی ہے۔ حقانی گروپ ایجنسی کا اہم ترین عسکریت پسند گروپ ہے۔ مشہور افغان مجاہد (کمانڈر) جلال الدین حقانی اپنا آبائی صوبہ خوست چھوڑ کر (1970ء کے عشرے میں) شمالی وزیرستان، میراں شاہ میں آبسا تھا۔ اس کا بیٹا سراج الدین اسی علاقے میں پلا بڑھا۔ 1980ء کے عشرے میں مشرقی افغانستان میں جلال الدین نے اہم ترین مجاہدین کمانڈر کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ سراج الدین آج کل اپنے والد کے قائم کردہ نیٹ ورک کو سنبھالے ہوئے ہے۔ اور اسے افغانستان میں امریکی اور نیٹو فورسز کے خلاف شدت پسند کارروائیوں میں استعمال کرتا ہے۔ اپنے والد کی طرح سراج الدین بھی شمالی وزیرستان کو جنگ جوؤں کی بھرتی، پناہ گاہ اور Strategic Depth کے لیے استعمال کرتا ہے شمالی وزیرستان جغرافیائی طور پر الگ تھلگ ہونے، مشکل راستوں اور قبائلی عسکریت پسندوں کے نسبتاً مضبوط اتحاد کی بدولت اس قسم کے مقاصد کے لیے بہترین جگہ ہے۔

حقانی نیٹ ورک کے علاوہ، شمالی وزیرستان میں سب سے بڑا عسکریت پسند اتحاد، عثمان زئی وزیروں کے مداخیل قبیلے کے حافظ گل محمد کی سربراہی میں قائم ہے۔ حقانی گروپ کی طرح، ان کی کوئی خاص جنگی تاریخ نہیں تاہم ایک لحاظ سے ان کی بے پناہ اہمیت ہے میراں شاہ اور افغان سرحد کے درمیان پھیلا ہوا سنگلاخ پہاڑی علاقہ مداخیل قبیلہ کا ہے۔ عسکریت پسندوں پر انھیں یہی اہم سٹریٹجک برتری حاصل ہے کیونکہ افغانستان جانے کے لیے انھیں اسی علاقے سے گزرنا پڑتا ہے۔ بہادر کا نائب مولانا صادق نور دوڑ (Daur) قبیلے سے ہے اور وزیر اور دور قبیلوں کا مشترکہ

امیر بھی ہے۔ صادق نور حقانیوں کے خاصا قریب ہے اور بہادر بھی۔ علاقے میں پاکستانی دستوں پر حملہ کرنے یا نہ کرنے سے مشکل معاملات میں حقانی نیٹ ورک کی ہدایات کی پیروی کرتا ہے۔

امریکی یا پاکستانی فوجی آپریشنوں کے دوران بچ نکلنے والے عسکریت پسندوں کے لیے شمالی وزیرستان انتہائی محفوظ پناہ گاہ رہا ہے۔ 2001ء ایک میں افغانستان میں طالبان حکومت کے خاتمے کے فوراً بعد طالبان حکومت سے متعلقہ ہزارہا طالبان نے شمالی وزیرستان کا رخ کیا۔ ان میں سے بہت سوں نے ایجنسی کے انتہائی پر پیچ اور گھنے جنگلات والے علاقے شوال وادی میں پناہ لی۔ بعد میں یہ علاقہ القاعدہ سمیت ہر طرح کے غیر ملکی عسکریت پسندوں کی پناہ گاہ بن گیا۔ پاکستانی حکومت جنوبی وزیرستان سمیت ایسی کئی دوسری پناہ گاہوں کو بارہا اپنا ٹارگٹ بنا چکی ہے۔ 2004ء میں عسکریت پسندوں کی ایک بڑی تعداد نے، جنوبی وزیرستان کی شکی وادی سے نکالے جانے کے بعد، شمالی وزیرستان کا ہی رخ کیا تھا۔ حال ہی میں جنوبی وزیرستان کے محسود قبائل سے متعلقہ بہت سے عسکریت پسندوں کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ انہوں نے بھی شمالی وزیرستان ہی میں پناہ لی ہوگی۔

شمالی وزیرستان کے حقائق:

شمالی وزیرستان 4707 کلومیٹر (817 مربع میل) پر مشتمل پہاڑی علاقہ ہے اور اس کی مغربی اطراف براہ راست افغانستان سے متصل ہیں۔ اس کا سب سے بڑا شہر اور دارالحکومت میراں شاہ ہے۔ 1947ء میں قیام پاکستان کے وقت اسے پاکستان میں شامل کیا گیا تھا۔ میراں شاہ، میر علی، دتہ خیل اور رزمک اس کے بڑے شہر ہیں۔ اس کے زیادہ تر باشندے پختون ہیں اور ان کا تعلق وزیر اور دوڑ قبیلوں سے ہے۔ دتہ خیل اور رزمک سمیت فیسورہ جیسے پہاڑی علاقوں، شیر اتھلا کے میدان، کے ٹو کی وادی، اور کرم کے زیریں دریائی حصے میں عثمان زئی وزیریوں کی اکثریت ہے جبکہ دور قبائل سید علی پر قابض ہیں جہاں انھیں بالائی دوڑ (جو میراں شاہ کے قرب وجوار میں رہتے ہیں) کے برعکس زیریں دوڑ (Daur) کے نام سے جانا جاتا ہے۔

شمالی وزیرستان تین سب ڈویژنز اور نو تحصیلوں پر مشتمل ہے۔ میراں شاہ، غلام خان اور دتہ خیل تحصیلیں میراں شاہ سب ڈویژن میں شامل ہیں۔ یہ علی سب ڈویژن میں میر علی، سپن وارم اور شاوا نامی تحصیلیں ہیں۔ اسی طرح رزمک سب ڈویژن رزمک، دوسالیا ور گریم تحصیلوں پر مشتمل ہے۔ شمالی وزیرستان کے عسکریت پسند، جنوبی وزیرستان میں اپنے نظریاتی ساتھیوں کی نسبت، زیادہ گروہی اختلافات کا شکار نہیں۔ خصوصاً قبائلی گروہ بندی سے انہوں نے حتی الامکان بچنے کی کوشش کی ہے۔ پھر بھی شمالی وزیرستان (کے عسکریت پسندوں) کی بعض گروہ بندیاں خاصی اہم

MashalBooks.org

ہیں۔مثلاً: ایک جنگ جوگروہ کا سردار رسول خان ایجنسی میں بہادر خان کے اہم کردار پر انتہائی برہم ہے۔اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ خان ازبک جنگ جوؤں کی حمایت کرتا ہے جبکہ ازبکوں سے بہت سے پاکستانی عسکریت پسند سخت نالاں ہیں۔ دوسری جانب خان کی کاروائیوں میں مجرمانہ عناصر کا عمل دخل زیادہ لگتا ہے اور وہ اپنے مقاصد کے لیے زیادہ آزادی سے کام کرنا چاہتا ہے۔ اسی طرح ابوکاشا العراقی کے سربراہی میں غیر ملکی اور مقامی جنگ جوؤں کا گروپ بہادر کے چیف کمانڈر صادق نور سے ٹکراتا رہتا ہے کیونکہ صادق نور ابوکاشا گروپ کی غیر ملکی قیادت کے خلاف مسلسل مزاحم ہے فاٹا کے دوسرے حصوں کی طرح یہاں بھی اہم ترین عمومی اختلاف عرب اور وسطی ایشیائی جنگجوؤں کے کردار اور افغانستان میں امریکی اور نیٹو افواج کے ساتھ ساتھ پاکستانی ٹھکانوں پر حملے سے متعلق ہے۔

اگرچہ یہ جھگڑے قبائلی نوعیت کے نہیں تاہم عسکریت پسندوں کے مابین ان جھگڑوں میں مقامی جغرافیائی عنصر شامل ہے۔ میراں شاہ کا مغربی علاقہ بہادر کا مرکز ہے جبکہ اس کے مخالف عسکریت پسند میر علی میں اور اس کے گرد ونواح میں کاروائیاں کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ علاقہ افغانستان کی سرحد سے ذرا دور واقع ہے۔شمالی وزیرستان میں عسکریت پسندوں کے مابین صلح جوئی کے سلسلے میں حقانی گروپ کا بہت اہم رول ہے۔جلال الدین اور سراج الدین دونوں رہنماؤں کا اس علاقے میں بے پناہ احترام کیا جاتا ہے۔اور نوجوان حقانی نے پچھلے پانچ سال کے دوران کئی بار مقامی عسکریت پسندوں کے درمیان پیدا شدہ جھگڑے ختم کرائے ہیں۔ افغانستان میں کی جانے والی، حقانی گروپ کی جانب سے، موثر کاروائیاں انھیں دوسرے عسکریت پسندوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ کیونکہ ان کے پاس سرحد پار سرگرمیوں کے لیے اتنے بہتر نیٹ ورک موجود نہیں۔ مزید براں پاکستانی فوج اور خفیہ ایجنسیوں کے ساتھ حقانی کے طویل تعلقات کی وجہ سے وہ پاکستانی حکومت اور عسکریت پسندوں کے درمیان بات چیت کا بھی موثر ذریعہ ہیں۔اپنے ان اختلافات کے باوجود عسکریت پسندوں کو یہ بھی علم ہے کہ ان کے اندرونی جھگڑے افغانستان میں ان کی جدوجہد کو کمزور کر سکتے ہیں اور ساتھ ہی وہ پاکستانی فوج کے دباؤ کا بھی شکار ہو سکتے ہیں۔

شمالی وزیرستان میں فوجی آپریشن:

2006ء کے امن معاہدوں سے پہلے اگرچہ پاکستانی فوج اور عسکریت پسندوں میں چھوٹی موٹی مڈھ بھیڑ ہوتی تھی تاہم پاکستانی فوج نے شمالی وزیرستان میں عسکریت پسندوں کے خلاف کوئی بڑا آپریشن نہیں کیا۔ دراصل یہاں فوج اور عسکریت پسندوں کے مابین تعلقات

تھوڑے بہت تعاون پر مبنی ہیں۔ 2009ء میں کیے گئے ایک معاہدے کے مطابق طالبان کو فوجی چیک پوسٹوں پر تلاشی سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔ وہاں صرف طالبان ڈرائیوروں کی تلاشی لی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ وزیرستان میں جہاں چاہیں، بآسانی آدمی اور اسلحہ سمگل کر سکتے ہیں۔ امن معاہدے میں کچھ اور شقیں بھی ہیں جن کا فائدہ طالبان کو ہوتا ہے۔ مثلاً: شمالی وزیرستان میں چیک پوسٹوں پر موجود کام کرنے والے اہل کار اپنے ساتھ اسلحہ نہیں رکھیں گے۔ فاٹا میں ڈرون حملوں کا اہم ترین مرکز شمالی وزیرستان رہا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ امریکی حکام یہاں برسرکار عسکریت پسندوں کو کتنی اہمیت دیتے ہیں۔ 2004ء سے 2007ء میں 53 حملوں میں سے 22 ڈرون حملے اسی علاقے پر کیے گئے۔ لیکن 17 اکتوبر کے بعد جنوبی وزیرستان میں پاکستانی فوج کی کارروائی کی وجہ سے ڈرون حملے روکے گئے تو شمالی وزیرستان میں ان حملوں میں زیادہ تیزی آ گئی۔ 31 مارچ 2004ء تک 27 سے 26 حملے صرف شمالی وزیرستان میں ہوئے۔ ان میں وہ 13 حملے بھی شامل ہیں جو میران شاہ اور افغان سرحد کے درمیان بہادر کے پہاڑی مراکز پر کیے گئے۔

بغاوت کی گروہی شکل وصورت:

میران شاہ میں قائم حقانی نیٹ ورک ان اہم ترین عسکریت پسند گروپوں میں سے ایک ہے جو افغانستان میں امریکی اور نیٹو افواج کے خلاف نبرد آزما ہیں۔ ان کی زیادہ تر کارروائیاں افغان صوبے پکتیا میں ہوتی ہیں پکتیا اور خوست کی سرحدیں شمالی اور جنوبی وزیرستان کے ساتھ ملتی ہیں۔ حقانی نیٹ ورک لوگار اور وردک صوبوں کے ساتھ ساتھ کابل میں بھی اہمیت کا حامل ہے۔ سوویت مخالف جنگ کے بزرگ مجاہد رہنما جلال الدین نیٹ ورک کے عمومی سربراہ ہیں تاہم روزمرہ کمانڈ کی ذمہ داریاں ان کے بیٹے سراج الدین ادا کرتے ہیں۔ 1980ء کے عشرے میں جلال الدین حقانی نے سوویت یونین کے خلاف جنگ میں انتہائی اہم، موثر اور ماہر مجاہدین رہنما کی حیثیت سے شہرت پائی تھی۔ ان دنوں انہوں نے پاکستانی آئی ایس آئی، امریکی سی آئی اے اور علاقے میں نبرد آزما عسکریت پسندوں بالشمول اسامہ بن لادن کے ساتھ قریبی تعلقات پیدا کر لیے تھے۔ افغانستان میں لڑنے کے باوجود، شمالی وزیرستان جلال الدین کا مضبوط گڑھ رہا ہے۔ سوویت یونین کی حامی افغان حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کا فیصلہ بھی 1978ء میں انہوں نے میران شاہ کی مسجد بموسوم حیّی المہاجرین میں افغان مہاجرین کی ایک میٹنگ میں ہی کیا تھا۔ سوویت مخالف جہاد کے دوران، جلال الدین حزب اسلامی (یونس خالص گروپ) کے ساتھ کام کرتے رہے۔ اس طرح انھیں نہ صرف سیاسی پشت پناہی ملی بلکہ مادی وسائل تک رسائی بھی ہوئی۔

اگرچہ جلال الدین تعلیم یافتہ تھے مگر بنیادطو پر وہ فوجی کمانڈر تھے۔ 1991ء میں اپنی زندگی کی اہم ترین کامیابی اس وقت حاصل کی جب انہوں نے سوویت یونین کے نکل جانے کے بعد کابل میں قائم حکومت کے قبضے سے خوست آزاد کرایا۔

1990ء کے عشرے کے وسط میں جب طالبان متحرک ہوئے تو غالباً آئی ایس آئی کے دباؤ کی وجہ سے انہوں نے طالبان کی قیادت قبول کر لی اور ان کی حکومت میں سرحدی اور قبائلی امور کے وزیر بن گئے لیکن عملاً انہوں نے اور ان کے ساتھیوں نے کبھی طالبان کی بالادستی نہیں مانی، خصوصاً لویا پکتیا کے علاقوں میں وہ طالبان اتحادی ہونے کے باوجود بہت حد تک آزاد رہے۔

2001ء میں افغانستان پر امریکی حملے کے بعد، جلال الدین اور ان کے ساتھی میراں شاہ واپس لوٹ آئے۔ 1970ء کے عشرے کے وسط میں پیدا شدہ خطرات سامنے دیکھ کر بھی انہوں نے میراں شاہ میں ہی پناہ لی تھی۔ میراں شاہ میں جلال الدین کی اہمیت خاصی ہمہ جہتی ہے۔ خاص طور سے ان کے زیرِ انتظام مدرسے قابل ذکر ہیں جہاں (علاقے کے) مذہبی طلبہ کی ایک پوری نسل کو خوراک اور رہائش کی سہولتیں ملتی رہی ہیں۔ اگرچہ سوویت مخالف جہاد میں اپنے کردار کی وجہ سے جلال الدین شمالی وزیرستان کے عسکریت پسندوں میں انتہائی احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں تاہم ایجنسی کے قبائلی سرداروں کے ساتھ ان کے تعلقات خاصے پیچیدہ ہیں۔ حقانیوں کا تعلق (افغانستان کے صوبے خوست کے) زادران قبیلے سے ہے۔ شمالی وزیرستان میں ان کی قبائلی جڑیں، ظاہر ہے، موجود نہیں۔ چنانچہ قبائلی سرداران کے خلاف معاندانہ جذبات کو ہوا دیتے رہتے ہیں۔ 1980ء کے زمانے میں بھی ان کا رویہ کچھ ایسا ہی رہا تھا۔ حقانیوں کی اسی کمزوری کی بدولت حافظ گل بہادر زیادہ طاقتور نظر آتا ہے کیونکہ شمالی وزیرستان میں اس کا اپنا قبیلہ موجود ہے۔

کابل میں طالبان حکومت کے خاتمے کے بعد، جلال الدین میراں شاہ آمد کے چند ماہ بعد ہی عملی کارروائیوں سے خاصے دست کش ہو گئے تھے اور ان کے بیٹے سراج الدین نے تحریک کا انتظام سنبھال لیا تھا۔ آج شمالی وزیرستان میں اسے انتہائی محترم سمجھا جاتا ہے۔ متحارب گوریلا گروہوں کے مابین مصالحت کے لیے طالبان عموماً سراج الدین کا ہی سہارا لیتے ہیں۔ سراج الدین 1979ء میں پیدا ہوا تھا مگر وہ آج حقانی نیٹ ورک کا سب سے سینئر کمانڈر ہے۔ جلال الدین کے بھائی حاجی خلیل اور ابراہیم جیسے بزرگ کمانڈر بھی اس کی قیادت میں کام کر رہے ہیں۔ اتنی کم عمری میں بھی سراج الدین کا قائدانہ رول یہ ظاہر کرتا ہے کہ اسے اپنے والد کی بھرپور حمایت اور پشت پناہی حاصل ہے۔

MashalBooks.org

سراج الدین کا پاکستان سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ وہ میراں شاہ کے مہاجر کیمپ میں پلا بڑھا اور وہ پشاور کے قریب اکوڑہ خٹک کے دارالعلوم حقانیہ میں پڑھتا بھی رہا۔ اس کے ساتھیوں کے مطابق وہ اپنے والد جیسا عالم فاضل تو یقیناً نہیں تاہم اسے ان کی نسبت زیادہ متقی اور پارسا سمجھا جاتا ہے۔

شمالی وزیرستان میں حقانی نیٹ ورک کا ڈھانچہ:

حقانی نیٹ ورک کا تنظیمی مرکز میراں شاہ میں ہے یہاں ان کے تین طرح کے مراکز ہیں۔ ایک میراں شاہ بازار کا کیمپ جہاں ان کا مدرسہ اور کمپیوٹر سنٹر قائم ہے۔ دوسرا سرائے دریہ خیل کے نواح میں ہے ایک اور مرکز ڈنڈے دریہ خیل کے قرب وجوار میں ہے جہاں جلال الدین کا خاندان رہائش پذیر ہے۔ مالی معاملات سے متعلق فیصلے، ہتھیاروں کے حصول اور ان کی تقسیم کا انتظام اور فوجی حکمت عملی جیسے مسائل زیادہ تر میراں شاہ میں ہی کیے جاتے ہیں۔

دوسرے افغان باغی گروپوں کی طرح، حقانی گروپ کو بھی مختلف ذرائع سے مالی امداد ملتی ہے۔ سراج الدین کے بعض بھائیوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ فنڈ ز اکٹھا کرنے کے لیے خلیج فارس کے علاقے میں جاتے رہتے ہیں جہاں نہ صرف افغان جہاد کے زمانے سے حقانی نیٹ ورک کے روابط ہیں بلکہ انہوں نے نئے رابطے بھی بنائے ہیں۔ افغانستان میں موجود کمانڈروں کو میراں شاہ میں موجود گروپ کے لیڈروں کی طرف سے بھی کچھ نقد رقم ملتی ہے لیکن ان سے مقامی طور پر بھی فنڈ ز اکٹھا کرنے کی توقع کی جاتی ہے۔ اس کے مختلف طریقے ہیں۔ مثلاً: مسجدوں کے ذریعے عطیات کی فراہمی، اپنے زیر کنٹرول علاقوں میں تجارت پر ٹیکس لگانا، ٹرانسپورٹ کمپنیوں سے جبری چندہ اور سرحد پار سمگلنگ وغیرہ۔ حقانی گروپ اغوا برائے تاوان کی مختلف سکیموں میں بھی ملوث رہا ہے۔ جس میں نیویارک ٹائمز کے رپورٹر ڈیوڈ رہوڈ کا اغوا بھی شامل تھا۔ سراج الدین کے ایک بھائی بدرالدین نے رہوڈ کی رہائی کے لیے کئی ملین ڈالرز اور اپنے دو افغان ساتھیوں کی واپسی کا مطالبہ کیا تھا۔

یہ نیٹ ورک عمومی طور پر چار گروپس پر مشتمل ہے۔ ایک وہ لوگ ہیں جنہوں نے سوویت مداخلت کے زمانے میں جلال الدین کی سربراہی میں کام کیا تھا۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جنہوں نے 2001ء میں تحریک میں شمولیت اختیار کی۔ تیسرے وہ لوگ ہیں جو سال ہا سال سے حقانیوں یا ان کے مدرسے سے منسلک رہے ہیں اور چوتھے غیر ملکی (غیر پختون) لوگ جن میں عرب، چیچن اور ازبک باشندے شامل ہیں۔ افغانستان میں حقانی نیٹ ورک کے جنگ جو بہت سے قبائل سے

MashalBooks.org

تعلق رکھتے ہیں تاہم شمالی وزیرستان میں نیٹ ورک کے لیڈروں کا زیادہ تر تعلق زادران قبیلے اور بالخصوص حقانی کے قبیلے میزی اور اس کے اتحادیوں سے ہے۔ تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ حقانیوں کی تحریک قبائلی نوعیت کی ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ حقانی خاندان یا ان کے قبیلے سے قریبی تعلق کی وجہ سے قیادت کا اعتماد حاصل کرنا آسان ہے۔ جلال الدین کی قیادت میں کام کرنے والے لوگوں کو سب سے زیادہ طاقت ور سمجھا جاتا ہے۔ لویا پکتیا سے آنے والے اذاروا اور غیر پختون کمانڈرز عام طور پر لیڈرشپ کے اندرونی دائرے کا حصہ نہیں بن پائے۔

شمالی وزیرستان میں حقانی نیٹ ورک کی قیادت کو عام طور پر میراں شاہ شوریٰ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ جس میں حقانی گھرانے کے افراد اور سرگرمیوں کی نگرانی کرتا ہے اور ملا عمر کی قائم کردہ کوئٹہ شوریٰ طالبان سے رابطہ کا بنیادی ذریعہ ہے۔ وہ نیٹ ورک کے ان چند لوگوں میں سے ہے جس کے تحریک طالبان پاکستان کے جنگ جوؤں اور القائدہ سے بھی رابطے ہیں۔ فیلڈ کمانڈروں سے ملنے کے لیے وہ باقاعدگی سے افغانستان جاتا رہتا ہے۔ اور بعض اوقات مقامی عسکریت پسندوں سے رابطے کے لیے پشاور اور وزیرستان بھی جاتا ہے۔

سراج الدین کا ڈپٹی کمانڈر بختی جان شمالی وزیرستان کی سیاست کا ایک اہم کردار ہے اور اس نے ایجنسی میں تحریک طالبان پاکستان اور دوسرے طالبان گروہوں کے ساتھ تعلقات میں انتہائی اہم رول ادا کیا ہے۔ سراج الدین کے قریبی مشیر کے طور پر جانا جانے والا بختی جان ایک انتہائی انقلابی اسلامی گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے آٹھ بھائیوں نے جلال الدین اور یونس خالص کی زیر قیادت سوویت یونین کے خلاف لڑائی میں حصہ لیا تھا۔ آج بھی اس کے بہت سے بھائی اور چچا حقانی کمانڈرز کے طور پر لویا پکتیا میں سرگرم عمل ہیں.......... جان باز زاردان سراج الدین کا سیاسی نائب ہے۔ میراں شاہ شوریٰ کے دوسرے اراکین کی طرح وہ فوجی کمانڈر نہیں ہے۔ اور جلال الدین کی زیر قیادت جنگ کا بھی اسے کوئی تجزیہ نہیں تاہم اس کا تعلق، پکتیا کے ضلع گرداسرائے میں واقع حقانیوں کے خاندانی گاؤں سرانی سے ہے اور وہ سراج الدین کے انتہائی قابل اعتماد ساتھیوں میں سے ہے۔ حقانی نیٹ ورک کے مالی امور، ہتھیاروں کی خرید و فروخت کا سارا انتظام اسی کے سپرد ہے۔ اپنی ذمہ داریوں کی بدولت وہ تحریک میں انتہائی مقتدر حیثیت رکھتا ہے.......... میراں شاہ شوریٰ میں حقانی خاندان کے بہت سے لوگ بھی شامل ہیں۔ ان میں برسوں پرانے کمانڈرز حاجی خلیل اور ابراہیم، (جلال الدین کے دو بھائی) بدر الدین اور ناصر الدین حقانی، (جلال الدین کے دو بیٹے) شامل ہیں۔ ناصر الدین سراج الدین کا سوتیلا بھائی ہے کیونکہ وہ جلال الدین کی عرب بیوی سے ہے۔ وہ عربی فر فر بول سکتا ہے اسی لیے القاعدہ کے

MashalBooks.org

ساتھ تعلقات میں اس کا اہم کردار رہا ہے۔ القاعدہ کا ایک سینئر کمانڈر ابولیث اللیبی، جو 2008ء کے ڈرون حملے میں مارا گیا تھا، ناصر الدین کے خاصا قریب تھا۔ امریکہ پر گیارہ ستمبر 2001ء کے حملوں سے پہلے، ابولیث خالدان ٹریننگ کیمپ کے سربراہ ابن الشیخ اللیبی کے ساتھ کام کیا کرتا تھا۔ یہ کیمپ صوبہ خوست میں حقانیوں کے علاقے میں واقع تھا۔

میران شاہ شوریٰ کے باقی اراکین میں بہت سے ایسے افغان اور پاکستانی کمانڈر شامل ہیں جو کبھی شمالی وزیرستان میں ہوتے ہیں اور کبھی افغان محاذ جنگ میں ہوتے ہیں۔ فائی ارسلا اور مولوی نور قاسم اہم افغان کمانڈرز میں سے ہیں۔ دونوں کا تعلق خوست کے ضلع صابری سے ہے۔ اسی طرح محمد امین، میرا جان اور بہرامہ جان خوست کی علی شیر ڈسٹرکٹ سے ہیں۔ زیادہ تر پاکستانی کمانڈرز سوویت دور سے ہی حقانیوں کے ساتھ ہیں۔ ان میں دارم سدگئی بہت نمایاں ہے کہا جاتا ہے کہ کابل میں ہونے والے قتل وغارت کے کئی واقعات میں اسی کا ہاتھ تھا۔ سدگئی 2008ء کے شروع میں کسی نامعلوم گن مین کے ہاتھوں مارا گیا۔

افغانستان اور پاکستان کے درمیان مسلسل سفر کے ذریعے، یہ کمانڈرز سراج الدین اور فیلڈ کمانڈروں کے درمیان رابطے کا کام دیتے ہیں تاہم 2009ء کے بعد سے سراج الدین نے زیادہ تر خود ہی محاذ جنگ پر جانا شروع کر دیا ہے۔ افغانستان میں بہت سے فیلڈ کمانڈر ہیں مگر ان میں ردوبدل ہوتا رہتا ہے کیونکہ کچھ مارے جاتے ہیں یا پکڑے جاتے ہیں۔ ملا سنگین، ان میں سے ایک اہم کمانڈر ہے جس کے بارے میں سننے میں آیا ہے کہ پی ایف سی بووی برگ ڈھال نامی امریکی سپاہی اس کے قبضے میں ہے۔ دوسرا ازاکم شاہ ہے جسے خوست میں تحریک کا شیڈو گورنر سمجھا جاتا ہے۔

فیلڈ کمانڈرز عام طور پر اپنے گروپ کے لیے افرادی قوت اکٹھی کرتے ہیں۔ عموماً یہ بھرتیاں وہ اپنے خاندانی گاؤں یا ضلع سے کرتے ہیں۔ بہت سے طالبان اراکین کے برعکس، جو لڑائی میں مصروف نہ ہوں تو کھیتی باڑی کرتے ہیں یا کوئی کام نہیں کرتے، حقانی جنگ جوؤں کا خاصا بڑا حصہ مدرسوں میں پڑھنے آجاتا ہے۔ ان میں سے بہت سے شمالی وزیرستان میں، خصوصاً جلال الدین سے متعلقہ مدرسوں میں داخلہ لے لیتے ہیں۔ اس طرح کئی حقانی جنگ جو، کوئٹہ شوریٰ کی نسبت زیادہ انقلابی اور نظریاتی تربیت کے حامل ہو سکتے ہیں۔

حقانی نیٹ ورک اور کوئٹہ شوریٰ کے مابین تعلق:

حقانی نیٹ ورک اور ملا عمر کی کوئٹہ شوریٰ تحریک طالبان کے درمیان تعلقات کی نوعیت

خاصی پیچیدہ ہے۔حقانی تحریک تاریخی اور نظریاتی طور پر طالبان سے خاصی مختلف ہے۔طالبان 1990ء کے دوران جب پکتیا اور خوست کے علاقے میں پہلی دفعہ آئے تو جلال الدین نے خاصی مزاحمت کی تھی۔لیکن بعد میں ان کے قریبی ساتھیوں (اور غالباً پاکستانی آئی ایس آئی) نے انھیں طالبان حکومت کی حمایت پر آمادہ کر لیا اور اس طرح وہ طالبان کی اطاعت قبول کرنے والے اہم ترین مجاہدین رہنما بن گئے۔اس طرح ایک منفرد صورت پیدا ہوئی جس میں حقانی گروپ طالبان حکومت کے اندر بھی ایک آزاد کمانڈر کے طور پر سرگرم رہے۔طالبان کے پورے دور حکومت میں انہوں نے اپنا گروپ قائم رکھا جو طالبان مخالف شمالی اتحاد کے خلاف محاذوں پر ان کی ہدایت کے مطابق برسر کار رہا۔وہ اپنی مختلف وزارتی پوزیشنوں میں بھی اپنے گروپ سے کام لیتے رہے......

بعض تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ ممکن ہے کہ جلال الدین اور ملا عمر کی تحریک طالبان کے درمیان یہ ڈیل خود اسامہ بن لادن نے کرائی ہو۔القاعدہ کے لیڈر نے ایک سینئر فلسطینی صحافی عبدالباری اطوان کو بتایا تھا کہ 1996ء میں کابل میں طالبان کے آخری حملے کے لیے،انہوں نے خود جلال الدین کو طالبان کی حمایت پر آمادہ کیا تھا۔یہ بہت بڑی حمایت تھی۔اطوان کا کہنا ہے کیونکہ طالبان کو عمومی فوجی تربیت حاصل نہیں تھی جبکہ اس وقت یہ تربیت ان کے لیے انتہائی اہم تھی تاکہ وہ کابل کا تحفظ کرنے والوں کا خاتمہ کرسکیں۔بن لادن کے ان دعوؤں کی تصدیق تو بہت مشکل ہے لیکن بعض ذرائع کا کہنا ہے کہ 1995ء میں،بن لادن کی افغانستان واپسی سے ایک سال پہلے ہی طالبان اور جلال الدین کے درمیان مفاہمت ہو چکی تھی۔اس قسم کی گفت وشنید یقینی طور پر مددگار رہی ہوگی کیونکہ طالبان اور حقانیوں کا ہر معاملے میں اتفاق نہیں تھا۔

جلال الدین موسیقی پر پابندی،داڑھی کی لمبائی اور تعلیم تک عورتوں کی رسائی کو محدود کرنے سے جیسے طالبان کے اقدامات کے مخالف تھے۔حقیقت یہ ہے کہ ان کی بن لادن سے طویل تعلق کے باوجود،امریکی محکمہ خارجہ،انہیں طالبان کے مقابلے میں ''سماجی طور پر زیادہ اعتدال پسند''سمجھتا تھا۔

افغانستان پر امریکی حملے کے بعد،جلال الدین حقانی نے شمالی وزیرستان میں خود کو دوبارہ منظم کیا کیونکہ یہاں ان کے تاریخی روابط تھے۔ 2001ء کے بعد،ان کے ابتدائی کمانڈرز اور جنگ جو وہی لوگ تھے جنہوں نے سوویت اور طالبان کے زمانے میں ان کی قیادت میں کام کیا تھا۔اسی وجہ سے وہ نائن الیون کے بعد افغان بغاوت میں بھی اپنی تنظیمی آزادی برقرار رکھنے میں کامیاب رہے۔

آج بھی میراں شاہ شوریٰ تحریک طالبان میں ہوتے ہوئے بھی آزادانہ کاروائیاں کرتی

MashalBooks.org

ہے۔اس کا اپنا کمانڈ اینڈ کنٹرول سسٹم ہے جس کا اوپر ذکر آ چکا ہے لیکن ان کی قیادت ملاعمر کی تنظیم سے منسلک ہے۔ کوئٹہ شوریٰ میں جلال الدین کا اپنا ایک مقام ہے جب کہ سراج الدین کو طالبان کی جانب سے لویا پکتیا کا فوجی کمانڈر مقرر کیا گیا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق لویا پکتیا میں موجود 90% جنگ جوؤں کا تعلق حقانی نیٹ ورک سے ہے۔ اس علاقے میں طالبان جنگ جو نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اکادکا موجود لوگ سراج الدین کی قیادت میں ہی سرگرم ہیں کیونکہ انتہائی خودمختاری کا حامل ہونے کے باوجود وہی طالبان کوئٹہ شوریٰ کی نمائندگی کرتا ہے۔

حقانی نیٹ ورک کے تمام بیانات اسلامی امارتِ افغانستان کے نام سے جاری ہوتے ہیں (طالبان کی سابقہ حکومت نے یہ نام اختیار کیا تھا) حقانی طالبان سے علیحدہ کوئی شناخت یا حوالہ دینے سے گریز کرتے ہیں تا کہ باغی گروہوں میں نااتفاقی سے بچا جا سکے۔ مثلاً سراج الدین نے ایک مصنف کو انٹرویو کے دوران بتایا کہ ''حقانی گروپ نام کی کوئی چیز نہیں ہم سب ملاعمر کی کمانڈ اور اسلامی امارت افغانستان کے تحت ہیں۔''

میراں شاہ شوریٰ لویا پکتیا، لوگر اور کابل میں اپنی تمام سرگرمیاں کوئٹہ شوریٰ طالبان کے ساتھ مکمل ارتباط میں جاری رکھتی ہے۔ سراج الدین کوئٹہ شوریٰ کے لیڈروں سے عموماً جنوبی وزیرستان یا پشاور میں ملتا ہے۔ کوئٹہ اس کا جانا کم ہی ہوتا ہے۔ لوگر اور کابل میں حقانی نیٹ ورک اور کوئٹہ شوریٰ کی سرگرمیاں ساتھ ساتھ جاری رہتی ہیں۔ کوئٹہ شوریٰ نے حقانی نیٹ ورک کو کابل پر حملوں کا مکمل اختیار دیا ہوا ہے۔ انہوں نے وہاں مولوی تاج میر کو اپنے آپریشنز کا سربراہ بھی مقرر کیا ہوا ہے۔

اس انتظام کی بدولت حقانی نیٹ ورک کو (کابل جیسے) علاقوں میں بھی رسائی حاصل ہو گئی ہے جہاں تاریخی طور پر ان کا کوئی خاص اثر نہیں تھا۔ سراج الدین نے اپنے اثر ونفوذ کو بڑھانے کے لیے قبائلی تعلقات اور اپنے والد کے پرانے مجاہدین نیٹ ورک کو بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً شمالی افغانستان کے صوبے قندوز کا ایک مشہور باغی لیڈر ملاعنایت اللہ بھی حقانی نیٹ ورک سے منسلک ہے۔ ضلع چہاردرہ میں رہائش پذیر عنایت اللہ حقانیوں کے زاردان قبیلے سے ہے اور تقریباً ایک درجن نائب کمانڈرز اس کے تحت کام کرتے ہیں۔ حقانی نیٹ ورک اور طالبان شوریٰ دونوں کی بیک وقت موجودگی بعض اوقات مسائل بھی پیدا کرتی ہے۔ مثلاً اکتوبر 2009ء میں، کابل میں اقوام متحدہ کے گیسٹ ہاؤس پر حملہ کوئٹہ شوریٰ کی اجازت کے بغیر کر دیا گیا تھا۔ اس واقعے سے دونوں گروپوں کے درمیان خاصی تلخی پیدا ہو گئی تھی کیونکہ طالبان شوریٰ اقوام متحدہ کے لوگوں پر حملہ کرنے سے اجتناب کرتی ہے تا کہ مستقبل کی حکومت کے طور پر، ان کا

مثبت تصور اجاگر ہو۔

بعض معاملات میں کوئٹہ شوریٰ اور حقانی نیٹ ورک ایک دوسرے کے مقابلے میں بھی آئے ہیں۔ 2008ء سے پہلے طالبان شوریٰ کا صوبہ لوگر پر مکمل کنٹرول تھا لیکن طالبان مقامی لوگوں سے سختی برتتے تھے۔ بعض اوقات گاؤں کے بزرگوں اور شہریوں کو، اپنے جنگ جوؤں کی خوراک اور پناہ گاہ کے لیے، خاصا پریشان کر ڈالتے۔ غیر ملکی جنگ جوؤں، زیادہ تر پاکستانیوں کا وہاں آنا جانا لگا رہتا تھا، جس نے مقامی لوگوں کو اور زیادہ ہراساں کیا۔ بالآخر، مقامی لوگوں نے طالبان کو زبردستی علاقے سے نکال باہر کیا اور انھیں جتا دیا کہ وہاں طالبان کو خوش آمدید نہیں کیا جائے گا۔ نتیجتاً صوبے میں طاقت کا خلا پیدا ہو گیا ہے جو نہ اتحادی فورسز بھر سکیں اور نہ ہی افغان حکومت۔

حقانی نیٹ ورک اس خلا کو پر کرنے آگے بڑھا۔ اس نے لوگر صوبے کے ان رہائشی کمانڈروں کا نیٹ ورک دوبارہ تشکیل دیا جو 1980ء کے عشرے میں صوبے کے جنوب مشرقی حصے (جس کی سرحد پکتیا سے ملتی ہے) میں جلال الدین کے تحت کام کر چکے تھے۔ کوئٹہ شوریٰ کے مقامی طالبان سے جنہوں نے مقامی لوگوں کو تنگ نہیں کیا تھا، تعلقات استوار کیے۔ 2009ء تک لوگر کے علاقے میں حقانی نیٹ ورک اہم ترین باغی گروپ بن چکا تھا۔

حقانی نیٹ ورک اور پاکستانی طالبان گروپس کے درمیان تعلق:

شمالی وزیرستان میں بھی حقانی نیٹ ورک کا مقامی جنگ جوؤں سے تعلق بھی خاصا پیچیدہ ہے۔ کئی وجوہات کی بنا پر جلال الدین کو شمالی اور جنوبی وزیرستان (کے جنگ جو منظر نامے) میں بے مثال عزت و احترام حاصل ہے تاہم خاندانی شہرت اور افغان جہاد میں ان کا کردار بنیادی وجہ ہیں۔ مثلاً: بیت اللہ محسود، جس نے پاکستان تحریک طالبان کی بنیاد رکھی، نوے کی دہائی میں جلال الدین کی ماتحتی میں افغان جنگ میں حصہ لے چکا تھا، کوئٹہ شوریٰ اور بعض اوقات پاکستانی آئی ایس آئی شمالی وزیرستان کے مقامی طالبان گروپوں کے درمیان اور پاکستانی جنگ جوؤں اور ریاست کے درمیان وقتاً فوقتاً پیدا شدہ تنازعات کے خاتمے کے لیے سراج الدین سے مداخلت کی درخواست کرتے رہے ہیں۔

نائن الیون کے بعد حقانی نیٹ ورک اور مقامی کمانڈروں کے مابین تعلقات اس وقت پیدا ہوئے جب حقانی نے امریکی حملوں کی وجہ سے شمالی وزیرستان کے قبائلی سرداروں کو، افغان

اورعرب جنگ جوؤں کوافغانستان سے باہر نکالنے کے لیے معاوضہ ادا کیا۔سراج الدین نے شمالی وزیرستان میں حافظ گل بہادر کے اہم ترین نائب مولانا صادق نور سے مضبوط رابطہ بنالیا۔وہ حقانی نیٹ ورک کوافغانستان میں جنگ جو اور خودکش بمبار مہیا کرنے لگا۔اسی طرح سراج الدین نے جنوبی وزیرستان میں ملا نذیر سے تعلقات بنائے جو خودکش بمباروں کی تربیت اوران کی سپلائی کرتا رہا۔بعض معاملات میں حقانی نیٹ ورک نے جنوبی وزیرستان میں مقیم جنگ جو کمانڈروں سے جنگ جو حاصل کیے ہیں۔قاری حسین ان میں سے ایک مثال ہے جس نے پاکستان فوج کے دباؤ کی وجہ سے اپنے تربیتی کیمپ شمالی وزیرستان میں منتقل کر لیے۔حقانی نیٹ ورک اس سلسلے میں ان پر بھروسہ کرتا ہے کیونکہ خودکش بمباروں کی تربیت کے لئے ان کے اپنے کوئی کیمپ نہیں۔

حقانی نیٹ ورک کے کمانڈر بختی جان نے اس طرح کے مذاکرات میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ 2006ء میں، اس نے شمالی وزیرستان کی قبائلی برادریوں میں نیٹ ورک کے نمائندے کے طور پر کام کیا اور اہم عسکریت پسند پاکستانی کمانڈروں کو ایک ماہ کی جنگ بندی کے لیے قائل کیا تا کہ مذاکرات کا آغاز کیا جا سکے۔اس سلسلے میں مرحوم طالبان لیڈر اختر محمد عثمانی اور بختی جان کے دستخطوں سے جاری شدہ ایک دستاویز بھی تقسیم کی گئی تھی۔اس کی عبارت یہ تھی: ''امارات اسلامی کی پالیسی یہ ہے کہ ہم پاکستان سے نہیں لڑنا چاہتے۔تمام انصار (مقامی) اور مہاجرین کو جو امارات اسلامی کے مقاصد سے ہمدردی رکھتے ہیں، مطلع کیا جاتا ہے کہ وہ پاکستان سے لڑنا بند کر دیں کیونکہ پاکستان سے لڑائی میں امریکیوں کا فائدہ ہوتا ہے۔''

سراج الدین اور بختی جان جنوبی وزیرستان کی سیاست میں بھی مسلسل مداخلت کرتے ہیں۔ انہوں نے 2006ء میں طالبان کونسلز قائم کیں تا کہ مقامی لوگوں، پاکستانی طالبان کمانڈروں اور غیر ملکی جنگ جوؤں (خصوصاً ازبکوں) کے درمیان جنم لینے والے مسائل کے حل میں مدد دی جا سکے۔ 2007ء کی ابتداء میں دونوں نے طالبان کے ملا امداد اللہ کے ساتھ مل کر جنوبی وزیرستان میں حکومت کرنے کے لیے تصادم ہوا تو حقانیوں نے دوبارہ مداخلت کر کے دوسری طالبان کونسلوں کے تمام فیصلوں پر ثالثی کے لیے ایک سپریم کونسل تشکیل دے دی۔بختی جان نے اس کونسل میں خاصا کام کیا۔بختی جان فروری 2008ء کے بیت اللہ محسود اور پاکستانی حکومت کے مابین امن مذاکرات میں بھی شریک رہا۔

حقانیوں نے فروری 2009ء میں حافظ گل بہادر، ملا نذیر اور بیت اللہ محسود کے مابین معاہدے میں بھی اہم کردار ادا کیا جس کے نتیجے میں تینوں کمانڈروں کا متحدہ محاذ شوریٰ اتحاد المجاہدین......وجود میں آیا۔اس کے لیے بختی جان اور سراج الدین نے مہینوں کام کیا اور بار باران

کمانڈروں سے ملاقاتیں کرتے رہے۔ حقانی اور کوئٹہ شوریٰ کے لیڈرز، دونوں ہی اس اتحاد کے لیے اس لیے زور لگا رہے تھے کہ تمام کمانڈرز اکٹھے ہو کر کام کریں اور افغانستان میں حملوں پر اپنی توجہ مرتکز کریں۔ اگست 2009ء میں بیت اللہ محسود کی موت کے بعد لگتا ہے کہ، یہ اتحاد ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا۔

حقانی نیٹ ورک اور غیر ملکی جنگ جوؤں کے درمیان تعلق:

جلال الدین حقانی نے 1981ء میں سوویت مخالف جنگ کے شروع میں ہی عرب عسکریت پسندوں سے رابطے مستحکم کر لیے تھے۔ ایک امریکی صحافی جیری وان ڈک، افغانستان میں حقانی کے ساتھ سفر کے دوران رشید روش مان (Rochman) نامی ایک مصری بنیاد پرست سے ملا۔ جلال الدین کے ساتھی اگرچہ رشید کو (اس کی انتہائی پسندی کی وجہ سے) پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتے تھے تاہم جلال الدین اسے پسند کرتا تھا۔ رشید روشمان نے مصری صدر انوار السادات کے حالیہ قتل کے بارے میں خاصے چبھتے ہوئے سوالات پوچھے۔ اسی قتل کی وجہ سے القاعدہ کے نائب سربراہ ایمن الظواہری مصر کی ایک جیل میں عمر قید کی سزا بھگت چکے ہیں۔ لگتا ہے کہ جلال الدین بخوبی سمجھتے تھے کہ روش مان جیسے عربوں سے تعلقات ان کی تحریک کے لیے فنڈز کی فراہمی کے ٹھوس ذرائع بن سکتے ہیں۔ خلیج میں شادی کر کے انہوں نے اپنی قرابت داری بھی قائم کر رکھی ہے اور حقانی نیٹ ورک کو زیادہ تر مالی مدد اسی طرح کے تعلقات سے فراہم ہوتی ہے۔ مزید براں تحریک کے القاعدہ اور ازبک اسلامی جہاد یونین سے بھی تعلقات ہیں اور غیر ملکی عسکریت پسندوں کے تحفظ کے لیے وہ دوسرے جنگ جو گروہوں کے ساتھ، ان کا بھرپور استعمال کرتی رہی ہے۔

بن لادن کے تعلقات حقانیوں کے ساتھ 1980ء کے عشرے کے وسط میں اس وقت قائم ہوئے جب اس نے جلال الدین کے ساتھ محاذ جنگ پر مہینوں اکٹھے گزارے۔ اس تعلق نے دونوں فریقوں کو ہی بے تحاشا فائدہ پہنچایا۔ 80ء کے عشرے میں جلال الدین سے جیسے مجاہدین لیڈر کے لیے بن لادن کی مالدار فیملی اور سعودی عرب کے شاہی خاندان سے تعلقات یقیناً انتہائی اہمیت کے حامل رہے ہوں گے اور حقانیوں کی فوجی کامیابیوں نے بن لادن کو یہ موقع فراہم کیا ہو گا کہ وہ ان کارروائیوں میں اپنے کردار کو بڑھا چڑھا کر بیان کر سکے۔

حقیقتاً بن لادن کے حقانی کے ساتھ تعلقات، طالبان حکومت کے ملا عمر کی نسبت کہیں زیادہ گہرے تھے۔ جلال الدین اور بن لادن میں کئی قدریں مشترک تھیں، بہ نسبت طالبان کے

ان پڑھ سربراہ کے ان کے لیے سوویت مخالف جہاد کی تاریخ مشترکہ تھی۔ جلال الدین عربی بول سکتا تھا۔اس کی بیوی عرب تھی۔ ممکن ہے بن لادن جلال الدین کی ظاہری شان وشوکت سے متاثر بھی رہا ہو۔ افغان کمانڈر نے 1980ء کے زمانے میں AK74 نامی کمیاب رائفل کی، اپنی لیڈر شپ کی علامت کے طور پر خوب نمائش کی تھی۔ 1987ء میں لائنز ڈین کی جنگ کے بعد ابوعبیدہ النبشیر ی نامی ایک اہم نائب نے اسی ماڈل کی رائفل بن لادن کو دی وہ اسے ہر جگہ اپنے ساتھ رکھتا تھا یہاں تک کہ وہ رائفل اپنے ساتھ سوڈان بھی لے گیا۔ القاعدہ اور اس سے منسلک گروپوں کے حقانی نیٹ ورک میں دو اہم رول ہیں: حملوں کے لیے سہولتیں دینا اور خودکش بمباروں کی فراہمی۔ حملوں کی سہولت میں تربیت، ہتھیاروں کی مہارت، ہتھیاروں اور مالی وسائل کی فراہمی شامل ہے۔ میراں شاہ میں اور اس کے اردگرد حقانیوں کے ٹھکانوں میں القاعدہ کے اسلحہ کے درجنوں ذخیرے ہیں۔

حالیہ سالوں میں حقانی نیٹ ورک مضبوط ہوا ہے اور القاعدہ کی سرگرمیاں محدود ہوتی چلی گئی ہیں، اس لیے نیٹ ورک کی سہولت کاری کا رول تقریباً ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ تاہم القاعدہ، اسلامی جہاد یونین اور دوسرے گروپس خودکش بمبار اب بھی فراہم کر رہے ہیں۔ کابل میں قتل وغارت کے کئی بڑے کمانڈو سٹائل۔ خودکشی مشنز میں القاعدہ کے تربیت یافتہ حملہ آور استعمال ہوئے ہیں مثلاً: اکتوبر 2009ء میں اقوام متحدہ کے گیسٹ ہاؤس پر حملے میں القاعدہ کے تربیت یافتہ غیر افغان افراد کو استعمال کیا گیا۔ حقانی نیٹ ورک کا القاعدہ کے ساتھ براہِ راست رابطہ (ڈرون حملوں کے باعث انتہائی خطرناک اور مشکل ہونے کی وجہ سے) اب نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے۔ تاہم یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ تعلقات مقامی گروپ کی (القاعدہ کے دشمن) حکومت پاکستان سے ملاپ کی وجہ سے متاثر ہوئے ہیں۔

پاکستانی حکومت نے حقانیوں کے ٹھکانوں پر، جہاں القاعدہ کے لوگ یا ان کی رسد موجود ہے، بارہا حملے کیے ہیں لیکن حقانی نیٹ ورک کے لوگوں کو بالکل نہیں چھیڑا گیا۔ اسی لیے القاعدہ نے جنوبی وزیرستان میں دوسرے جنگ جوؤں سے آہستہ آہستہ اپنی قربت بڑھائی ہے۔ ان میں بیت اللہ محسود اور بعد ازاں حکیم اللہ محسود کے حامی گروپ شامل ہیں جو پاکستانی حکومت سے بھی برسرِپیکار ہیں۔

القاعدہ کے ساتھ حقانی نیٹ ورک کی نظریاتی وابستگی کے بارے میں حتمی فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ نیٹ ورک کے کمانڈروں کا کہنا ہے کہ ان کی تحریک القاعدہ کے بین الاقوامی جہاد کے نظریے کے بجائے کوئٹہ طالبان شوریٰ کے قوم پرستی پر مبنی جدوجہد کے زیادہ قریب ہے لیکن گروپ کے

بہت سے لوگ القاعدہ کی زبان استعمال کرتے ہیں۔حقانیوں نے پاکستانی طالبان اور القاعدہ کے پاکستان مخالف اشتراک سے ہمیشہ دور رہنے کی کوشش کی ہے۔ جون 2006ء میں حقانی گروپ کے آفس نے اپنے ایک خط میں واضح طور پر کہا کہ ''پاکستان پر'' حملہ کرنا ہماری پالیسی نہیں ہے۔ جو ہم سے متفق ہیں وہ ہمارے دوست ہیں اور لوگ ہم سے متفق نہیں اور پاکستان پر غیر اعلانیہ جنگ جاری رکھنا چاہتے ہیں، وہ ہمارے دوست نہیں اور نہ ہی ہم انھیں اپنی صفوں میں گھسنے کی اجازت دیں گے۔

سراج الدین نے ایک انٹرویو میں اس کی مزید وضاحت کی کہ اس نے ''مسلمانوں کے ذریعے غیر مسلم ممالک میں حملے کی بھی'' مخالفت کی۔ مئی 2009ء میں دو فرانسیسی صحافیوں سے بات کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ سوچنا غلط ہے کہ القاعدہ اور طالبان ایک ہی مقصد کے لیے مصروف عمل ہیں۔القاعدہ ساری دنیا میں اپنا اثر ونفوذ بڑھانا چاہتا ہے۔ ہمیں اس میں کوئی دلچسپی نہیں۔ طالبان کا مقصد افغانستان کو غیر ملکی افواج کے تسلط سے آزاد کرانا ہے۔''

تاہم حقانی نیٹ ورک کے سابقہ کمانڈروں کا کہنا ہے کہ تحریک کے القاعدہ کے ساتھ ناطے اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتے جب تک ان پر سفارتی اور فوجی ذرائع سے زبردست دباؤ نہ ڈالا جائے۔ یہ بھی واضح نہیں کہ نیٹ ورک کے سارے کمانڈر القاعدہ سے لاتعلقی کے بارے میں سراج الدین سے متفق ہیں۔ ایک اہم فوجی کمانڈر ملا سنگین نے القاعدہ کے میڈیا نمائندے السحاب سے شیخ عثمان نے امیر المومنین ملا عمر کو بارہا اپنی وفاداری کا یقین دلایا ہے۔ ہمارے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔

نیویارک ٹائمز کے صحافی ڈیوڈ رہوڈ نے، جسے حقانی نیٹ ورک کے لوگوں نے اغوا کر لیا تھا اور سات ماہ تک شمالی وزیرستان میں قید رکھا تھا، بچ نکلنے کے بعد کہا کہ وہ ''پوری طرح سمجھ نہیں پایا کہ بہت سے طالبان کس حد تک انتہا پسند ہو چکے ہیں۔ اغوا ہونے سے پہلے میں انھیں القاعدہ کی طرح کا سمجھتا تھا جو مذہبی میلان کی وجہ سے بنیادی طور پر افغانستان پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن حقانی نیٹ ورک کے لوگوں کے ساتھ رہتے ہوئے میں نے جانا کہ شدت پسند طالبان کا مقصد بہت بڑا ہے۔ قبائلی علاقے میں غیر ملکی جنگ جوؤں کی موجودگی نے نوجوان طالبان پر خاصا گہرا اثر ڈالا ہے اور وہ القاعدہ کے ساتھ مل کر پوری مسلم دنیا میں اسلامی امارت قائم کرنے کے خواہاں ہیں۔

حقانی نیٹ ورک: حربے اور حکمت عملی:

حقانی نیٹ ورک نے افغانستان میں شہری مراکز پر اہم حملوں کے دوران دوسرے باغی گروہوں کی نسبت کہیں زیادہ (Sophistication) اور جرأت مندی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان کی پہلی ایسی کاروائی 2008ء کی ابتداء میں کابل کے سرینا ہوٹل پر حملہ تھا۔ آنے والے مہینوں میں گروپ نے بہت سے حملے کیے جن میں اوپر تلے اہم مقامات کو نشانہ بنایا گیا۔ ان میں صدر کرزئی پر قاتلانہ حملہ، بھارتی سفارت خانے کے خلاف دو کار بم دھماکے اور دوسرے حکومتی دفاتر پر حملے شامل ہیں۔ اس طرح کی قتل وغارت عموماً غیر ملکی جنگ جو کرتے رہے ہیں۔ حقانی نیٹ ورک نے ''حمزہ بریگیڈ'' کے نام سے ایک گروپ تشکیل دیا ہوا ہے جو خودکش حملوں کو نہ صرف منظم بلکہ استعمال بھی کرتا ہے۔ ملا نذیر اور مولانا صادق جیسے پاکستانی جنگ جو اور بعض اوقات عرب گروپس بھی، حقانی نیٹ ورک کو بھیجنے سے پہلے، خودکش بمباروں کی بھرتی اور تربیت کا کام کرتے ہیں۔

2009ء میں نیٹ ورک نے گردیز (پکتیا)، خوست شہر اور پل عالم (لوگر صوبہ) کے نسبتاً چھوٹے غیر محفوظ شہری علاقوں میں بھی اسی طرح کے حملے کیے۔ طالبان کے ایک رسالے ''الصمود'' میں دیے گئے انٹرویو میں حقانی نیٹ ورک کے کمانڈر مولوی نور قاسم نے وضاحت کی۔ ''اس قسم کے حملوں کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ مجاہدین میں شہروں کے بیچوں بیچ حملے کرنے کی صلاحیت موجود ہے اور وہ کہیں بھی فوجی اور حکومتی مراکز کو براہِ راست نشانہ بنا سکتے ہیں۔

دیہاتی علاقوں میں حقانی نیٹ ورک روڈ سائڈ بموں اور مارو اور بھاگ جاؤ جیسے حربے استعمال کرتا ہے۔ (طالبان کی طرح) تاہم طالبان کے برعکس نیٹ ورک کے زیر کنٹرول علاقوں میں کوئی وسیع حکومتی ڈھانچہ نہیں۔ مثلاً غزنی اور ہند کے صوبوں میں طالبان کی مکمل انتظامیہ موجود ہے جو ٹیکس وصولی، ترقیاتی کاموں اور عدلیہ کے شعبوں پر مشتمل تھے۔ حقانی کے زیر کنٹرول علاقوں میں ایسے ادارے ناپید ہیں تاہم لویا پکتیا کے علاقوں میں کہا جاتا ہے کہ جھگڑوں کو طے کرنے کے لیے اسلامی عدالتیں بنائی گئی ہیں۔

حقانیوں کے، سوویت مخالف بغاوت کے زمانے سے آئی ایس آئی سے قریبی تعلقات چلے آتے ہیں۔ اس زمانے میں جلال الدین کو آئی ایس آئی اور سی آئی اے کا پسندیدہ کمانڈر سمجھا جاتا تھا۔ یہ تعلقات آج بھی قائم ہیں: پاکستان کی خفیہ ایجنسیوں کے افسران کے خیال میں حقانی نیٹ ورک افغانستان میں پاکستان کے مفادات کو آگے بڑھانے میں انتہائی اہم ہے۔ مثلاً 2008ء کے موسم گرما میں کابل کے بھارتی سفارت خانے پر کار دھماکہ، افغان اور امریکی خفیہ اداروں کے مطابق، آئی ایس آئی اور حقانی نیٹ ورک کی مشترکہ کارروائی تھا۔ اس حملے میں دو سینئر بھارتی افسروں کو نشانہ بنایا گیا تھا جن میں سے ایک ڈیفنس اتاشی مارا گیا تھا۔ آئی ایس آئی نے بھارتی افسروں کے

راستوں اور وقت کے متعلق حقانی نیٹ ورک کو مکمل تفصیل فراہم کی تھی۔خود کش بمبار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حملہ ایسے ہوا جیسے وہ بھارتی ڈیفنس اتاشی کے نیٹ پر آنے کا ہی منتظر تھا۔

جلال الدین حقانی نے 2001ء میں جب طالبان کی حکومت ختم ہونے جا رہی تھی افغانستان میں عسکریت پسندوں کی حمایت سے متعلق پاکستانی ارادوں کو اس طرح بیان کیا تھا۔

''پاکستان کی مشرقی سرحد پر بھارت ہے...... پاکستان کا ازلی دشمن۔ افغانستان میں طالبان حکومت کی موجودگی میں، پاکستان کے پاس 2300 کلومیٹر طویل بے مثال گہرائی موجود ہے جس کا صدر مشرف نے بھی بڑے فخریہ طور پر اظہار کیا ہے۔کیا پاکستان واقعی ایک ایسی نئی حکومت چاہتا ہے جس میں پرو انڈیا لوگ بھی شامل ہوں گے اور اس طرح ساری اسٹریٹجک گہرائی ہوا ہو جائے گی۔''

حقانی نیٹ ورک کے لوگ اور امریکی خفیہ اداروں کے افسران، دونوں کا ہی کہنا ہے کہ حقانیوں کے لیے آئی ایس آئی کی امداد براہِ راست اور واضح نہیں ہے۔ پاکستانی خفیہ اداروں نے حقانی نیٹ ورک کو معمولی مالی امداد اور تھوڑی بہت تربیت دی ہے لیکن دراصل اہم بات یہ ہے کہ وہ انھیں خفیہ معلومات اور محفوظ پناہ گاہ فراہم کر رہے ہیں۔

حقانی نیٹ ورک کے سابقہ اور حالیہ جنگ جوؤں کے مطابق آئی ایس آئی کے افسران میران شاہ میں ان کے ٹھکانوں پر حملہ سے پہلے سراج الدین کو بتا دیتے ہیں۔حقانی جنگ جو اپنے اہم کاغذات اکٹھے کر کے، پہاڑی پناہ گاہوں کی طرف فرار ہو جاتے ہیں اور صورتِ حال محفوظ ہونے تک وہیں انتظار کرتے ہیں۔ یہ کوئی بہت شاندار سسٹم نہیں: حملے عام طور پر ہتھیاروں کی تباہی کی کہانی بتاتے ہیں یا کبھی کبھار کسی القاعدہ لیڈر کے پکڑے یا مارے جانے کی خبر پر منتج ہوتے ہیں جس سے نیٹ ورک اور القاعدہ کے مابین تلخیاں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ بہرحال اس طرح حقانیوں کو انتہائی قیمتی محفوظ پناہ گاہ حاصل رہتی ہے۔ بعض اوقات تو نیٹ ورک کے آپریشن کمانڈر پاکستانی فوج سے خوف زدہ ہونے کے بجائے، مزے لیتے نظر آتے ہیں۔

شمالی وزیرستان کی وجہ سے حقانیوں کو ایسا ٹھکانا میسر ہے جہاں وہ امریکی فوجی حملوں سے بچ سکتے ہیں (البتہ سرحد پار سے ان پر ڈرون حملے ہوتے رہتے ہیں) لیکن اس صورتِ حال سے بھی کئی پیچیدگیاں جنم لیتی ہیں۔حقانی نیٹ ورک کے سابقہ اور حالیہ جنگ جوؤں کو یہ شکایت رہی ہے کہ پاکستان ان سے اپنی باتیں منواتا رہتا ہے اور مشکل وقت میں انھیں تنہا چھوڑ دیتا ہے۔

2010ء کے موسم سرما میں طالبان لیڈروں کی گرفتاری اس صورتِ حال کو واضح کرتی ہے۔ پاکستان نے ان سالوں کے دوران کئی بار حقانی گروپ کے کئی اہم لیڈروں کو گرفتار کیا ہے جن میں بختی جان بھی شامل ہے۔ان سب کو بعد ازاں رہا کر دیا گیا لیکن اس طرح کی گرفتاریاں انھیں

تحریک کے مقابلے میں پاکستان کی برتری کا احساس دلاتی رہتی ہیں۔ایک انٹرویو کے دوران ایک حقانی کمانڈر نے کہا:''پاکستان جب چاہے، ہمارے پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچ سکتا ہے۔''

حافظ گل بہادر اور قبائلی جنگ جو:

حقانیوں کے بعد حافظ گل بہادر شمالی وزیرستان میں پاکستانی جنگ جوؤں کا ایک اہم لیڈر ہے۔وہ تقریباً 45 سال کا ہے اور اس کا تعلق عثمان زئی وزیر قبیلے کی شاخ مدا خیل سے ہے جو میران شاہ اور افغان سرحد کے درمیان پہاڑیوں میں رہتا ہے۔وہ لوارا کا رہائشی ہے۔اور ایک دیو مالائی کردار اپیّ کے فقیر کی اولاد میں سے ہے جس نے 1930ء اور 1940ء کے درمیان برطانوی قبضے کے خلاف بغاوت کے نت نئے طریقے اختیار کیے تھے۔ بہادر ایک مذہبی عالم ہے اور اس نے ملتان کے ایک دیوبندی مدرسے سے تعلیم حاصل کی تھی۔ بہادر نے افغانستان کی سول وار میں بھر پور حصہ لیا تھا۔سوویت فوجوں کی واپسی کے بعد وہ شمالی وزیرستان واپس آ گیا اور فضل الرحمٰن کی جمعیت علمائے اسلام کا سرگرم سیاسی کارکن بن گیا۔ وہ 2004ء میں شمالی وزیرستان میں فوجی آپریشن کے دوران مشہور ہوا۔وہ افغان حکمت عملی اور آپریشن کے حوالے سے حقانیوں کے ساتھ قریبی رابطے میں رہتا ہے۔آج براہ راست بہادر کی کمانڈ میں 1500 جنگ جو ہیں۔

حکمت عملی اور تعلقات:

بہادر انتہائی زیرک اور عملی سوجھ بوجھ کا مالک ہے۔شمالی وزیرستان میں اور باہر بھی اس کے جنگ جو گروہوں سے بہت اچھے تعلقات ہیں۔ وہ پاکستانی حکومت سے تصادم سے بچنے کی کوشش کرتا ہے تا کہ بلاوجہ کی محاذ آرائی نہ ہو۔اس نے اگر چہ بیت اللہ محسود اور اس کے جانشینوں کے ساتھ پاکستان مخالف تحریک طالبان پاکستان کے ساتھ اتحاد ضرور کیا لیکن حتی الامکان ایسے اقدامات سے گریز کرتا رہا جس کے نتیجے میں پاکستانی حکومت بھڑ جائے۔ یہ قطعاً حیرت کی بات نہیں کہ پاکستان کے بارے میں گل بہادر کا رویہ بھی حقانیوں سے ملتا جلتا ہے (جو کبھی ISI کے پسندیدہ رہ چکے ہیں) حقانیوں کی طرح گل بہادر کی تمام کاروائیوں کا ہدف بھی امریکی اور نیٹو افواج ہیں۔

دوسری ایجنسیوں میں موجود طالبان جنگ جوؤں کے ساتھ گل بہادر کے تعلقات خاصے پیچیدہ ہیں۔اگر چہ اس نے 2006ء اور 2008ء میں پاکستانی فوج کے خلاف شمالی وزیرستان میں طالبان جنگ جوؤں کا ساتھ دیا تھا مگر ساتھ ہی اس نے پاکستانی حکومت کے ساتھ دو امن معاہدے بھی کیے۔ بہادر پاکستانی طالبان کے دوسرے گروہوں کے اتحاد میں آتا جاتا رہا ہے لیکن

اس نے ان سے ہمیشہ کار آمد تعلقات قائم رکھے ہیں۔ حال ہی میں بیت اللہ محسود کی موت کے بعد، اس نے پاکستانی مخالف محاذ سے علیحدگی اختیار کر لی تاہم وہ اب بھی جنوبی وزیرستان میں پاکستانی فوج کے حملوں سے بچ نکلنے والے محسود گروپ کے لوگوں کو پناہ دے رہا ہے۔

پاکستانی طالبان نامی تنظیم دسمبر 2007ء میں فاٹا اور سرحد کے صوبے میں موجود جنگ جوؤں کے مختلف گروہوں کو اکٹھا کرنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ اس کی تشکیل کے وقت بیت اللہ محسود کو اس کا امیر اور گل بہادر کو اس کا نائب بنایا گیا تھا۔ یہ اتحاد خاصا تعجب انگیز تھا کیونکہ بیت اللہ محسود کے جنوبی وزیرستان میں شدید مخالف ملا نذیر سے گل بہادر کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ مزید براں گل بہادر محسود کے ازبک ساتھیوں سے بھی خاصا تنگ تھا جو ملا نذیر کے علاقے وزیرستان سے نکالے جانے کے بعد میر علی کے علاقے میں آباد ہو گئے تھے۔

اگرچہ پاکستانی طالبان TTP اتحاد پاکستانی حکومت کے خلاف بنایا گیا تھا لیکن اس کے بنتے ہی گل بہادر نے حکومت سے مذاکرات شروع کر دیے۔ یہ قطعاً حیرت انگیز نہیں کہ وہ زیادہ عرصہ طالبان کے ساتھ نہیں چل سکا۔ اس نے پاکستان سے محاذ آرائی پر مصر بیت اللہ محسود کی مخالفت میں ملا نذیر کے ساتھ مل کر جولائی 2008ء میں نیا اتحاد قائم کر لیا۔ بعض رپورٹس کے مطابق بیت اللہ محسود کی طاقت ختم کرنے کے لیے حقانیوں نے اس اتحاد کی بھرپور حمایت کی تاہم محسود مخالف اتحاد بھی زیادہ عرصہ نہ چل سکا۔ 2009ء میں، سراج الدین حقانی کے کہنے پر بیت اللہ محسود، ملا نذیر اور حافظ گل بہادر نے شوریٰ اتحاد المجاہدین کا اعلان کر دیا۔ یہ اتحاد باہمی تنازعات کو ختم کرنے کے لیے بنایا گیا تھا اور کہا جاتا ہے کہ اس میں شامل تمام گروہوں کی گزشتہ غلطیوں کو معاف کر دیا گیا تھا۔ جون 2009ء میں اسی معاہدے کے تحت گل بہادر نے شمالی وزیرستان میں ایک فوجی قافلے پر حملہ کیا جو محسود کے خلاف جنوبی وزیرستان میں فوجی آپریشن کی مدد کے لیے جا رہا تھا۔ جنوبی وزیرستان میں جانے کے لیے فوجی رسد کے راستوں پر ان کے حملے بیت اللہ محسود کے خلاف کارروائی میں پاکستانی فوج کے لیے انتہائی خطرناک تھے کیونکہ جنوبی وزیرستان کے لیے موزوں راستے نہ ہونے کے برابر ہیں۔

کہا جاتا ہے اگست 2009ء میں بیت اللہ محسود کی موت کے بعد شوریٰ اتحاد بھی ختم ہو کر رہ گیا۔ اب گل بہادر اور پاکستانی فوج کے درمیان تصادم کے واقعات منظر پر نہیں آ رہے۔ لگتا ہے کہ بہادر کے لوگ پاکستانی فوج کی شمالی وزیرستان میں آنے جانے پر کوئی رکاوٹ نہیں ڈال رہے۔ یہ واضح نہیں کہ بیت اللہ محسود کی موت کے محسود جنگ جوؤں اور گل بہادر کے درمیان تعلقات پر کیا اثرات ہوئے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ بیت اللہ محسود کی وفات کے بعد اتحاد ختم ہو

گیا۔ بعض ذرائع کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوا کیونکہ بیت اللہ کے جانشین اور اس کے کزن حکیم اللہ محسود کے گل بہادر سے خاصے قریبی تعلقات ہیں۔ (خیال کیا جاتا ہے کہ جنوری 2010ء کے ڈرون حملے میں حکیم اللہ محسود مارا گیا تاہم پاکستانی طالبان اس کی موت سے انکاری ہیں)

گل بہادر کا انتہائی اہم کمانڈر صادق نور دوڑ قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔ 45 سالہ صادق نور کے افغان طالبان سے 1996ء سے تعلقات ہیں جب انہوں نے افغانستان میں حکومت قائم کی تھی۔ بہادر کی طرح صادق نور بھی میران شاہ کے قریبی علاقے میں رہائش پذیر ہے اور منبع الاسلام نامی مدرسہ چلاتا ہے جو جلال الدین نے 1980ء کے زمانے میں سوویت مخالف افغان جہاد کی مدد کے لیے بنایا تھا۔ یہ مدرسہ اور اس کے ساتھ ہی واقع رہائشی عمارت صادق نور کا ہیڈ کوارٹر بھی رہے۔ ستمبر 2008ء کے ایک ڈرون حملے میں اس ہیڈ کوارٹر کو تباہ کر دیا گیا۔ اگرچہ صادق نور اس حملے میں خود تو بچ نکلا مگر کہا جاتا ہے کہ اس میں اس کے گھرانے کے یا حقانی گھرانے کے نو افراد مارے گئے تھے۔

جلال الدین سراج الدین کے ساتھ صادق نور کی انتہائی قربت، ان کے مدرسے منبع الاسلام میں اس کی کارگزاری کے پس منظر میں اس طرح کی الجھن یقیناً قابل فہم ہے۔ صادق نور کے گروہ میں آٹھ سو لڑاکے شامل ہیں۔ شمالی وزیرستان میں صادق کا دایاں بازو سعید خان دور ہے۔ اس کا کردار مُشیر کی طرح کا ہے۔ سعید خاں بھی میران شاہ سے ہے۔ وہ صادق نور اور بہادر سے خاصا چھوٹا ہے۔ اس کی عمر 33 یا 34 برس ہوگی۔ یونیورسٹی سے گریجویشن کی ہوئی ہے اور کہتے ہیں کہ وہ کمپیوٹر کا بھی ماہر ہے۔ کچھ افواہوں کے مطابق اس کا کوڈ نام آریانا ہے۔ لیکن وہ منظر عام پر نہیں آتا اور میڈیا سے خصوصاً دور رہتا ہے۔

بہادر کا ایک اور کمانڈر مولانا عبدالخالق حقانی ہے۔ اس کا تعلق بھی دوڑ قبیلے سے ہے۔ میران شاہ میں رہتا ہے اور اس کے پاس پانچ سو کے قریب لڑاکے ہیں۔ عبدالخالق بھی گل بہادر کی طرح پاکستانی طالبان اور حکومت کے درمیان ایک طرح کا توازن رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ تاہم مقامی اداکاروں کے مطابق پاکستانی حکومت کے خلاف بھرپور تصادم میں عبدالخالق جنگ جوؤں کی مزاحمت کا ساتھ دے گا۔ وحید اللہ وزیر میران شاہ کے اردگرد موجود اپنے قبیلے کے دو سو جنگ جوؤں کا سربراہ ہے۔ وحید اللہ گروپ بھی سرحد پار افغانستان کے حملوں میں ملوث ہے لیکن 2006ء اور 2008ء کے دوران پاکستانی فوج کے خلاف بھی کارروائیاں کر چکا ہے۔ اسی طرح ایک اور 35 سالہ حلیم اللہ دوڑ نامی جنگ جو میر علی میں رہتا ہے۔ اس کا گروہ 150 آدمیوں پر مشتمل ہے۔ وہ بھی سرحد پار نیٹو افواج پر حملوں میں شامل ہے تاہم اس نے بھی 2006ء اور 2008ء میں

پاکستانی فوج کے خلاف خاصی سرگرمی دکھائی تھی۔

شمالی وزیرستان میں بہادر کا ایک اور اتحادی سیف اللہ وزیر ہے۔شوال میں موجود مقامی عثمان زئی وزیروں سے اس کا تعلق ہے۔شوال(Shawal) شمالی وزیرستان میں غیر ملکی جنگ جوؤں کی پناہ گاہ کے طور پر خاصا بدنام رہا ہے۔وہ بہادر کے خاصا قریب ہے اور جنگ جوؤں اور پاکستانی حکومت کے مابین 2006ء کے امن معاہدے میں اس نے گل بہادر کی نمائندگی کی تھی۔ اس کی ملیشیا میں چار سو لڑاکے ہیں جن میں بہت سے افغانستان میں نیٹو اور امریکی افواج کے خلاف نبرد آزما ہیں۔پاکستانی فوج کے ساتھ محاذ آرائی کے بارے میں بھی اس کی خاصی شہرت ہے۔

شمالی وزیرستان میں کئی طرح کے گروپ، ذاتی یا سیاسی وجوہ کی بنا پر گل بہادر کی براہِ راست کمان میں کام نہیں کرتے۔ایک گروہ کا سربراہ میراں شاہ سے وزیر قبیلے کا زنجیر نامی شخص ہے جس کی تمام تر توجہ افغانستان میں امریکی اور نیٹو افواج پر حملوں پہ ہے۔گل بہادر اور دوسرے جنگ جوگروہوں (جن کا تعلق جمعیت علمائے اسلام کے فضل الرحمٰن گروپ سے جاملتا ہے) کے برعکس زنجیر کا سیاسی تعلق جماعت اسلامی اور گل بدین حکمت یار کی حزب اسلامی سے ہے۔

میرعلی کے ایک سکول ٹیچر رسول خاں دوڑ کی اپنی ایک آزاد ملیشیا ہے۔گل بہادر نے اسے میرعلی بازار کا سربراہ بنایا تھا لیکن 2009ء میں اسے ہٹادیا گیا۔اسکے بعد وہ اپنا جنگ جوگروپ چلا رہا ہے۔اس کی زیادہ تر کارروائیاں مجرمانہ نوعیت کی ہوتی ہیں۔شاید گل بہادر نے اسے اسی وجہ سے اپنے گروپ سے نکالا ہو۔اس کے جنگ جو امریکی یا نیٹو افواج پر حملے نہیں کرتے ہیں بلکہ پاکستانی فوج اور شمالی افغانستان میں فوجی ٹھکانوں کو نشانہ بنانے کے لیے مشہور ہیں۔

ایک اور اہم اور آزاد جنگ جو لیڈر مولانا منظور دوڑ ہے۔یہ میرعلی کے قریب واقع ایدک نامی گاؤں سے تعلق رکھتا ہے۔کہتے ہیں کہ اس کے پاس 300 طالبان جنگ جو ہیں اور غیر ملکی جنگ جوؤں میں اس کی خاصی حمایت موجود ہے۔

اسی حمایت کی وجہ سے بہادر اور صادق نور کے ساتھ اس کا جھگڑا شروع ہوا کیونکہ 2006ء میں انہوں نے غیر ملکی جنگ جوؤں کو علاقے سے نکالنے کی کاروائی کی تھی۔منظور کی ملیشیا افغانستان میں امریکی اور نیٹو افواج اور پاکستان میں پاکستانی افواج سے متصادم رہتی ہے۔ایک اور جنگ جوگروہ کا سربراہ 45 سالہ حق نواز دوڑ ہے۔وہ دوڑ قبیلے کا ایک عالم آدمی ہے۔اس کی کاروائیاں میراں شاہ کے اردگرد ہوتی ہیں۔اس کا تعلق بھی نزدیکی گاؤں ایسوری سے ہے۔ علاقے میں کام کرنے والے غیر ملکی جنگ جوؤں (خصوصاً ازبکوں سے) سے اس کے تعلقات اچھے ہیں۔صادق نواز اور گل بہادر کے ساتھ بھی اس کی وجہ نزاع یہی ہے۔حق نواز پاکستانی فوج

سے لڑنے سے بچتا ہے۔ تقریباً 300 جنگ جو اس کی کمان میں ہیں۔

غیر ملکی عسکریت پسند:

قبائلی لڑاکوں کے علاوہ، حق نواز ایک عراقی جہادی ابو کاشا کے گروہ کے ساتھ بھی کام کرتا ہے۔ ابو کاشا 2002ء سے اپنے بیوی بچوں سمیت مرعلی میں رہائش پذیر ہے۔ اس کا اصلی نام عبدالرحمٰن ہے۔

ابو کاشا ایک دلچسپ شخصیت ہے کیونکہ اس نے القاعدہ کے ساتھ تعاون کبھی کبھار ہی کیا ہے۔ 2005ء میں اپنے عراقی لیڈر شپ ایمن الظواہری سے اختلافات کے بعد اس نے گروپ چھوڑ دیا تھا۔ اگرچہ اب بھی ابو کاشا کے القاعدہ سے گہرے تعلقات ہیں مگر اس نے جیش المہدی کے نام سے اپنا علیحدہ گروپ قائم کر لیا ہے جس میں مقامی دور قبیلے، ازبکوں، چیچین، تاجکوں اور ترکمانوں پر مشتمل 250 سے 300 لڑاکا لوگ ہیں۔ ابو کاشا کے ازبکستان کی اسلامی تحریک اور اسلامی جہاد گروپ سے بھی قریبی تعلقات ہیں۔

ابو کاشا نے مقامی سوسائٹی میں اپنا مقام بنانے کے لیے، بہت محنت کی ہے اور اب اسے مقامی ہی سمجھا جاتا ہے۔ میر علی میں خوشی یا غم کا کوئی بھی موقع ہو، ابو کاشا اس میں شریک ہوتا ہے۔ اس کے بعض ساتھی اسے پیر بھی سمجھتے ہیں۔ 2006ء کے ایک واقعے کی وجہ سے۔ (پاکستانی فوج کے آپریشن کے دوران) ابو کاشا کسی مقامی کے گھر ٹھہرا ہوا تھا۔ وہاں سے رخصت ہوتے ہوئے اس نے مکان مالک سے کہا کہ اس کا گھر تباہ نہیں کیا جاسکے گا۔ پاکستانی فوج نے اس گھر کو کئی دفعہ مسمار کرنے کی کوشش کی لیکن وہ گھر کو ڈائنامائٹ سے نہیں اڑا سکے۔ اس وقت سے مقامی لوگ اس سے اپنے مسائل حل کرانے تعویذ وغیرہ لینے جاتے رہتے ہیں اس وعدے کے ساتھ کہ اس سے حاصل شدہ منافع کو امریکی اور نیٹو افواج کے خلاف جہاد کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ ابو کاشا مقامی عدالت بھی لگاتا ہے اور فریقین میں مصالحت کرانے کی بیس سے پچاس ہزار روپے تک فیس لیتا ہے۔ اگر کوئی یہ رقم دینے میں ہچکچاہٹ محسوس کرے تو اس کے مسلح ملیشیا کے لوگ اس کی ادائیگی پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ رقوم افغانستان میں جنگ کے لیے استعمال ہوں گی۔ حال ہی میں جنوبی وزیرستان میں آپریشن کے دوران تحریک طالبان پاکستان کے، اس علاقے میں بھاگ کر آنے والے، جنگ جوؤں کی ابو کاشا نے بہت مدد کی ہے۔

مولانا صادق نور کے ساتھ ابو کاشا کے تعلقات اچھے نہیں۔ گل بہادر کے طاقتور کمانڈر صادق نور کو میراں شاہ میں ابو کاشا کے اہم رول پر سخت اعتراض ہے، بالخصوص قبائلی رسوم میں

ابو کاشا کی شرکت اور مصالحت کاری پر۔ فاٹا میں کئی دوسرے عسکریت پسندوں کی طرح، 2006ء کے ڈرون حملے کے بعد سے ابو کاشا بھی اپنی حفاظت کا خاصا خیال رکھتا ہے۔ اس ڈرون حملے میں وہ بال بال بچا تھا۔ اب وہ ڈرون ہی کی رفتار سے متحرک رہتا ہے اور چند دن سے زیادہ ایک جگہ نہیں ٹھہرتا۔

القاعدہ:

غیر ملکی جنگ جو شمالی وزیرستان میں سرحد کے ساتھ ساتھ زیادہ تر میراں شاہ اور میر علی میں رہتے ہیں۔ ابو کاشا کی طرح اسلامی جہاد یونین کا سربراہ نجم الدین جلالوی بھی میر علی میں رہتا ہے۔ شمالی وزیرستان میں امریکی ڈرون حملوں کے ذریعے القاعدہ کے کافی اہم لیڈر مثلاً: ابولیث اللبی اور ابو جہاد المصری مارے جا چکے ہیں۔ 8 دسمبر 2008ء کو صالح اور الصومالی (رکن القاعدہ) کو ڈرون کا نشانہ بنایا گیا۔ کہتے ہیں وہ بیرونی حملوں کی منصوبہ بندی کیا کرتا تھا۔ القاعدہ کے عربوں کے بارے میں خیال ہے کہ وہ شوال پہاڑیوں، میر علی اور میراں شاہ کے علاقوں میں رہتے ہیں۔

افغانستان اور پاکستان میں القاعدہ کے حملوں کے حوالے سے، القاعدہ کا شمالی وزیرستان سے متعلق پراپیگنڈہ اس کی اہمیت کا اظہار ہے۔ 2004ء سے 2009ء تک القاعدہ کی جاری کی گئی افغانستان کے حملوں سے متعلق 89 ویڈیوز میں سے 47 لویا پکتیا کے واقعات کی ہیں جو شمالی وزیرستان سے سرحد پار حقانیوں کا مرکزی علاقہ ہے۔ عین ممکن ہے کہ یہ قتل و غارت القاعدہ کے جنگ جوؤں نے نہ کی ہو لیکن جغرافیائی ارتکاز کی یہ نمائش حقانی گروپ کے القاعدہ کے ساتھ تعلقات اور علاقے میں کاروائی کرنے کی اہلیت ضرور ظاہر کرتی ہے۔

اسلامی جہاد یونین:

اسلامی جہاد یونین کا اہم ترین مرکز، شمالی وزیرستان میں، میر علی میں واقع ہے، جہاں اسے مختلف مقامی جنگ جو قبائل کی مدد حاصل ہے۔ اس یونین کا مقصد ازبکستان میں اسلام کریموف کی سیکولر حکومت کا تختہ الٹنا ہے۔ پچھلے پانچ سالوں میں اس نے (Sauerlond) سیل کے لیے کئی حملے منظّم کیے اور مختلف تربیتیں دیں۔ اسی سیل نے جرمنی میں (جنوری 2007ء میں) امریکی فوجی اڈوں پر حملے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس کا لیڈر نجم الدین جانوف ہے برانوف (اس کا نائب امیر) اور محمد فاتح اس کے ساتھی ہیں۔

اسلامی جہاد یونین پاکستان میں 2002ء میں اسلامی تحریک ازبکستان کے مزاحمتی گروپ کے طور پر بنایا گیا تھا۔ اس گروپ میں زیادہ تر ازبک لڑاکے ہیں تاہم اس میں تاجک، کرغیز اور

قازق جنگ جو بھی شامل ہیں۔ فاٹا میں موجود چیچن گروپ سے بھی ان کے قریبی تعلقات ہیں۔ یونین نے ترکی زبان میں بے تحاشا پراپیگنڈا مواد بنایا ہے۔

اختتامیہ:

شمالی وزیرستان فاٹا میں جہادی جنگ جوئی کا آج اہم ترین مرکز ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ یہاں ان کی کارروائیوں پر کوئی خاص قدغن نہیں لگ سکی۔ پاکستانی حکومت نے دوسرے علاقوں میں (پاکستان مخالف) عسکریت پسندوں کا مقابلہ کیا ہے لیکن یہاں کی سرگرمیاں عموماً نظرانداز کی گئی ہیں۔ حقانی نیٹ ورک اور گل بہادر کا گروہ پاکستانی حکومت کو اپ سیٹ نہیں کرتے اور اس سلسلے میں وہ سیاسی طور پر بہت حساس اور محتاط ہیں۔ تاہم کبھی کبھار ان کا پاکستانی حکومت سے ٹکراؤ بھی ہو جاتا ہے۔ جنوبی وزیرستان میں حقانی نیٹ ورک اور گل بہادر نے پاکستانی طالبان کے ساتھ مل کر خاصی کارروائیاں کی ہیں۔ 2009ء کے آخر اور 2010ء کے شروع میں، جنوبی وزیرستان سے ملٹری آپریشن کے دوران بھاگ آنے والے محسود لڑاکوں کو پناہ دی۔ مقامی گروپ کے جنوبی وزیرستان میں موجود القاعدہ ارکان سے بڑی گہری قرابت ہے اور وہ القاعدہ کے بنیادی مقصد خلافت کے قیام کی حمایت کرتا ہے۔ تاہم نیٹ ورک کے لیڈروں کی تمام تر توجہ افغانستان پر ہے۔ بسا اوقات کسی اور جگہ وہ القاعدہ کی مدد خاموشی سے کر ڈالتے ہیں۔ تاہم ان کی موجودہ قیادت اپنی کارروائیوں کا دائرہ وسیع نہیں کرنا چاہتی۔

شمالی وزیرستان میں جنگ جوؤں پر ڈرون حملے مجبوری کے تحت کیے جاتے رہے۔ مقامی رائے عامہ پر اس کا اثر ہمیشہ منفی رہا۔ موجودہ ڈرون حملوں نے شمالی وزیرستان میں جنگ جوؤں کو خاصا خوف زدہ کر رکھا ہے اور شاید پاکستانی حکومت کو زیادہ جارحانہ حملوں کے لیے تیار کرنا بھی اس کا مقصد ہو۔ یاد رہے کہ اکتوبر 2009ء میں جنوبی وزیرستان میں پاکستانی فوج کے آپریشن کی ابتدا کے ساتھ ہی امریکی ڈرون حملے روک دیئے گئے تھے لیکن شمال میں ان حملوں میں اضافہ کر دیا گیا تھا۔ فوجی روابط سے متعلق یہ اشارے بتاتے ہیں کہ شمالی وزیرستان میں ہونے والے ڈرون حملے دراصل پاکستانی فوج کے آیندہ آپریشن کے لیے راہ ہموار کر رہے ہیں۔

جنگ جوؤں کے خلاف جتنی بھی جارحانہ اپروچ اپنا لی جائے لیکن حقانی گروپ کو ختم کرنے کے لیے فیصلہ کن اقدامات کرنا پاکستان کے لیے بہت دشوار ہوگا۔ حقانی نیٹ ورک پاکستان کی بنیادی سوچ (انڈیا پر انتہائی فوکس) سے بخوبی واقف ہے۔ وہ اس دشمن کے خلاف اپنی افادیت ظاہر کرتے ہوئے پاکستانی کریک ڈاؤن کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔

کوئٹہ شوریٰ کے نائب کمانڈر ملا برادر اور دوسرے افغان لیڈروں کی 2010ء کی ابتدا میں گرفتاریاں (جنگ جونیٹ ورکس کے خلاف) پاکستانی پالیسی میں تبدیلی ظاہر کرتی ہیں لیکن کس حد تک یہ معلوم نہیں کہ آیا ملا عمر اور کوئٹہ شوریٰ کے خلاف کریک ڈاؤن میں حقانیوں کو بھی شامل کیا جائے گا یا نہیں۔ بہرحال شمالی وزیرستان کے جنگ جو عسکری طاقت کے ساتھ ساتھ سیاسی داؤ پیچ کی وجہ سے کسی پہیلی سے کم نہیں۔ وہ عملیت پسند تو ہیں ہی لیکن ساتھ ہی القاعدہ سے نظریاتی طور پر متاثر بھی ہیں۔ وہ افغانستان سے مذاکرات کرنے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ اس سے کوئی معاہدہ بھی کریں گے۔ ان کی فوجی طاقت، پاکستان کے لیے بنیادی اہمیت اور سیاسی معاملہ فہمی کو اکٹھا کر کے دیکھا جائے تو شمالی وزیرستان کے عسکریت پسند گروپوں کو ختم کرنا، پاکستان کے لیے انتہائی مشکل کام ہوگا۔

آنند گوپال کابل میں مقیم صحافی ہیں وہ وال اسٹریٹ جرنل اور کرسچیئن سائنس مونیٹر کے نمائندے ہیں۔ وہ 11 ستمبر 2001ء کے بعد کے افغانستان کی تاریخ لکھ رہے ہیں۔ برائن فش مین نیو امریکن فاؤنڈیشن میں ریسرچ فیلو ہیں۔

MashalBooks.org

باجوڑ میں عسکریت پسندی اور تصادم

رحمان اللہ اپریل 2010ء

باجوڑ فاٹا کے ساتھ انتظامی اکائیوں میں سے سب سے چھوٹا ہے اور پر پیچ پہاڑی راستوں کی وجہ سے بے پناہ دشوار گزار بھی۔ اس کی سرحد افغان صوبے کنڑ سے اور دوسری جانب پاکستان میں ضلع دیر سے ملتی ہے (دیر وادی سوات کا گیٹ وے کہلاتا ہے) اس لیے باجوڑ پاکستان کے لیے ہی نہیں، پورے علاقے کے لیے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی موجودہ آبادی دس لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ اور خار (KHAR) اس کا انتظامی مرکز ہے۔

طالبان اور القاعدہ کا اہم مرکز ہونے کی وجہ سے، افغان صوبے کنڑ نے باجوڑ کے قدامت پرست اور روایتی قبائل پر خاصا اثر ڈالا ہے۔ 2001ء میں افغانستان میں طالبان حکومت کے خاتمے کے بعد، جنگ جو گروپس سرحد پار کر کے باجوڑ آ گئے۔ انہوں نے پختونوں کی مہمان نوازی اور پناہ گاہی روایات کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ باجوڑ کے قبائل نے ان کی شاندار مہمان نوازی کی۔ باجوڑ آج بھی طالبان کے لیے ڈیورنڈ لائن کے دونوں جانب آنے جانے کے لئے ٹرانسپورٹ کا اہم مرکز ہے۔ دہشت گردی کے عملی منصوبوں میں باجوڑ کی اہمیت اس سے واضح ہوتی ہے کہ لندن اور بارسلونا میں کیے جانے والے حملوں کا منصوبہ باجوڑ سے تعلق رکھنے والے القاعدہ کارکنوں نے بنایا تھا۔ مزید برآں القاعدہ کے ایک اہم لیڈر ابوخراج اللبی نے، جو جنرل مشرف پر قاتلانہ حملے کی واردات میں ملوث تھا، اپنی گرفتاری کے بعد بتایا کہ وہ کافی عرصہ باجوڑ میں رہا ہے۔

باجوڑ میں شدت پسندی کا ڈھانچہ:

اگرچہ صوفی محمد (تحریک نفاذ شریعت محمدی کا بانی) شرعی یا اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے پڑوسی ضلع مالاکنڈ میں 1981ء سے کوششیں کر رہا تھا تاہم باجوڑ میں 2001ء میں طالبان

کے زوال سے پہلے، ایسی کوئی تحریک نہیں تھی۔افغانستان پر امریکی حملے کے خلاف پختونوں کے غم وغصے کو استعمال کرنے کے لیے، صوفی محمد نے باجوڑ کی تحصیل مومند میں طالبان کی مدد کے لیے بھرتی مرکز قائم کر دیا۔ باجوڑ میں طالبان کمانڈر فقیر محمد (جو شریعت محمدی تحریک کا نائب امیر بھی تھا) نے اس سلسلے میں اس کی بھرپور مدد کی۔ 2001ء کے آخر میں تقریباً دس ہزار مقامی لڑا کے صوفی محمد کی قیادت میں اتحادی افواج سے جنگ کرنے سرحد پار گئے۔ان میں سے باجوڑ کے سینکڑوں جنگ جو مارے گئے یا گرفتار کر لیے گئے۔بعض خبروں کے مطابق، ان میں سے بہت سے ابھی تک واپس نہیں آئے۔شاید وہ ابھی تک افغان جیلوں میں ہیں۔صوفی محمد کے ساتھ افغانستان جانے والے ایک صحافی کا کہنا ہے کہ قیدیوں میں سے آدھے واپس آ گئے ہیں۔اور آدھے افغانستان میں مارے گئے یا ابھی وہیں قید تھیں۔نور اللہ نامی صحافی نے کہا کہ صوفی محمد کے آدمی مشرقی افغانستان میں واقع صوبہ کنڑ میں، خار سے 30 کلومیٹر دور (شمالی مشرقی) درہ گاہی کے راستے سے داخل ہوئے۔خار باجوڑ کا اہم ترین قصبہ ہے۔

جونہی سابق صدر جنرل مشرف نے طالبان مخالف امریکی فوجی کارروائیوں کی حمایت شروع کی، قبائلی علاقے میں پاکستانی فوج کا تصور بگڑنا شروع ہو گیا۔ایک یہ بات اور دوسری حملہ آور امریکیوں سے انتقام لینے کی خواہش نے باجوڑ کو طالبان کا ہمنوا بنانے میں اہم رول ادا کیا۔ 2002ء کی ابتداء میں صوفی محمد کی پاکستان واپسی کے بعد، اسے اور اس کے داماد فضل اللہ کو امریکیوں کے خلاف لشکر بنانے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔اس صورتِ حال نے باجوڑ اور سوات کے لوگوں کو مزید مشتعل کر دیا۔اسی غصے کی بدولت باجوڑ کے جنگ جو فقیر محمد کی قیادت میں اکٹھے ہو گئے۔اس کے حامی سر بازار لاوڈ سپیکرز کے ذریعے چندہ دینے اور رضا کار بھرتی کرنے کی اپیلیں کرنے لگے۔ 2002ء میں آہستہ آہستہ فقیر محمد نے چار سے پانچ ہزار لڑاکوں کی فوج جمع کر لی (باجوڑ کی مومند اور نواگئی تحصیلوں میں) مقامی طالبان نے افغانستان سے بھاگ کر آنے والے غیر ملکی اور افغان جنگ جوؤں کو پناہ دی اور بسا اوقات ان بیرونی لوگوں کو شادی بیاہ کے ذریعے اپنے خاندانوں میں شامل کر لیا۔

افغانستان میں جنگ کی طوالت کے ساتھ ساتھ باجوڑ کے لوگوں کی ہلاکتوں میں اضافے کی وجہ سے، صوفی محمد کی حمایت میں کمی آتی چلی گئی۔ وہ اپنے پیچھے افغانستان میں ہزار ہا لڑا کے چھوڑ آیا تھا جن میں سے اکثریت واپس نہ آ سکی۔لیکن یہ ناامیدی اتنی بھی نہیں تھی کہ باجوڑ کے لوگوں میں (شمالی اتحاد) امریکی اور نیٹو افواج کے لیے نفرت میں کچھ کمی آ جاتی چنانچہ افغان میدان جنگ سے بھاگ کر آ کر پناہ لینے والے طالبان کو باجوڑ میں خود کو دوبارہ اکٹھا کرنے میں کوئی

پریشانی نہیں ہوئی۔(2000ء کی ابتدائی دہائی میں) باجوڑ کے ایک گاؤں صوابی میں، 1970ء میں پیدا ہونے والا فقیر محمد مقامی طور پر مقبول اور طاقت ور میمند قبیلے سے تعلق رکھتا ہے اس نے 1980ء کے عشرے میں سوویت قبضے کے خلاف جہاد میں حصہ لیا اور بعدازاں اگلے عشرے میں طالبان کے ساتھ افغانستان میں کاروائیوں میں شریک رہا۔ مذہبی ماحول کے پروردہ فقیر محمد نے ایک مقامی مدرسے میں تعلیم حاصل کی جہاں ایک مشہور عالم مولانا عبدالسلام اس کے استاد تھے۔ وہ دیوبندی عقیدے سے تعلق رکھتے تھے مگر انھیں سیاست یا عسکریت پسندی سے کوئی علاقہ نہیں تھا۔(سہیل عبدالناصر نامی تجزیہ نگار کے مطابق) فقیر محمد نے مولانا عبدالسلام سے درس نظامی حاصل کیا جو بی اے کے برابر ہوتا ہے۔ درالعلوم پنج پیر میں اس نے قرآن فہمی پیدا کی۔صوابی کا یہ مدرسہ وہابی مکتبہ فکر کا حامل ہے۔سعودی عرب میں بھی اس عقیدے پر ہی عمل کیا جاتا ہے۔

فقیر محمد طویل قامت اور اچھے قد کاٹھ کا مالک ہے۔اس کی طالبان سٹائل سیاہ داڑھی ہے۔اس کی ایک بیوی ہے مگر خاندان خاصا بڑا ہے اور ان میں سے ہر کوئی اس کی جنگ جویانہ سرگرمیوں میں شامل ہے۔ 1993-94ء میں تحریک نفاذ شریعت میں شمولیت سے پہلے فقیر محمد قبائلی علاقے میں مقبول جماعت اسلامی کا مقامی لیڈر تھا۔تحریک نفاذ شریعت میں شمولیت کے بعد فقیر محمد نے امریکیوں سے جہاد کے لیے افغان جنگ جوؤں کے ساتھ پاکستانی لڑاکوں کو شامل کرنے کی تباہ کن کوشش میں صوفی محمد کا ساتھ دیا۔ ناصر کی رپورٹ کے مطابق اس نے اپنے دو بیٹوں اور دو چچازاد بھائیوں مولوی محمد کریم اور مولوی جان محمد کے ساتھ افغانستان میں ہی تحریک میں شمولیت اختیار کی تھی۔اس وقت فقیر محمد کے پاس چھ ہزار لڑاکا ہیں جن میں سے پانچ سو افغان اور سو دوسرے جنگ جو (عرب، چیچن) شامل ہیں۔ازبک جنگ جو باجوڑ کی نواگری تحصیل کے علاقے چارمنگ میں موجود ہیں۔ قاری ضیاء الرحمٰن ان کا کمانڈر ہے۔ کچھ حفاظتی ذرائع کے مطابق وہ دوسرے غیر ملکی جنگ جوؤں کو تربیت دیتا ہے۔مولوی فقیر محمد تحریک طالبان پاکستان کے بانیوں میں سے ہے دسمبر 2007ء میں یہ تحریک پاکستان کے مختلف جنگ جو گروہوں کو اکٹھا کرنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ بیت اللہ محسود اس کا پہلا امیر تھا۔

بیت اللہ کے نائب ہوتے ہوئے اس نے کوئٹہ شوریٰ طالبان کے ملا عمر سے وفاداری کا کئی بار اعلان کیا۔''ہم افغان اور پاکستانی طالبان کی تحریکوں کو ایک ہی سکے کے دو رخ سمجھتے ہیں۔'' ایک مقامی زمیندار محسود خان کے مطابق مولوی فقیر محمد نے 2008ء میں صوابی کے ایک بڑے اجتماع میں کہا۔''ہم ملا عمر اور اسامہ بن لادن کو اپنے سپریم کمانڈر سمجھتے ہیں حالانکہ اسامہ نے ہمارے ساتھ ایک رات بھی نہیں گزاری۔ تاہم اگر وہ یہاں آئے تو ہم ان کا خیر مقدم

MashaBooks.org

کریں گے۔'' ایک اور مقامی عمران خان نے فقیر محمد کو اس کے ایف ایم ریڈیو پروگرام میں ملا عمر اور بن لادن کی حمایت کا اعلان کرتے سنا۔'' ہم اور ملا عمر ایک ہیں۔ ہماری تحریکوں میں کوئی اختلاف نہیں۔

باجوڑ کے عسکریت پسند گروہوں سے کوئٹہ شوریٰ طالبان کے کوئی معلوم آپریشنل لنکس نہیں ہیں تاہم باجوڑ میں موجود طالبان پاکستانی ریاست کے خلاف کاروائی کرتے رہتے ہیں جبکہ افغان طالبان...... ملا عمر اور کوئٹہ شوریٰ کے تحت اپنی تمام تر جنگی کاروائیاں امریکی اور نیٹو افواج پر مرتکز رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ افغانستان کے طالبان پاکستانی طالبان جنگ جوؤں کے ہاتھوں ''طالبان'' کی اصطلاح کے استعمال کو بھی پسند نہیں کرتے کیونکہ ان کے خیال میں اس سے ان کی عوامی حمایت متاثر ہوسکتی ہے۔ 2009ء کے موسم سرما میں افغانستان میں بنائے گئے طالبان نے ''ضابطہ اخلاق'' کا باجوڑ میں طالبان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

فقیر محمد نے القاعدہ کے لیے اپنی حمایت کا اعلان کیا ہوا ہے اور افغانستان میں پاکستان طالبان کے ہاتھوں امریکی اور نیٹو افواج کو نشانہ بنانے کی سرگرمیوں کی بھی حمایت کی ہے۔ گیارہ ستمبر کو امریکہ میں ہونے والے دہشت ناک واقعات کے بارے میں اس کا خیال ہے کہ نائن الیون کے بعد حالات میں تبدیلی بہتری کے لیے آئی ہے۔ اس سے جدوجہد میں استقلال آیا ہے۔ مسلمانوں کی آنکھیں کھل گئی ہیں۔ امت کو اپنے دشمنوں کا پتہ چل گیا ہے۔ اگر حملہ پہلے ہوگیا ہوتا تو اب تک کئی مسلمان ملک غیر ملکی قبضے سے آزاد ہو چکے ہوتے۔'' پاکستانی حکومت نے اس کی گرفتاری پر 15 ملین روپے کا انعام رکھا ہے۔

وادیِ سوات میں صوفی محمد اور اس کے داماد فضل اللہ کی طرح، مولوی فقیر محمد کو بھی ریڈیو کی اہمیت کا بخوبی علم ہے۔ اس کے وعظ اور تقاریر اس کے غیر قانونی ایف ایم چینل پر پورے باجوڑ میں سنے جاسکتے ہیں۔ اس کا براڈ کاسٹنگ یونٹ با آسانی اسمبل کیا جاسکتا ہے اور کسی بھی جگہ لے جایا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستانی حکومت اس کی نشریات ابھی تک نہیں روک پائی۔ وہ میڈیا کے لوگوں سے بھی ملتا رہتا ہے۔ انٹرویو دیتا رہتا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اگست 2009ء میں بیت اللہ محسود کی موت کی افواہیں اڑانے کے بعد سے وہی تحریک طالبان پاکستان کا قائم مقام امیر ہے۔

افغانوں اور دوسرے غیر ملکی جنگ جوؤں کے علاوہ جیش محمد اور پاکستانی تحریک نفاذ شریعت جیسے کالعدم گروہوں کے پیروکار بھی مولوی فقیر محمد کے ساتھ ہیں۔ طالبان کمانڈر اور یہ گروپس مشترکہ عدالتیں چلاتے ہیں۔ جاسوسی کے الزام میں پکڑے جانے والوں کو ایک جیسی سزائیں دیتے ہیں۔ مشترکہ جرگے اور اجلاس بلاتے ہیں تاکہ باجوڑ میں عسکریت سے متعلقہ اہم

MashalBooks.org

امور زیر بحث لاسکیں۔ ان کے نام مختلف ضرور ہیں مگر ان میں کوئی ظاہری اختلاف نہیں۔ مولوی فقیر محمد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے القاعدہ کے نمبر دو لیڈر ایمن الظواہری سے قریبی رابطہ ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ دمہ دولا میں جنوری 2006ء میں اس نے دہشت گرد لیڈر کی ضیافت کی تھی جس کو ڈرون حملے کے ذریعے نشانہ بھی بنایا گیا تھا۔ مارچ 2010ء کے شروع میں مولوی فقیر محمد کی پاکستان کے (مہمند ایجنسی کے علاقے میں) ایک ہوائی حملے کے ذریعے، ہلاکت کی خبر بھی پھیلی تھی لیکن بعد میں رائٹر کے ایک رپورٹر کو ٹیلی فون کال کی گئی جس میں مولوی فقیر محمد نے خود کو شناخت کرایا۔ رپورٹر نے مولوی فقیر کی آواز پہچاننے کی تصدیق کی۔ بعدازاں فقیر محمد نے بی بی سی کے پشاور آفس میں فون کیا اور انھیں اطلاع دی کہ وہ اس کے لڑاکے محفوظ اور بخیر وعافیت ہیں۔

یہ افواہیں بھی سننے میں آئیں کہ فقیر محمد کو باجوڑ کی امارت سے ہٹا دیا گیا ہے اور اس کی جگہ تحریک طالبان پاکستان کے ایجنسی میں نائب امیر جمال الدین داد اللہ کو دے گی گئی کیونکہ مولوی فقیر نے 2010ء کے آپریشن کے دوران اپنے حامیوں کو پاکستان کے خلاف لڑنے سے منع کر دیا تھا۔ اس نے اہم طالبان لیڈروں کو سخت پریشان کر دیا کیونکہ وہ مسلسل پاکستانی ریاست کو نشانہ بناتے رہتے ہیں۔ جمال الدین داد اللہ مرخانو زنگل وارا، مہمند تحصیل (خار کے شمال مغرب میں) سے تعلق رکھتا ہے۔ اس نے پنج پیر مدرسے سے کچھ تعلیم بھی حاصل کی ہے۔ اس سے زیادہ اس کے بارے میں کچھ اور معلوم نہیں۔ مولوی فقیر اپنی برطرفی سے انکار کرتا ہے لیکن باجوڑ میں طالبان کے ساتھ اپنے اختلافات کو تسلیم کرتا ہے۔

باجوڑ میں دوسرے جنگ جو گروہ:

تحریک طالبان پاکستان اور تحریک نفاذ محمدی باجوڑ کے بڑے جنگ جو گروپ ہیں لیکن کچھ اور جہادی گروہ بھی برسرکار ہیں۔ قاری علی رحمان جیش اسلامی کا سربراہ ہے جو لوئی میمند تحصیل کے یوسف خیل قبیلے سے ہے۔ وہ لوئی میمند تحصیل میں خاصا سرگرم ہے۔ 2008ء میں جیش اسلامی کا سربراہ بننے سے پہلے، وہ مولوی فقیر کا انتہائی اہم سیکورٹی گارڈ تھا۔ مولوی فقیر نے جب باجوڑ میں فوجی آپریشن کے دوران پاکستانی فوج کے حملوں کا جواب نہیں دیا تو جیش اسلامی خاصی جز بز ہوئی اور اس نے مولوی فقیر پر گورنمنٹ سے جا ملنے کا الزام لگایا۔ ان دونوں گروپوں میں خاصی مخاصمت پائی جاتی ہے۔

حرکت جہاد اسلامی شدت پسندوں کا ایک پنجابی گروپ ہے۔ کبھی قاری سیف اللہ اختر اس کا سربراہ ہوا کرتا تھا۔ یہ بھی باجوڑ میں خاصی متحرک ہے۔ پاکستانی خفیہ اداروں کا دعویٰ ہے کہ

اختر اور حرکت جہاد اسلامی ستمبر 2008ء کے میریٹ ہوٹل اسلام آباد پر کیے گئے خودکش حملے کے ساتھ ملک میں کیے جانے والے کئی اور خودکش حملوں میں ملوث ہیں۔ سابق وزیر اعظم بے نظیر بھٹو (کے قافلے پر) پر 18 اکتوبر 2007ء کو کراچی میں کیا جانے والا حملہ بھی انہی لوگوں نے کیا تھا۔

اسلامی تحریک ازبکستان اور اسلامی جہاد یونین نامی دو ازبک گروہ بھی کسی حد تک باجوڑ اور سرحد پار صوبہ کُنڑ میں موجود ہیں لیکن ان کے اراکین کی تعداد سو کے لگ بھگ ہو گی۔ مزید براں باجوڑ میں کئی عرب جنگ جو بھی ہیں جو 2001ء میں طالبان حکومت کے خاتمے کے بعد سرحد پار کر کے آئے تھے۔ باجوڑ کے ان غیر ملکی گروہوں کو اکٹھا رکھنے میں مولوی فقیر محمد کو کمال حاصل ہے اور ملا عمر اور بن لادن کے لیے اس کی حمایت اس بات کی دلیل ہے کہ باجوڑ میں موجود ان عربوں میں سے کچھ القاعدہ کے اہم لوگ ہوں۔

مولوی فقیر محمد کے علاوہ تھوڑے بہت طالبان کمانڈر بھی ہیں: پرویز خار کے مغرب میں نواگئی تحصیل پر قابض ہے۔ ایک افغانی ضیاالرحمٰن کُنڑ کی سرحد کے ساتھ ساتھ چارمنگ کے علاقے کا انتظام سنبھالے ہوئے ہے۔ مولانا اسمٰعیل چناگئی اور دمہ دولا میں طالبان کی نگرانی کرتا ہے۔ مولوی عبداللہ سالارزئی تحصیل میں بندا کے علاقے میں تحریک کا ناظم ہے۔ ولی الرحمان لوئی میمند تحصیل میں عراب کے علاقے کا سربراہ ہے۔ ان کمانڈروں کا آپس میں زبردست مواصلاتی نظام قائم ہے اور ضرورت پڑنے پر وہ فقیر محمد سے رہنمائی لیتے ہیں۔ تاہم فوجی آپریشن کے دوران، سیکورٹی وجوہات کی بنا پر جب رابطے مشکل ہو جائیں تو ان میں سے ہر جنگ جو کمانڈر کو اپنے علاقے میں کاروائی کا اختیار بھی حاصل ہے۔ افغان سرحدی صوبہ کُنڑ باغی کمانڈر گلبدین حکمت یار کا مضبوط گڑھ ہے۔ طالبان کی حکومت کے خاتمے کے بعد یہاں حکمت یار کے ساتھیوں کا سیلاب آ گیا تھا تاہم باجوڑ میں 2008 کے فوجی آپریشن کے بعد اکثر لوگ ایجنسی سے چلے گئے۔ مہاجرین کا ایک چھوٹا سا گروپ اب بھی یہاں مقیم ہے اور وہ مذہبی سیاسی پارٹی جماعت اسلامی کے حامی ہیں جس کے گلبدین حکمت یار کی جہادی پارٹی حزبِ اسلامی سے گہرے تعلقات ہیں۔ تاہم حزب اسلامی کا جنگ جو گروپوں سے کوئی خاص واسطہ نہیں کیونکہ پاکستانی حکومت اور پاکستان مخالف طالبان دونوں سے ان کے مراسم ہیں۔

تربیتی کیمپ:

باجوڑ میں طالبان پہاڑیوں کے درمیان واقع جنگلات میں اور مذہبی مدارس میں، جن پر پاکستانی حکومت نے پابندی لگا رکھی ہے، متحرک تربیتی کیمپ چلاتے ہیں۔ بعض کیمپ خار کے جنوب

MashalBooks.org

میں 70 کلومیٹر دور مہمنہ کے ساتھ واقع عنبہ، مدبند اور افغان سرحد کے ساتھ چارمنگ میں موجود ہیں۔ مزید براں عسکریت پسندوں نے خار سے 12 کلومیٹر دور لوئی سام میں کچھ انفرادی گھروں پر بھی قبضہ کیا ہوا ہے اور ان میں تربیتی کیمپ چلاتے ہیں۔ ایک مقامی افسر کے مطابق بعض اور تربیتی مقامات میں مالاسعید، باندہ (سالارزئی)، مومند کا ایریا اور دادا ڈولا کے علاقے شامل ہیں۔ پاکستانی فوج کا کہنا ہے کہ اس نے داماڈولا کا علاقہ خالی کرالیا ہے اور اب آگے بڑھ رہی ہے۔ حفاظتی نقطۂ نظر سے تیزی سے منتقل کیے جانے والے ان کیمپوں میں نئے بھرتی شدہ عسکریت پسندوں کو راکٹ لانچرز فائر کرنے، بم بنانے اور انھیں فیوز کرنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ زیادہ تر بم اور خودکش جیکٹیں گھروں میں ہی تیار ہوتے ہیں۔ یہیں ان کے مختلف پرزوں، بال بیرنگ، نٹ بولٹس اور کیلوں کو اکٹھا کرکے بم کی شکل دی جاتی ہے۔

باجوڑ میں موجود طالبان کے پاس وہ ہتھیار بھی ہیں جو ان کے پرانے ساتھی سوویت مخالف جہاد میں استعمال کرتے رہے ہیں۔ نئے رضاکاروں کو عموماً فائرنگ وغیرہ کی تربیت دینے کی زیادہ ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ کلاشنکوف جیسی خطرناک رائفلیں چلانے کے وہ بچپن ہی سے عادی ہوتے ہیں۔

مالی معاونت:

بہت سے پاکستانی حکام کو یقین ہے کہ پاکستان میں طالبان کو غیرملکی مدد ملتی ہے۔ اویس غنی، گورنر سرحد نے بارہا یہ دعویٰ کیا ہے کہ افغان نارکوٹکس مافیا پاکستانی طالبان کو بھرپور مدد دیتی ہے۔ فروری 2010ء میں ان کا اندازہ تھا کہ تحریک طالبان پاکستان اپنے پندرہ ہزار لڑاکوں پر 3.6 ملین روپے خرچ کرتی ہے اور اس آمدنی کا بڑا حصہ افیم کی تجارت سے آتا ہے۔

اگرچہ باجوڑ افغان افیم تجارت/ٹریفک میں براہ راست ملوث نہیں تاہم سرحدی علاقہ ہونے کی وجہ سے اس کے اثرات محسوس ہوتے ہیں عسکریت پسند باجوڑ میں، ٹمبر کی سمگلنگ میں بھی ملوث ہیں۔ مقامی مساجد میں چندہ جمع ہوتا ہے۔ مقامی باشندوں سے بھتہ وصول کرنا اور اغوا برائے تاوان بھی فنڈنگ کا ذریعہ ہے۔

خودکش حملوں کا حربہ:

فاٹا میں کسی بھی جگہ خودکش حملوں کا ماسٹر مائنڈ، جنوبی وزیرستان کا باشندہ قاری حسین ہے۔ تحریک طالبان کا یہ کمانڈر مرحوم بیت اللہ محسود کا دایاں بازو سمجھا جاتا تھا۔ خودکش حملہ آوروں کی تربیت اور ان کا استعمال باجوڑ میں بھی ہوتا ہے۔ قاری حسین یہ خودکش بمبار فاٹا میں کہیں بھی بھیج

سکتا ہے۔مولانا فضل اللہ نے بھی خودکش بمباروں کے سوات میں پاکستانی فوج اور حکومت کے ٹھکانوں پر حملہ آور ہونے کی حوصلہ افزائی کی ہے اور اب یہ باجوڑ تک پھیل گئے ہیں۔سوات کے طالبان لیڈر نے جولائی 2007ء میں کہا تھا۔"خودکش بمباروں کے ذریعے مسلم نوجوان دنیا کو بتا رہے ہیں کہ وہ اپنی ہڈیوں اور گوشت کو، کافروں پر حملہ آور ہونے کے لیے گولیوں کی طرح استعمال کر سکتے ہیں۔"

مقامی لوگوں نے مولوی فقیر کو باجوڑ کے مختلف علاقوں میں مجمعے میں کہتے سنا ہے کہ تحریک طالبان پاکستان کے پاس بہت سارے خودکش بمبار ہیں۔اس نے دعویٰ کیا کہ یہ جنگ جو فدائین بننے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔لوگوں نے اسے یہ کہتے بھی سنا ہے کہ عورتیں بھی خودکش بمبار بننا چاہتی ہیں۔باجوڑ کے مختلف شہروں میں 9-2008ء کے درمیان تقریریں کرتے ہوئے مولوی فقیر محمد نے کہا۔اس کے پاس بہت سارے رضا کار اور خودکش بمبار ہیں۔اس نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ طالبان تو ان کو کارروائی سے پہلے بہت کچھ دیتے ہیں مگر اصل جزا جنت ہے۔31 جنوری 2000ء کو ایک خودکش حملہ آور نے خار میں ایک پولیس چیک پوسٹ پر حملہ کیا جس میں کم از کم سترہ لوگ مارے گئے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلسل فوجی آپریشنوں کے باوجود، تحریک شہر کے عین مرکز میں حملہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

باجوڑ میں فوجی آپریشنز:

جنوری 2006ء کے وسط میں شمالی باجوڑ میں ایک مشتبہ ڈرون حملے میں ایک گھر تباہ ہوگیا جس میں 12 افراد مارے گئے۔یہ حملہ القاعدہ کے نائب امیر امین الظواہری کو نشانہ بنانے کے لیے کیا گیا تھا جو وہاں رات کو ایک عیدملن پارٹی میں شریک تھا۔الظواہری تو اس حملے سے بچ نکلا تاہم اس کا داماد، جو القاعدہ کے میڈیا کا اہم آدمی تھا اور ابوعبیدہ المصری (افغانستان کے لیے القاعدہ کا آپریشنل سربراہ) اس حملے میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

مہمند کے گاؤں چناگائی سے کچھ دور واقع ایک مدرسہ پر اکتوبر 2006ء کے آخر میں ایک حملہ کیا گیا۔حملے کے بارے میں کہا گیا کہ یہ ہیلی کاپٹروں کی مدد سے پاکستانی فوج نے کیا تھا تاہم کئی مقامی لوگوں کے مطابق یہ بھی ڈرون حملہ تھا جو الظواہری کے لیے کیا گیا تھا۔اس میں 80 سے زیادہ جنگ جو ہلاک ہوئے تھے تاہم دیہاتیوں کا دعویٰ ہے کہ مرنے والے مدرسے کے طلبہ تھے اور تحریک نفاذ شریعت کے مذہبی مدرسے کے سربراہ مولانا لیاقت بھی ان کے ساتھ تھے۔اکتوبر کے حملے سے صرف دو دن پہلے خار سے 5 کلومیٹر دور صادق آباد میں تین ہزار جنگ جوؤں

نے ایک ریلی نکالی تھی جس میں وہ ملا عمر اور اسامہ بن لادن کی حمایت میں نعرے لگا رہے تھے۔

مولوی فقیر محمد نے ان ہلاکتوں پر شدید غم وغصے کا اظہار کیا۔ اس نے تباہ شدہ عمارت کے احاطے میں اپنے مسلح ساتھیوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ ''اللہ شیخ اسامہ کی حفاظت کرے۔ اللہ ملا عمر کی حفاظت کرے!'' اور پھر ڈرامائی انداز میں کہا کہ کاش وہ خود بھی شہید ہو گیا ہوتا!

2006ء میں دو فضائی حملوں نے پاکستانی حکومت اور امریکی فوجوں کے خلاف اہل باجوڑ کے جذبات بری طرح مشتعل کر دیئے اور مولوی فقیر محمد کی پر جوش تقاریر نے باجوڑ میں طالبان کی حمایت میں زبردست اضافہ کر دیا۔ دوسرے حملے کے صرف ایک ہفتے بعد، طالبان نے درگئی میں پاکستانی فوج کے ٹھکانے پر حملہ کیا۔ پاکستان کی فوج کے خلاف یہ خطرناک ترین حملہ تھا جس میں کم از کم چالیس فوجی مارے گئے اور 22 زخمی ہوئے۔ فوجی ترجمان میجر جنرل شوکت سلطان نے کہا۔ ''ہمیں پورا شک ہے کہ فوجی مرکز پر حملہ آوروں کا تعلق باجوڑ کے طالبان سے تھا اور انہوں نے باجوڑ القاعدہ کے مولوی لیاقت اور مولوی عمر کی زیر نگرانی چلنے والے مدرسے میں تربیت لی تھی۔

مولوی فقیر محمد نے طالبان کے لیے وسیع پیمانے پر بھرتیاں کیں اور 2006ء کے موسم گرما اور سرما کے دوران، کہا جاتا ہے کہ طالبان نے باجوڑ میں 150 فوجی چوکیوں پر قبضہ کر لیا تھا۔

باجوڑ غالباً دو دفعہ اور مشتبہ ڈرون حملوں کا شکار ہوا ہے۔ پہلا مئی 2008ء میں داماڈولا میں، جہاں القاعدہ کا منصوبہ ساز ابوسلیمان الجزیری اپنے درجن بھر ساتھیوں کے ساتھ مارا گیا۔ الجزیری (الجیریا کا باشندہ) مغرب پر حملوں کی منصوبہ بندی کیا کرتا تھا۔ ایک اور معلوم حملہ اکتوبر 2009ء میں ہوا نشانہ مولوی فقیر کو بنایا گیا تھا مگر وہ چند لمحے پہلے تباہ ہونے والے گھر سے نکل چکا تھا۔ اس حملے میں مولوی فقیر کے بھتیجے اور داماد کے علاوہ تیس افراد مارے گئے تھے۔ اس حملے میں باجوڑ کی طالبان شوریٰ کو نشانہ بنایا گیا تھا۔

باجوڑ میں پاکستانی فوج کے حملے:

معمولی اسلحے سے لیس اور غیر تربیت یافتہ سپاہیوں پر مشتمل فرنٹیر کور جب، فقیر محمد کی قیادت میں مسلح طالبان کا صفایا کرنے میں ناکام ہو گئی تو 2008ء میں پاکستانی فوج کو باجوڑ میں طالبان کے خلاف کاروائی کا فرض سونپا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ علاقے کو طالبان سے خالی کرایا جائے جنہوں نے وہاں اپنی متوازی حکومت قائم کر لی تھی۔ وہ مقامی منڈی کی قیمتیں کنٹرول کرتے

MashalBooks.org

تھے۔ نائیوں کو داڑھی مونڈنے سے منع کرتے تھے اور پولیو کے خلاف ویکسین چلانے کی مہم کو روک رہے تھے آپریشن شیر دل اگست 2008ء کی ابتداء میں شروع ہوا۔ اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ افغانستان کے صوبہ کُنڑ میں، یہاں سے جنگ جوؤں کا داخلہ روکا جائے۔ مقامی افسروں کا دعویٰ ہے کہ بیس ہزار فوجی جوان (ان میں باجوڑ کے محافظ اہل کار بھی شامل تھے) ہیلی کاپٹر گن شپس، ٹینکوں اور آرٹلری کی طاقت کے ساتھ باجوڑ میں ڈھائی تین ہزار طالبان جنگ جوؤں سے نبرد آزما تھے۔ تاہم کئی ذرائع کے مطابق فوجی جوانوں کی تعداد آٹھ ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔

لڑائی کے کچھ مہینوں میں فوج کو کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ لگتا تھا وہ باجوڑ کے طالبان کی طاقت کو سمجھ نہیں پائی یا موقع پر انھیں صحیح خفیہ معلومات نہیں مل پا رہی تھیں۔ حفاظتی فوجوں کو بظاہر طالبان کے ہاتھوں بنی طویل سرنگوں کا بھی علم نہیں تھا۔ طالبان ان سرنگوں میں نہ صرف اپنے ہتھیار ذخیرہ کرتے تھے بلکہ پاکستانی جیٹس (Jets) کے حملے کی دوران وہاں پناہ بھی لیتے تھے۔ فاٹا سیکرٹریٹ کے ایک اعلیٰ افسر حبیب اللہ خان نے کہا: ''ان سرنگوں کو اساستہ کہا جاتا ہے اور ان میں بعض $1/2$ میل طوالت کی ہیں۔ فوجی مشن کے دوران جنگ جو وہاں کافی عرصے تک چھپے رہ سکتے ہیں۔''

20 ستمبر 2008ء کو باجوڑ کے حملے میں شدت اس وقت آئی جب ایک خودکش ٹرک بمبار اسلام آباد میں واقع ہوٹل میریٹ کی خارجی دیوار سے جا ٹکرایا اور اس میں 50 سے زاید شہری جان بحق ہو گئے اور کم از کم 250 لوگ زخمی ہوئے۔ پاکستانی دارالحکومت میں ہونے والا یہ خطرناک ترین حملہ تھا۔ پاکستانی حکام کا کہنا ہے کہ میریٹ ہوٹل کو نشانہ اس لیے بنایا گیا کہ قومی اسمبلی کی سپیکر فہمیدہ مرزا اس روز صدر اور وزیر اعظم کے اعزاز میں ڈنر دینے والی تھیں۔ انتظامیہ کا البتہ کہنا ہے کہ اس مقصد کے لیے ہوٹل میں کوئی پیشگی بکنگ نہیں کرائی گئی تھی ان کا کہنا ہے کہ ہوٹل کی جگہ استعمال کرنے کے لیے ریٹس ضرور پوچھے گئے تھے لیکن سرکاری طور پر اسے بک نہیں کرایا گیا تھا۔ اس کا شک حرکت جہاد اسلامی پر کیا گیا جس کی جڑیں باجوڑ میں ہیں اور ایک پنجابی طالبان لیڈر محمد قاضی ظفر (لشکر جھنگوی) اس میں منصوبے کا سرغنہ تھا۔ زرداری نے اس بزدلانہ حملے کے شدید مذمت کی اور ساتھ ہی پاکستان نے باجوڑ میں اپنی کارروائیاں تیز کر دیں۔ جنوبی ایشیاء میں مغربی صحافیوں کے ڈین کارلوٹا گال نے آپریشن شیر دل کے چھ ہفتوں کے بارے میں لکھا ہے کہ وزیرستان کے بعد باجوڑ غالباً (فاٹا میں گھس آنے والے) طالبان اور القاعدہ جنگ جوؤں کا مضبوط ترین گڑھ ہے۔ اس نے اور اس کے شریک مصنف اسمٰعیل خان نے افسروں کو کہتے سنا ہے کہ عسکریت پسند، اس علاقے میں قدم جمانے کے لیے ہر ممکن حربہ استعمال کر رہے تھے۔ انہوں نے طالبان جنگ جوؤں کی مزاحمت کی سطح اور ان کے شاندار حربوں، ہتھیاروں اور مواصلاتی

MashalBooks.org

رابطوں پر بھی حیرت کا اظہار کیا۔''ان کے زیرِ استعمال رائفلیں ہماری بہت سی بندوقوں سے زیادہ بہتر ہیں۔'' ایک سرکاری افسر نے کہا''ان کے حربے دماغ کو بوکھلا دیتے ہیں اور ان کے پاس ایسے دفاعی طریقے ہیں، جنھیں تشکیل دینے میں ہمیں کئی دن لگ جائیں۔ ایسا تو لگتا ہی نہیں کہ ہم کسی ایسی ویسی ملیشیا سے برسرِ پیکار ہیں۔ وہ ایک منظّم فوج کی طرح جنگ کر رہے ہیں۔''

2008ء کی خزاں میں پاک فوج کے آپریشنز کے دوران طالبان کا مواصلاتی سسٹم آہستہ آہستہ ختم ہونے لگا۔ مہمند اور سالارزئی کے علاقوں میں، دن کے دوران ان کی پٹرولنگ کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ فوج نے طالبان کا غیر قانونی ایف ایم ریڈیو بھی بند کر دیا اور طالبان کے کئی تربیتی کیمپ بھی تباہ کر دیئے۔ ستمبر کے آخر تک، پاکستانی حکام کے دعووں کے مطابق باجوڑ میں دو ہزار جنگ جوؤں کا خاتمہ کر دیا گیا تھا۔

اسی دوران حکومت کی جانب سے طالبان کے خطرے کا کوئی موزوں جواب نہ ملنے کی وجہ سے، غیر رسمی لشکر یا ملیشیا باجوڑ میں تشکیل پانے لگے۔ اگرچہ 2008ء تک ان لشکروں کو استعمال نہیں کیا گیا۔ حکومت کے حامی کئی ملکوں اور ان کے حامیوں کو 2007ء میں طالبان جنگ جوؤں نے نشانہ بنایا گیا۔ تمام قبائلی علاقوں اور ان سے متصل سرحد کی سوات، دیر اور بونیر کے اضلاع میں بہت سے بااثر ملک اور لشکر کے حامی قتل کر دیئے گئے۔ طالبان نے قبائلی ملیشیا پر یہ تابڑ توڑ حملے قاری ضیاالرحمٰن کی کمان میں کیے۔

سالارزئی کے ایک بزرگ نے کہا کہ اس کے قبیلے کو پاکستانی حکومت پر سخت غصہ تھا کہ وہ باجوڑ کے لوگوں کو تحفظ کیوں نہیں دے رہی اور اسی لیے انہوں نے لشکر ترتیب دیا تھا۔ سالارزئی قبیلے کے کئی افراد کو یقین ہے کہ لشکر رہنماؤں کی ٹارگٹ کلنگ دراصل پاکستانی ISI کا کام تھا۔ تاکہ طالبان کے اثر و رسوخ کو قائم رکھا جا سکے۔ (افغانستان میں امریکی اور اتحادی افواج کے خلاف) تاہم اس کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔

مہینوں کی شدید جنگ کے بعد، جس نے 5 لاکھ پاکستانیوں کو بے گھر کر کے رکھ دیا اور پانچ ہزار گھروں کو تباہ کر ڈالا، مولوی فقیر محمد نے فروری 2009ء میں یہ کہہ کر یک طرفہ جنگ بندی کا اعلان کر دیا۔ (ایک ریڈیو نشریئے میں)''ہم فوج سے نہیں لڑنا چاہتے لیکن بعض عناصر ہمارے درمیان غلط فہمیاں پیدا کرتے رہتے ہیں...... پاکستان ہمارا ملک ہے اور پاکستانی فوج ہماری فوج ہے۔'' چار دن بعد، فوج نے باجوڑ میں اپنا آپریشن معطل کر دیا۔ مارچ کے شروع میں فوج نے باجوڑ میں جنگ جوؤں کے خلاف فتح کا اعلان کر دیا اور حکومت نے اہم مہمند قبیلے سے 28 نکاتی معاہدے کا اعلان کر دیا۔ بعد میں یہی معاہدہ ترکانی اور عثمان زئی قبیلوں کے ساتھ بھی کر لیا گیا جس

MashalBooks.org

کے ذریعے اہم پاکستانی طالبان لیڈروں کو حکومت کے حوالے کیا جانا، ہتھیار پھینک دینا اور جنگ جاؤں کی حمایت ختم کرنا تھا۔ ماضی میں اس طرح کے معاہدوں کے ذریعے عموماً طالبان کو دوبارہ منظم ہونے کا موقع مل جاتا تھا۔ یہی کچھ 2009ء کے موسم گرما اور خزاں میں ہوتا دکھائی دیا۔

اگست 2009ء میں حکومت کے حامی لشکر نے طالبان ترجمان مولوی عمر کو پکڑ کے ایک اہم کامیابی حاصل کی۔ مولوی فقیر محمد کا یہ نائب بہت سے خودکش حملوں اور فوج پر حملوں کا بنیادی منصوبہ ساز سمجھا جاتا تھا۔ اسے طالبان مخالف لشکر نے مہمند کے قریبی علاقے سے گرفتار کیا۔ جنوری 2010ء کے آخر میں فوج نے باجوڑ میں آپریشن کا ایک اور سلسلہ شروع کیا۔ جس میں 25 پنجاب اور 14 پنجاب رجمنٹس، ٹوچی سکاؤٹس اور باجوڑ سکاؤٹس پر مشتمل چار ہزار جوان شریک تھے۔ ہیلی کاپٹر گن شپس بھی ان کے ساتھ تھے اور انھیں میدان جنگ میں طالبان جنگ جوؤں کا سامنا تھا۔ ایک ہفتے کی لڑائی کے بعد، چند درجن لڑاکوں نے فوج کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور اس طرح مولوی فقیر کے آبائی شہر داماڈولا جیسا اہم شہر فوج کے کنٹرول میں آ گیا۔ ہتھیار پھینکنے والوں میں، مہمند کے کاس ایریا کا طالبان کمانڈر مسعود سالار بھی شامل تھا۔ وسط مارچ میں خلیفہ نامی ایک اور اہم کمانڈر نے اپنے چالیس ساتھیوں سمیت ہتھیار ڈال دیئے اور دوبارہ کبھی ہتھیار نہ اٹھانے کا وعدہ کیا۔ دماڈولا پر پورے کنٹرول کے بعد، وہاں پاکستانی پرچم لہرا دیا گیا۔ ’’ہم نے طالبان کو مکمل شکست دے دی ہے فوجی ترجمان میجر جنرل اطہر عباس نے کہا۔ انہوں نے زور دے کر کہا کہ باجوڑ کے 90% سے 95% علاقہ پر طالبان کا کنٹرول ختم کر دیا گیا اس میں پچاس سے ساٹھ جنگ جو مارے گئے جبکہ دس فوجی جاں بحق ہوئے۔

مہمند کے لوگوں نے ملٹری آپریشن کا اس یقین کے ساتھ بھرپور خیر مقدم کیا کہ وہ اس بار شدت پسندوں کا مکمل قلع قمع کر دے گی۔ باجوڑ کے ایک باشندے بخت آور شاہ نے بتایا کہ ہمارے لوگوں نے فوج کا اس لیے بھرپور ساتھ دیا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ وہ ہمارے علاقے میں امن قائم کر دے گی۔ اور کئی مقامیوں کا کہنا تھا کہ داماڈولا پر پاکستانی جھنڈا لہراتے دیکھ کر انھیں خوشی ہوئی۔ انہوں نے وہاں سے فرار ہوتے (طالبان) جنگ جوؤں کو پناہ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ سالارزئی قبیلے کے ایک بزرگ نے کہا۔ باجوڑ کو شدت پسندوں سے صاف کرنے کے لیے ملیشیا حکومت کا ساتھ دیتی رہے گی۔ سالارزئی لوگوں نے باقاعدہ اعلان کیا کہ جو شخص بھی طالبان جنگ جوؤں سے تعاون کرے گا، اسے دو لاکھ روپے جرمانہ کیا جائے گا اور اس کا گھر مسمار کر دیا جائے گا۔

MashaBooks.org

باجوڑ کا قبائلی ڈھانچہ:

ترکانی اورعثمان زئی باجوڑ کے دو بڑے قبیلے ہیں۔ان کی مزید قسمیں درج ذیل ہیں:

ترکانی:

(1) سالارزئی۔ (2) مہمند سالارزئی، کاکازئی۔ (3) چمرقند۔ (4) چارمنگ۔ (5) نواگئی۔(6) خار۔

اُتمان خیل:

(1) اصیل۔(2) شاموزئی۔(3) مندال۔(4) لرٹراس۔(5) برٹراس۔(6) آرنگ۔ (7) علی زئی۔

ترکانی، جن میں انتہا پسندوں کی جڑیں ہیں، پندرہ لاکھ لوگوں کا قبیلہ ہے اور باجوڑ کی سات میں سے پانچ تحصیلوں میں آباد ہیں: مہمند، چمرقند، چارمنگ، سالارزئی اور نواگئی۔

مولوی فقیر محمد، پاکستانی طالبان کا سابقہ ترجمان مولوی عمر اور باجوڑ میں طالبان عدالتوں کا سربراہ مفتی بشیر، سب کے سب ترکانی ہیں۔ مفتی بشیر کا تعلق مہمند سے ہے۔عثمان خیل قبیلے کے اہم افراد میں چناگئی کا میاں مسعود جان، علی زوایریئے کا حاجی قادر خان، بٹائی کا ملک خوشاد اور نواگئی کا حاجی بسم اللہ خان شامل ہیں۔طالبان ان طاقت ور قبائلی لیڈروں پر کنٹرول نہیں کر پائے کیونکہ انہوں نے اپنے علاقوں میں طالبان مخالف لشکر قائم کر رکھے ہیں۔

مقامی آبادی کی تکالیف اور مشکلات:

غربت، تعلیم کی کم شرح، صحت کی نامناسب سہولتیں اور بے روزگاری فاٹا کی ساتوں ایجنسیوں کے بنیادی مسائل ہیں۔سالہا سال سے پاکستانی حکومت انھیں نظرانداز کرتی رہی ہے۔غربت کا یہ حال ہے کہ فاٹا کے 60% لوگ غربت کی لکیر سے نیچے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ علاقے میں شدت پسندی کی اسے ایک اہم وجہ قرار دیا جاتا ہے۔فاٹا میں نوید احمد شنواری نامی تجزیہ نگار کا کہنا ہے کہ ''قدرتی وسائل سے بہت کم فائدہ اٹھایا گیا ہے اور مقامی آبادی زیادہ تر زراعت، ٹرانسپورٹ، ہتھیاروں کی تیاری اور تجارت پر گزارہ کرتی ہے۔(سرحد پار منشیات کی تجارت یعنی سمگلنگ اور دکان داری) تمام گھرانہ عام طور پر ایک ہی شخص کی آمدنی پر انحصار کرتا ہے۔روزگار کے مواقع نہ ہونے کی وجہ سے نوجوان لوگوں کا دوسری سرگرمیوں...... جرائم، مذہبی انتہاپسندی......کی جانب رجحان زیادہ ہوجاتا ہے۔

تجزیہ نگار صفیہ آفتاب نے 1908ء میں پاکستان انسٹی ٹیوٹ برائے تحقیق امن کے لیے

لکھا۔ ''غربت اور روزگار کا نہ ملنا، دونوں فاٹا میں (عسکریت پسندی کی تہ میں مخفی) انتہائی اہم عوامل ہیں۔'' لیکن ''غربت تو پورے پاکستان میں پھیلی ہوئی ہے اور روزگار کے مواقع میں بھی بہت زیادہ اونچ نیچ آتی رہتی ہے۔'' پاکستانی وزیر داخلہ رحمان ملک نے قومی اور بین الاقوامی میڈیا (دونوں) کو بتایا کہ طالبان اپنے لڑاکوں کو بہت اچھی تنخواہیں دیتے ہیں۔'' یہ واضح ہے کہ ملک کے دشمن اور (طالبان کے) کرائے کے قاتل اپنے آقاؤں کو خوش رکھنے کے لیے قتل وغارت کی کاروائیاں جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ ہم نے جن کاروائیوں کی بھی تحقیق کی، اس کے ڈانڈے جنوبی وزیرستان سے جا ملتے ہیں۔ رحمان ملک نے بات کو پارلیمنٹ ہاؤس کے باہر اکتوبر 2009ء میں کہی تھی۔

جنوبی وزیرستان القاعدہ، طالبان، غیرملکی جنگ جوؤں اور پاکستان طالبان کے لیے انتہائی محفوظ پناہ گاہ رہی ہے جہاں القاعدہ، طالبان اور بیت اللہ محسود جیسے اہم عسکریت پسندوں کو ڈرون حملوں کے ذریعے موت کے گھاٹ اتارا گیا۔

باجوڑ میں 17 ہیلتھ کلینک اور ایک جنرل اسپتال خار میں ہے (ایجنسی کا انتظامی مرکز ہے) باجوڑ کے دس لاکھ سے زاید باشندوں کے لیے یہ تعداد انتہائی ناکافی ہے۔ اسی طرح باجوڑ میں 615 سکول جن کو مشتبہ طور پر طالبان جنگ جو (تعلیم کی مخالفت میں) نشانہ بناتے رہتے ہیں نوے ہزار بچوں کے لیے کافی نہیں۔

خار تحصیل میں بائی چینا کے ایک باشندے عبدالقیوم کا کہنا ہے۔''باجوڑ میں صحت اور علاج معالجے کی سہولتیں بہت کم ہیں۔ لیکن یہاں عورتوں کو، بچے کی ولادت کے لیے، ڈسپنسری میں لے جانے کا بھی کوئی تصور نہیں کیونکہ ان ڈسپنسریوں میں انھیں صحیح علاج نہیں ملتا۔'' نواکلی کے حنیف اللہ کے مطابق، ''ہمیں فوجی آپریشن پر کوئی اعتراض نہیں لیکن حکومت ہمیں روزگار بھی تو دے۔ فوجی آپریشن ہمارا پیٹ تو نہیں بھر سکتے۔''

باجوڑ میں بنیادی ترقیاتی ڈھانچہ مثلاً سڑکیں وغیرہ بھی نہیں رہیں۔ نواگئی تحصیل کے علاقے ڈوڈا کے کسان احمد خان نے کہا۔''سڑکوں کے نہ ہونے کی وجہ سے ہم اپنی پیداوار بروقت منڈی میں نہیں بھیج سکتے۔ جس سے ہماری زیادہ تر فصل گل سڑ جاتی ہے اور ہمیں بے پناہ نقصان ہوتا ہے۔ پتہ نہیں، ہمارے وہ کون سے گناہ ہیں جن کی سزا حکومت ساٹھ سال سے ہمیں دے رہی ہے۔''

مزید برآں مقامی زعماء پاکستانی فوج اور طالبان جنگ جوؤں، دونوں سے ہی خوف زدہ ہیں کیونکہ ان میں سے کوئی بھی باجوڑ میں امن قائم نہیں کر سکا۔ سالارزئی کے ملک عبدالناصر نے کہا۔''ہم امن اور بہتری کے لیے فوج کی مدد کرتے ہیں کیونکہ فوج اور ہمارے لشکر، دونوں کا دشمن

مشترکہ ہے۔'' ٹالی کے ایک قبائلی بزرگ نے کہا۔ ''ہمارے لڑاکا اور فوج شدت پسندوں کا صفایا کرنے کے لیے مشترکہ گشت کرتے ہیں۔ کیونکہ فوجی اس علاقے کی روایات سے ناواقف ہیں۔ ہم انھیں خفیہ معلومات فراہم کرتے ہیں اور شدت پسندوں سے آمنے سامنے بھی لڑتے ہیں۔ ضرورت پڑنے پر ہمیں اکیلا نہیں چھوڑا جانا چاہیے کیونکہ ہمارا مقصد ایک ہے اور وہ ہے باجوڑ سے طالبان کا خاتمہ۔''

2008ء کی خزاں کے فوجی آپریشن میں 5 لاکھ کے لگ بھگ باجوڑی اپنے علاقے سے دربدر ہوئے۔ انھیں یہ پریشانی طالبان اور فوج دونوں کی جنگی کارروائیوں کی وجہ سے اٹھانا پڑی۔ ان میں بہت سے لوگ سرحد کے علاقوں مردان، صوابی اور پشاور میں پناہ گاہوں سے واپس اپنے گھروں کو لوٹ چکے ہیں لیکن بہت سے ابھی تک جلوزئی، نوشہرہ اور پشاور کے کیمپوں میں مقیم ہیں۔ جلوزئی کیمپ میں مقیم ایک شخص نے کہا۔ ''اگر وہاں طالبان نہ ہوتے تو فوج بھی نہ آتی۔ دونوں پر اپنا غصہ اتارتے ہوئے اس نے کہا کہ باجوڑ آپریشن کے دوران فوجی ہیلی کاپٹروں نے بہت جانی نقصان کیا۔ داماڈولا کے رہائشی ایک شخص نے خواہش ظاہر کی کہ پاکستانی حکومت اس کا گھر دوبارہ تعمیر کرادے۔ کیونکہ وہ فوجی آپریشن کے دوران تباہ ہوا تھا۔

رحمٰن اللہ پشاور میں بی بی سی کے نمائندہ ہیں۔

MashalBooks.org

خیبر میں عسکریت پسندی اور تصادم

راحیل خاں اپریل 2010ء

پاکستان کا شمالی مغربی علاقہ، ڈیورنڈ لائن کے بالکل ساتھ ساتھ، خیبر ایجنسی کہلاتا ہے۔ اس کے سرحد کے دوسری طرف تورا بوڑا کے غاروں کا (مشہور پناہ گاہوں کا) پیچیدہ سلسلہ ہے جس سے 2001ء کے آخر میں اسامہ بن لادن فرار ہوا تھا۔ تاریخی درہ خیبر کے نام سے موسوم خیبر ایجنسی کا رقبہ 2576 مربع کلومیٹر ہے اور اس کی آبادی پانچ لاکھ سینتالیس ہزار کے لگ بھگ ہے۔ اس کے تین انتظامی یونٹ ہیں۔ باڑہ، جمرود اور لنڈی کوتل۔ دور دراز تیرہ وادی اگرچہ چھوٹی سی ہے مگر جغرافیائی نقطہ نظر سے بہت اہم ہے اور کہا جاتا ہے کہ 2001ء میں امریکی اور نیٹو افواج کے افغانستان پر حملے بعد القاعدہ کے عسکریت پسند اسی راستے کو اپنے فرار کے لیے استعمال کرتے رہے ہیں۔ وادی کے تیرہ، خیبر ایجنسی ہی کی طرح، آفریدی قبیلے کا علاقے ہے اور ہمیشہ ہی مجرموں اور اسلامی انتہا پسندوں کی محفوظ پناہ گاہ رہی ہے۔

خیبر ایجنسی میں جدید عسکریت پسندی کے مختلف رخ ہیں۔ فرقہ دارانہ قتل وغارت، سنی گروپس طالبان کی طرز کی حکومت قائم کرنے کے حامی، اور ڈرگ مافیا تمام ہی ایجنسی میں آگ بھڑکانے کے ذمہ دار ہیں۔ لشکر اسلام، انصار الاسلام اور تحریک طالبان پاکستان کی علاقے میں سرگرمیاں خیبر کے باشندوں کے لیے وبال جان بنی ہوئی ہیں۔ مشاہدہ کاران گروپوں میں عموماً امتیاز نہیں کر پاتے حالانکہ یہ سب آپس میں بھی متصادم رہتے ہیں۔

خیبر میں شورش کا ڈھانچہ:

خیبر ایجنسی کو، اس کی شہری طرز زندگی اور پشاور کے نزدیک ہونے کی وجہ سے جدید سہولتوں کی آسانی کی بنا پر، نسبتاً ترقی یافتہ اور جدید سمجھا جاتا رہا ہے۔ نائن الیون کے بعد خیبر میں مشکل صورت حال 2003ء میں اس وقت پیدا ہوئی جب حاجی نامدار نامی ایک مقامی قبائلی تاجر

12 سال کے بعد سعودی عرب سے لوٹا اور اس نے طالبان سٹائل ایک تنظیم ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' وادی تیرہ میں قائم کی۔ حاجی نامدار کی سماجی اصلاحات انتہائی سخت اور تیز تھیں۔ اس نے موسیقی کی ممانعت کر دی، لنڈی کوتل میں موسیقی کی چیزوں کی دکانیں بند کروا دیں، مقامی لوگوں کو داڑھی بڑھانے اور خواتین کو برقع پہننے کے احکامات کر دیئے۔ خیبر کے بعض علاقوں میں نامدار خان نے مسجدوں میں حاضری کو مانیٹر کرنے کے لیے رجسٹرار مقرر کر دیے۔ مخالفت کرنے والوں کو سر عام مارا پیٹا جاتا یا نجی جیل (جس کا نام گوانتانا موا ور ابوغریب رکھا گیا تھا) میں بند کر دیا جاتا۔ نامدار نے اپنے پیغامات لوگوں تک پہنچانے کے لیے نسبتاً بہتر طریقے اختیار کیے۔ اس کے ساتھیوں میں، کہا جاتا ہے کہ عرب جنگ جو بھی شامل تھے جو افغانستان میں امریکی افواج کو نشانہ بناتے رہے۔ اس وقت سے ہی وادی تیرہ مقامی اور غیر ملکی جنگ جوؤں کا مضبوط گڑھ رہے ہیں۔ نامدار خان نے اپنا ایک غیر قانونی ایف ایم ریڈیو چینل قائم کیا۔ خیبر ایجنسی میں یہ پہلا ریڈیو تھا۔ اس نے شیعہ واعظ منیر شاکر کو ریڈیو پر انقلابی وعظ کرنے کے لیے باقاعدہ کام دیا۔ دسمبر 2004ء میں حکومت نے اس ریڈیو کو بند کرنے کے احکامات جاری کیے مگر نامدار نے ریاست کی رٹ کو نہ مانتے ہوئے براڈ کاسٹنگ جاری رکھی اور اپنے آپریشنز کا دائرہ کار اور بڑھا دیا۔ وہ لاشعوری طور پر دوسرے جنگ جو گروپوں کے لیے ایک ماڈل تشکیل دے رہا تھا۔ حاجی نامدار کی سرگرمیوں نے شدت پسند گروہوں کے لیے گویا میدان ہموار کیا اور 2005ء تک وہاں لشکر اسلام (مفتی منیر شاکر) اور منگل باغ جولائی 2006ء میں انصار الاسلام (قاضی محبوب اور مولانا احمد) اور آخر میں تحریک طالبان پاکستان کا خیبر ایجنسی میں داخلہ انہی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ پاکستانی حکومت اس سارے پراسس کے دوران علاقے سے غائب تھی۔ بالآخر تحریک امر بالمعروف، لشکر اسلام اور انصار الاسلام پر جون 2008ء میں پابندی لگا دی گئی۔

مفتی منیر شاکر اور پیر سیف الرحمٰن: بالادستی کی پیاس:

خیبر کے علاقے میں قتل و غارت دو مذہبی افراد کے اختلافات سے عبارت ہے۔ ان میں ایک پیر سیف اللہ، بریلوی اعتقاد کا ہے اور دوسرا دیوبندی خیال کا مفتی منیر شاکر ہے۔ دونوں سنی عقیدے سے ہیں۔ ان میں اختلاف محض یہ ہے کہ بریلوی پیری فقیری کو (اور پیغمبر اسلام سے ان کے روحانی تعلق کو) مانتے ہیں اور دیوبندی عقیدے کے مطابق حضرت محمدؐ روحانی قوتوں کے حامل ایک انسان تھے اور ان کی اس طاقت کو بڑھا چڑھا کر پیش نہیں کرنا چاہیے۔

پیر سیف الرحمٰن افغان ہے اور وہ 1977ء میں باڑا میں آباد ہوا تھا۔ وہ اسلام کے

MashalBooks.org

بریلوی فرقے کا انتہا پسند حامی ہے۔ پاکستان اور افغانستان کے کئی حصوں میں بہت سے لوگ اسے روحانی بزرگ سمجھتے ہیں۔ مقامی آفریدی قبائل نے پیر رحمان کی بھرپور مدد کی اور وہ اپنے نجی چینل کے ذریعے پورے علاقے میں معروف مبلغ کے طور پر جانا جانے لگا۔ مفتی منیر دیوبندی عالم ہے (کرک سے)۔ اسے فرقہ دارانہ فسادات کو ہوا دینے کی وجہ سے کرم ایجنسی سے نکال دیا گیا تو وہ خیبر کے علاقے میں آ گیا۔ دونوں مذہبی شخصیتوں کا تعلق خیبر سے نہ ہونے کے باوجود، انہوں نے یہاں بھی فرقہ وارانہ اختلافات کو فوراً ہی ہوا دی (اور اپنے اپنے ریڈیو چینلز پر ایک دوسرے پر حملے کرنے لگے) اور نومبر 2005ء میں ان کے پیروکاروں میں خونیں فسادات شروع ہو گئے۔

دونوں نے ہی ایک دوسرے کو خیبر چھوڑ دینے کے فتوے دینا شروع کر دیئے۔ اپنے اپنے حامیوں کے جلوس نکالنے لگے۔ باڑہ سے باہر کے لوگ بھی اس جنگ میں شریک ہونے اور اپنے اپنے فرقے کی مدد کے لیے تیار ہونے لگے۔ بریلوی مکتبہ فکر کے لوگوں نے (یہ پاکستان میں ایک بڑا فرقہ ہے) پیر رحمان کی حمایت میں پورے پاکستان میں احتجاجی مظاہرے کیے۔

2005ء کے آخیر اور 2006ء کے شروع میں پیر رحمان اور مفتی منیر کے مابین حالات اور سنگین ہوئے تو مسئلے کے حل کے لیے لوگوں نے حکومت کی توجہ چاہی مگر ادھر سے کوئی خاص جواب نہیں ملا۔ حکومتی مداخلت میں تاخیر نے علاقے میں قتل وغارت کا سماں پیدا کر دیا جس میں درجنوں جانیں ضائع ہوئیں۔ بہت سے لوگ زخمی ہوئے اور علاقے کے امن اور تجارت کو زبردست نقصان پہنچا۔ مقامی علماء کے امیر احمد خان کی سربراہی میں ایک امن کمیٹی بنائی گئی مگر وہ تصادم کو روکنے اور امن قائم کرنے میں ناکام ہو گئی۔

آفریدی قبیلے نے مولانا احمد کو ہٹا کر، حاجی نامدار کو اس کمیٹی کا سربراہ بنا دیا جسے حکومت اور خیبر کی اسمبلی کے رکن مولانا خلیل الرحمٰن نے مسترد کر دیا کیونکہ حاجی نامدار کا تعلق مفتی منیر سے تھا اور اس سے خطرہ تھا کہ وہ علاقے میں طالبانائزیشن کو رواج دے گا۔ مفتی منیر کے گروپ نے انتظامیہ اور سابقہ امن کمیٹی پر قنبر آباد میں 24 فروری 2006ء کو پشاور سے صرف 11 کلومیٹر دور، حملہ کر دیا جس میں امن کمیٹی کے سربراہ نصیب خان سمیت سات افراد جاں بحق ہو گئے۔ جواباً حکومت نے باڑا میں ایک بڑا آپریشن شروع کر دیا۔ غیر جانبدار لوگوں کو علاقے سے نکل جانے کے لیے کہا گیا کیونکہ منیر گروپ لوگوں کو حکومت کے خلاف اکسا رہا تھا۔ قبائلی جرگے کی درخواست پر حکومت نے فوجی ایکشن ملتوی کر دیا تاکہ جرگے کو مسئلے کے حل کا پرامن موقع مل سکے۔ بالآخر وہ دونوں گروپوں پر دباؤ ڈالنے پر کامیاب ہو گئے اور سیف الرحمٰن اور مفتی منیر نے خیبر سے نکل جانے پر اتفاق کر لیا۔

حکومت نے ان دونوں کو جنوری 2006ء میں علاقے سے نکل جانے کا حکم دیا تھا اور مقامی قبائل کے جرگے نے بھی اس فیصلے کی بھرپور حمایت کی تھی۔ چنانچہ پیر سیف الرحمٰن پنجاب چلا گیا اور مفتی منیر کو ملک سے باہر جاتے ہوئے کراچی ائیرپورٹ پر گرفتار کر لیا گیا۔ پندرہ ماہ کی نظر بندی کے بعد 2 اگست 2007ء کو اسے رہا کر دیا گیا۔ مفتی منیر کے مطابق اس کی رہائی غیر مشروط تھی۔

پیر رحمان اور مفتی منیر کی غیر موجودگی کے باوجود خیبر میں امن قائم نہیں ہو سکا۔ ان کے حامی لشکر اسلام اور انصار الاسلام آپس میں ایک دوسرے سے الجھتے رہے۔

لشکر اسلام اور انصار الاسلام:

مفتی منیر شاکر نے لشکر اسلام 2005ء میں تشکیل دی تھی تاکہ دیوبندی انتہا پسند نظریات کو آگے بڑھایا جا سکے۔ بدامنی اور فسادات غالباً ان کے مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ تھے۔ فروری 2006ء میں جب مفتی منیر کو علاقے سے نکال دیا گیا منگل باغ نامی ایک سابقہ بس ڈرائیور کو لشکر اسلام کا سپریم کمانڈر بنا دیا گیا۔ گروپ میں کئی اہم کمانڈرز بشمول محمد طیب اور صفور خاں موجود ہیں۔ قبائلی نمائندوں میں مصری گل، غنچہ گل اور حاجی حلیم شاہ اور مختلف قبائل کے بیس دوسرے افراد لشکر اسلام کی شوریٰ میں شامل ہیں۔ زار خاں گروپ کا ترجمان ہے۔ لشکر اسلام لوگوں کو بھرتی کرنے کے لیے مالی معاونت کا سہارا بھی لیتا ہے۔ فاٹا کے دوسرے علاقوں کی طرح، خیبر بھی بہت غریب اور پسماندہ علاقہ ہے اور حکومتی کرپشن سے بری طرح متاثر بھی ہے۔ لشکر اسلام رنگروٹوں کو 80 سے سو ڈالر تک ماہانہ ادا کرتا ہے اور جنگ جوئی کارروائیوں کے دوران کھانا بھی مفت ہوتا ہے۔

لشکر اسلام کا بڑھتا ہوا اثر روکنے کے لیے 18 جولائی 2006ء کو انصار الاسلام بنائی گئی۔ یہ تنظیم دیوبندی مکتب کے معتدل تنظیم اتحاد علمائے تشکیل دی اور اس میں سابقہ امن کمیٹی کے ارکان پیر رحمٰن کے حمایتی قبائلی عمائدین شامل تھے۔ اہم بات یہ ہے کہ پیر رحمٰن گروپ کے بریلوی اراکین محمد انصار الاسلام کی، اس کے دیوبندی نظریے کے باوجود، حمایت کرتے ہیں۔ یہ تنظیم مقامی بزرگ قاضی محبوب الحق امن کمیٹی کے سابقہ سربراہ احمد خان پر مشتمل ہے اور غلام نبی اور محمد حسین سمیت 20 مختلف قبائل کے عمائدین اسکی شوریٰ میں شامل ہیں۔ ڈاکٹر نعیم اس کے نائب امیر اور گروپ کے ترجمان ہیں۔ انصار الاسلام کا مولانا فضل الرحمٰن کی JUI سے قریبی تعلق ہے۔ انصار الاسلام نے جب باڑہ میں اپنے حامیوں کا جلوس نکالا تو وہ جمعیت علمائے اسلام کے

MashalBooks.org

جھنڈے لیے ہوئے تھے اور فضل الرحمٰن گروپ سے اپنی وابستگی کا واضح اظہار کر رہے تھے۔

خیبر ایجنسی میں عسکریت پسند گروپس

انصار الاسلام لشکر اسلام تحریک طالبان پاکستان اورک زئی ایجنسی سے تعلق

حضرت نبی اور حضرت علی TTP کمانڈرز برائے لنڈی کوتل

نذیر آفریدی کمانڈر تحریک طالبان پاکستان

منگل باغ آفریدی (امیر)

قاضی محبوب الحق۔ امیر

حمزہ۔ ترجمان زادخان ترجمان

محمد طیب، واحد خان صفور خان اہم کمانڈرز

طیب، مصری گل، غنچہ گل، جان گل موسیٰ خان کے شوریٰ اراکین اور 25 دوسرے

ڈاکٹر نعیم نائب امیر اور ترجمان

مولانا احمد، غلام نبی کی شوریٰ کے ارکان اور 20 دوسرے

منگل باغ کا ظہور:

35 سالہ منگل باغ کا تعلق آفریدی قبیلے کے نسبتاً غریب اور سیاسی طور پر کمزور شاخ سیپاہ سے ہے۔ آفریدی قبیلے کی خیبر کے علاقے میں اکثریت ہے۔ اس کے والد کا اس کے بچپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا اور اس کی ماں نے تن تنہا اس کی پرورش کی۔ منگل باغ نے روایتی تعلیم حاصل نہیں کی لیکن کچھ عرصہ اس نے ایک مدرسے میں ضرور گزارا۔ (وہاں بھی، وہ کوئی مذہبی تعلیم حاصل نہیں کر سکا۔ ٹرکوں کی صفائی کرنا، اس کا پہلا کام تھا تاہم اس کا دعویٰ ہے کہ وہ بس ڈرائیور رہا۔ اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ وہ اپنے ہی خاندان کی ملکیتی بسیں چلایا کرتا تھا۔

باغ انتہائی چالاک سیاسی ذہن کا مالک ہے۔ اس نے افغان جہاد میں حصہ لیا لیکن واپس آ کر عوامی نیشنل پارٹی جیسی سیکولر پارٹی میں شامل ہو گیا۔ اے این پی وہ جماعت ہے جس نے سوویت مخالف جہاد کی شدید مخالفت کی تھی اور اسے فساد قرار دیا تھا۔ اب اے این پی فاٹا کی مذہبی گروپوں کے سخت خلاف ہے۔ وہ سرگرم جہادی کا رکن رہا اور ANP ایک سیکولر جماعت ہے مگر اس نے ان متصادم مفادات کو قطعی کوئی اہمیت نہیں دی۔ اس نے اے این پی کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا اور 2001ء میں باڑہ ٹرانسپورٹ ایسوسی ایشن کا سیکرٹری بن گیا۔

منگل باغ ایک امن پسند تبلیغی جماعت میں شامل ہونے کے بعد مفتی منیر سے ملا۔ لشکر

اسلام کے ذریعے، اس کے عروج کی تفصیلات واضح نہیں لیکن مفتی منیر کے خیبر سے نکالے جانے کے بعد ہوا یہ کہ اسے لشکر اسلام کا امیر بنا دیا گیا۔

منگل باغ کا سیاسی پروگرام مجرمانہ اور ڈرگ نیٹ ورک کے منفی اثرات اور غیر موثر حکومتی اقدامات پر بھرپور روشنی ڈالتا ہے وہ اپنے آپ کو غریبوں کا زبردست حامی اور قبائلی ملکوں کا سخت مخالف ظاہر کرتا ہے۔ حکومت سے ناجائز مفادات حاصل کرنے والے امراء کا وہ شدید ناقد ہے۔ منگل باغ عام قبائلی کے مسائل کی بات کرتا ہے اور اسی بات نے لشکر اسلام میں موجود نوجوانوں کو اس کا گرویدہ بنا دیا ہے۔ اس نے اپنے گرد بھی ایک خوف کا دائرہ بنا رکھا ہے۔ ہتھیاروں سے مسلح بہت سے محافظ اس کے اردگرد ہوتے ہیں اور مفتی منیر سے متاثر ہو کر، شریعت کے نفاذ میں بھی طاقت کا استعمال کرتا ہے۔ اس نے باڑہ تحصیل میں مردوں کو ٹوپی اور عورتوں کو برقع پہننے کا حکم دیا۔ جون سے جولائی 2006ء تک حکومت کو باڑہ کی مرکزی مارکیٹ کو بند کرنا پڑا کیونکہ منگل باغ نے کہا تھا کہ وہ علاقے کا کنٹرول سنبھال رہا ہے۔ اس نے موسیقی کی اشیاء بیچنے والوں اور منشیات کے تاجروں کو باڑے میں کام کرنے پر پابندی لگا دی۔ وہ اپنے ریڈیو سٹیشن پر بڑی پابندی سے مذہبی معاملات پر گفتگو کرتا ہے۔ اس نے خیبر میں لاء اینڈ آرڈر کا نیا سسٹم تعارف کرایا ہے۔ مجرموں پر بھاری رقوم کے جرمانے عاید کر دیئے مثلاً قتل پر تقریباً 6000 امریکی ڈالر۔ ٹی وی سیٹلائٹ رکھنے پر 600 امریکی ڈالر، اور پنج وقتہ نماز کی عدم ادائیگی پہ 8 امریکی ڈالر روزانہ۔

2006ء میں مفتی منیر کے علاقے سے نکالے جانے کے بعد، منگل باغ نے باڑہ کے گاؤں GAGRINA میں لشکر اسلام کی سرگرمیاں جاری رکھنے کے لیے اپنا ہیڈ کوارٹر بنا لیا۔ گروپ شروع شروع میں غیر متحرک رہا لیکن اسلامی لیڈر کے طور پر اپنی ظاہری اور نظریاتی جگہ بنانے کے بعد اس نے ریاست کی رٹ کو کھلم کھلا چیلنج کر دیا۔ اس نے حکومت کو متنبہ کیا کہ وہ اس کے ہتھیار ڈالنے کے احکامات واپس لے ورنہ وہ حکومت کے خلاف زبردست مسلح کاروائی کرے گا۔ اس نے کہا۔ ''اب ہمارے لیے امن سے رہنا بہت مشکل ہے۔ یہ تصادم صرف خیبر ایجنسی تک ہی محدود نہیں رہے گا بلکہ تمام پشاور ریجن میں پھیل جائے گا۔'' اس قسم کی جذباتی باتوں کے ساتھ ساتھ منگل باغ نے اپنا اثر ورسوخ کو قائم رکھنے کے لیے سیاسی حکمرانوں سے بھی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا۔

کافی حد تک خیبر کے علاقے میں بہت سے لوگوں کو یقین تھا کہ منگل باغ کو فوجی اسٹیبلشمنٹ کی آشیرباد حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے تحریک طالبان پاکستان کی تعاون اور

MashalBooks.org

انضمام کی کئی پیش کشوں کو مسترد کیے رکھا۔کئی بار 9-2008ء میں پاکستانی طالبان (TTP) کے درمیانے درجے کے کئی لیڈروں نے باڑہ (اور وادی تیرہ) کا دورہ کیا تاکہ اسے افغانستان میں کاروائیوں کے لیے اشتراک پر قائل کیا جا سکے۔صراطِ مستقیم نامی فوجی آپریشن کے دوران، جون 2008ء میں اس نے اپنے حامیوں کو مزاحمت سے منع کیا۔منگل باغ کسی بھی قیمت پر تحریک طالبان پاکستان کو خیبر میں داخل ہونے سے روکنا چاہتا تھا۔ جوں جوں اس کی ملیشیا میں اضافہ ہوا۔اس کی کاروائیاں باڑہ سے جمرود (وادی تیرہ اور پشاور شہر) تک بڑھ گئیں۔لیکن پاکستانی طالبان کی مخالفت کے باوجود منگل باغ حکومت کا اتحادی نہیں بن سکا اور اپوزیشن میں رہتے ہوئے ہی خیبر ایجنسی میں شریعت کے نفاذ کے لیے وقف رہا۔

باغ نے باڑہ اور وادی تیرہ میں انصار الاسلام کے خلاف کاروائیاں جاری رکھیں بلکہ ان کا دائرہ پشاور کے مضافات تک بڑھا دیا۔اس کے حامی ان مضامات میں پٹرولنگ کرنے لگے۔ مسلح طاقت کے زور پر موسیقی سے متعلق دوکانداروں کو دھمکیاں دینے لگے۔ جون 2008ء کے آخری ہفتے میں باغ کے ساتھیوں نے پشاور کے اکیڈمی ٹاؤن سے 16 کرسچین اغوا کر لیے۔ بعد میں انھیں قبائلی جرگہ کی مدد سے آزاد کرالیا گیا لیکن یہ حرکت لوگوں اور حکومت کے لیے واضح اشارہ تھا کہ منگل باغ اپنے برانڈ کا اسلام خیبر ایجنسی سے باہر بھی پھیلانا چاہتا ہے۔

پاکستانی حکومت پشاور شہر میں دہشت گردانہ واقعات کا منگل باغ کو ذمہ دار ٹھہراتی ہے۔ پشاور پولیس کے چیف نے دعویٰ کیا کہ 29 اکتوبر 2009ء کے کار بمبنگ کے واقعے میں لشکر اسلام ملوث تھا۔اس میں 50 لوگ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔اکتوبر دھماکے تفتیش کاروں کو یقین ہے کہ لشکر اسلام پشاور کے اور کئی دھماکوں میں بھی ملوث ہو سکتا ہے۔

خیبر میں تحریک طالبان پاکستان کی کارستانیاں:

منگل باغ کی لاقانونیت اور مذہبی قدامت پسندی کے باوجود تحریک طالبان پاکستان کو خیبر میں منظم ہونے میں مشکلات کا سامنا تھا۔لشکر اسلام اور تحریک امر بالمعروف نے TTP کی شدید مزاحمت کی کیونکہ وہ آزادانہ کاروائیوں کے قائل تھے اور ان کا ایجنڈا بہت ہی مقامی انداز کا تھا۔شمالی اور جنوبی وزیرستان اور افغانستان میں شدید دباؤ میں آنے کے بعد، القاعدہ اور TTP 2008ء میں خیبر اور پشاور میں نیٹو کی سپلائیز پر حملے کرنے لگے لیکن منگل باغ اور حاجی نامدار سے موزوں معاہدے میں ناکامی کے بعد، انہوں نے استاد یاسر نامی افغان کمانڈر کی قیادت میں اپنے کچھ لوگ اس کے پاس بھیجے۔ حاجی نامدار نے شروع میں ان کی مہمان داری کی اور انھیں

ہتھیاروں اور رسد کی نقل وحرکت میں مکمل تحفظ کا یقین دلایا لیکن TTP، ان لوگوں سے جوان کی موجودگی ناپسند کرتے تھے، متصادم ہوگئی اور قبائلی جرگے پر خودکش حملہ کرڈالا جس میں 40 سے زائد قبائلی عمائدین جاں بحق ہوگئے۔

امریکی دباؤ کے نتیجے میں پاکستانی حکومت نے (جون، جولائی، 2008ء میں) خیبر میں صراط مستقیم آپریشن شروع کیا تاکہ خیبر سے جانے والے راستوں کو محفوظ کیا جاسکے پاکستانی فوج کا آپریشن بہت کامیاب رہا اور پاکستانی طالبان پسپا ہوکر، واپس اپنے محفوظ پناہ گاہوں میں چلے گئے۔

بہت سے جنگ جو اس آپریشن میں گرفتار ہوئے۔ ان کے ہتھیار ضبط کر لیے گئے۔ چونکہ ان کا میزبان اور واحد محافظ حاجی نامدار اس علاقے کا نہیں تھا اور غالباً TTP جنگ جوؤں کی پناہ گاہوں سے باخبر تھا اس لیے بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ اس نے پاکستانی فوج کو ان کے ٹھکانوں کے بارے میں لاعلم رکھا۔ حاجی نامدار نے بہرحال اپنے مقامی ریڈیو چینل پر یہ اعلان کیا کہ استاد یاسر اور اس کے آدمیوں کو ہتھیار ڈال دینے چاہئیں یا جنوری 2007ء میں جنوبی وزیرستان کے قبائل کے ہاتھوں ازبک جنگ جوؤں جیسے قتل عام کا سامنا کریں۔ حاجی نامدار نے وضاحت کی کہ اسے افواج کی مکمل حمایت حاصل ہے اور وہ خودکش حملوں سے بالکل خائف نہیں۔

مقامی لوگوں کا خیال ہے کہ پاکستان خفیہ اداروں اور CIA نے حاجی نامدار کی وفاداریاں ایک لاکھ پچاس ہزار ڈالر میں خرید لی تھیں۔ اس پر تحریک طالبان پاکستان نے خودکش حملہ کرایا اور پھر میزائل کا نشانہ بھی بنایا گیا مگر وہ ان سے بچ نکلا۔ تاہم 12 اگست 2008ء کو اپنے ہی دفتر میں نامعلوم حملہ آوروں کے ہاتھوں مارا گیا۔ TTP کے نئے امیر حکیم اللہ محسود نے اس قتل کی ذمہ داری قبول کر لی۔

تحریک طالبان پاکستان کو خیبر ایجنسی میں قدم جمانے میں خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ منگل باغ اور نامدار خان کو اتحاد میں شامل کرنے میں انہیں کوئی خاص کامیابی نہیں ملی۔ تاہم اب پاکستانی طالبان کو نذیر آفریدی، حمزہ، حضرت نبی اور حضرت علی جیسے سرکردہ کمانڈروں کی شمولیت کے ساتھ خیبر میں اہم حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ TTP کے مضبوط گڑھ اورک زئی کے رہنماؤں اسلم فارقی اور سعید خان کا ان مقامی رہنماؤں کے ساتھ مستقل رابطہ ہے۔

پاکستانی طالبان کے ہاتھوں، حاجی نامدار کا قتل گروپ کی ایک بڑی کامیابی تھی۔ اب یہ نیٹو افواج کی رسد پر حملے کے لیے خیبر ایجنسی کو استعمال کررہے ہیں۔ فوجی اور بین الاقوامی تنظیموں کے افراد اغوا کیے جارہے ہیں، دہشت گردوں پر حملوں کے منصوبے بن رہے ہیں۔ اب تک سات سو کار گو ٹرک اور فوجی گاڑیاں تباہ کیے جاچکے ہیں۔ تمام رسد کا چھوٹا سا حصہ ہونے کے

باوجود، یہ اشیاء خاصی بڑی مقدار میں تھیں۔

2009ء کے شروع میں نیٹو اور اتحادی افواج کی 80% سے زیادہ سپلائیز پاکستان کے راستے کی جاتی تھیں۔ ایجنسی میں سے جانے والے اشیائے رسد کے یہ قافلے جنگ جوؤں کے لیے انتہائی دلکش ٹارگٹ بن گئے۔

پاکستان کے حفاظتی اداروں نے رسد کے ان راستوں کو کھلا رکھنے کے لیے بہت محنت کی ہے۔ مئی 2009ء میں محسود کے مقرر کردہ یحییٰ مصطفیٰ نامی افغان (جو اتحادیوں میں ہجرت کے نام سے مشہور تھا) پشاور میں فوج کے ہاتھوں مارا گیا۔ پشاور، طورخم روڈ پر نیٹو کی سپلائیز کو منقطع کرنے اور تباہ کرنے کی تمام تر ذمہ داری ہجرت ہی کی تھی۔ وہ کافی عرصہ حکام کی واچ لسٹ میں رہا۔ وہ پہلے بھی جمرود کے ایک فوجی ٹھکانے سے نیٹو سپلائیز پر حملے کی کئی وارداتوں میں ملوث ہونے کی وجہ سے گرفتار کیا گیا تھا۔ 5 اگست 2009ء کے ایک ڈرون حملے میں TTP کے امیر بیت اللہ کی وفات کے بعد، گروپ نے خیبر ایجنسی میں بے انتہا خوفناک حملہ کیا۔ اگست 2009ء کے آخری ہفتے میں طورخم میں پاک افغان سرحد کے ساتھ ایک پولیس پوسٹ پر حملہ کیا گیا جس میں 22 افراد مارے گئے۔ خیبر ایجنسی میں TTP کے یہ حملے اور بھی بڑھ سکتے ہیں کیونکہ جنوبی وزیرستان میں کیے گئے راہِ نجات آپریشن کے نتیجے میں (اکتوبر 2009ء میں) طالبان جنگ جو اورک زئی اور خیبر ایجنسی میں آن چھپے ہیں۔

TTP کے خیبر ایجنسی کے مقامی جنگ جوؤں کے ساتھ تعلق کے باوجود، لشکرِ اسلام کی کارروائیاں بڑہ بیر، سربند، سوری زئی، ترنب، بازید خیال، اور مرا ور کچوری...... پشاور کے مضافات میں بدستور جاری ہیں۔ لوگ خوف میں زندگی گزار رہے ہیں اور وہ حکومت سے جنگ جو گروہوں کے خلاف ٹھوس اقدامات کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ نومبر 2009ء کے آخری ہفتے میں، حکومت نے خیبر کے علاقے میں فوجی آپریشن (تم مجھے پسند کرو گے) شروع کیا۔ حکومت کا دعویٰ ہے کہ اس نے تیرہ اور باڑہ میں جنگ جوؤں کو خاصا نقصان پہنچایا ہے۔

پاکستانی فوج کے حملے:

پاکستانی فوج نے خیبر ایجنسی میں کئی آپریشن کیے جن کے نام یہ ہیں: ''میں آ گیا!''، ''میں دوبارہ آ گیا۔''، ''صراطِ مستقیم'' اور ''تم مجھے پسند کرو گے۔'' (یہ سب نام پشتو میں رکھے گئے تھے) ان آپریشنوں کا بنیادی مقصد منگل باغ، تحریک طالبان پاکستان اور دوسرے جنگ جوؤں کو طارق آفریدی گروپ اور انصار الاسلام سے علیحدہ کرنا تھا تاکہ پشاور پر موجود دباؤ کو ختم کیا جا سکے

اور درہ خیبر کے ذریعے نیٹو کے سامانِ رسد کی نقل وحمل کو محفوظ کیا جا سکے۔ ان آپریشنز کا سلسلہ 2007ء کے موسم گرما میں شروع ہوا۔ ان میں سے پانچ خوش اسلوبی سے مکمل ہوئے جبکہ بعض آپریشنز مثلاً جون 2008ء کا حملہ فرنٹیئر کور کے ذریعے کیا گیا جو اپنی ناقص تربیت اور جامد سوچ کے لیے خاصا معروف ہے..........شدت پسندوں کے خلاف فوجی آپریشن ''تم مجھے پسند کرو گے'' کے بعد فوجی حکام نے دعویٰ کیا کہ انہوں نے باڑہ اور تیرہ وادی اور ارد گرد کے علاقوں میں کامیابیاں حاصل کی ہیں مگر وہ جنگ جوؤں کا صفایا کرنے میں ناکام رہے۔ یہ کارروائی خاصی مختصر سی تھی۔ اس میں بمشکل 200 فوجی شامل تھے۔ لنڈی کوتل میں فوجیوں کی یہ تعداد کنٹرول کرنے کے لیے انتہائی ناکافی تھی۔ فوج زیادہ تر گن شپ، ہیلی کاپٹرز، جنگی جیٹ طیاروں اور بھاری آرٹری طالبان کو ختم کرنے کے لیے، استعمال کرتی رہی ہے لیکن ان اقدامات سے بھی علاقے کو محفوظ نہیں بنایا جا سکا۔ حملے آج بھی جاری ہیں۔

فروری 2010ء کی ابتداء میں TTP کے جنگ جوؤں نے خودکش بمباروں سمیت خیبر میں نیٹو کے آئل ٹینکرز پر حملہ کیا۔ کئی فوجی پوسٹوں کو نشانہ بنایا، الیکٹرکل سب سٹیشن کو تباہ کر دیا اور ایک ٹیچر کو بھی قتل کر ڈالا۔ خود پاکستانی فوج کے بھی، خیبر میں، کئی جوان مارے گئے 10 فروری 2010ء کو ایک تباہ شدہ ہیلی کاپٹر کے پائلٹ اور گنر کی لاشوں کے حصے تلاش کرتے ہوئے، فوجی ریسکیو پارٹی کا سربراہ ایک بریگیڈیر طالبان جنگ جوؤں کے ہاتھوں مارا گیا۔ عسکریت پسندی بہرحال ایک بڑا مسئلہ ہے کیونکہ پاکستانی فوج کے حملوں میں باقاعدگی اور تسلسل نہیں ہے۔ بعض لوگ ان کو ختم کرنا چاہتے ہیں مگر بعض ایجنسی کے خارجی سیاسی ڈائنامیکس کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ پاکستان کے قبائلی علاقوں میں عسکریت پسندی ایک غبارے کی مانند ہے، ایک طرف سے دبایا جائے تو وہ دوسری طرف سے پھول جاتا ہے۔ شدت پسندی کو اگر خیبر کے علاقے میں دبا دیا جائے تو لڑاکے اورک زئی یا کرم کی طرف چلے جاتے ہیں۔

خیبر میں قبائلی ڈھانچہ:

خیبر ایجنسی میں بنیادی طور پر چار قبیلے آباد ہیں۔ آفریدی، شنواری، ملاگری اور شانی۔ یہ قبیلے پہاڑوں میں بستے ہیں اور غیر معمولی طور پر جفاکش سمجھے جاتے ہیں۔ پیدائشی جنگ جو تو ہوتے ہی ہیں لیکن مسلح بھی خوب رہتے ہیں۔ قبائلی جنگ جو ایسے گھروں میں رہتے ہیں جن کے سامنے مٹی گارے کی دیوار ہوتی ہے اور ہر کمپاؤنڈ کے لیے ایک واچ ٹاور ہوتا ہے۔ دوسرے پختونوں کی طرح، ان کی بھی روایات ہیں جن میں مہمان نوازی، انتقام اور (دوسروں سے زیادتی یا غلط سلوک

کے لیے) معافی کی تلاش کی ضرورت شامل ہیں۔

ان میں آفریدی قبیلہ غالب اکثریت میں ہے لیکن وہ آٹھ ذیلی شاخوں میں تقسیم ہے۔ آدم خیل، اکا خیل، قمر خیل، قنبر خیل، ملک دین خیل، کوکی خیل، ذکا خیل اور سیپاہ۔ شنواری قبیلہ دوسرا بڑا قبیلہ ہے اور اس کی تین شاخیں ہیں۔ خوجہ خیل، میر داخیل اور مزسوکئی۔ شمانی اور ملاگری بہت چھوٹے قبائل ہیں۔

آفریدی قبیلہ خیبر میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے اور اگر قبیلے کے بااثر لوگوں کو موثر طریقے سے متحرک کیا جائے تو وہ خیبر کے علاقے میں طالبان کے خاتمے میں بے پناہ مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ 2006ء کے شروع میں ایک قبائلی جرگے نے پیر سیف الرحمٰن اور مفتی منیر کو علاقے سے نکل جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ قبائل ان عسکریت پسندوں کے خلاف کھڑے ہو سکتے ہیں لیکن انھیں حکومت کے حفاظتی نظام پر اعتماد نہیں رہا۔ زیادہ جارحانہ حکومتی پالیسیاں۔ جن سے طالبان کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی خواہش اور قبیلوں کی مکمل حمایت ظاہر ہو تو مقامی لشکر ان جنگ جوؤں کو خیبر ایجنسی سے باہر نکال سکتے ہیں۔

اختتامیہ:

پشاور کے انتہائی قریب واقع ہونے اور ایک اہم تجارتی شاہراہ ہونے کے باوجود، خیبر ایجنسی کی معاشی اور سماجی صورت حال فاٹا کے دیگر علاقوں سے مختلف نہیں۔ ہمہ اقسام کی شدت پسندی، جس میں فرقہ دارانہ عصبیت اور تحریک طالبان بھی شامل ہیں، نے عدم تحفظ، معاشی ناہمواری اور غیر منصفانہ حکمرانی کے تصور کی بنا پر بے پناہ طاقت حاصل کی ہے اور اب یہ سوسائٹی کے رگ و پے میں رچ بس گئی ہے۔ ایک چیلنج تو لاقانونیت اور جنگ جوئی کے حامل گروپوں کا ہے (مقامی جنگ جو، پاکستانی طالبان، قانون کے نفاذ کے مختلف ادارے، نیٹو اور امریکی افواج) جن کے مفادات درہ خیبر سے اشیاء رسد کی نقل و حمل سے منسلک ہیں۔ ایسے پیچیدہ ماحول میں جامع حکمت عملی کی تشکیل اور نفاذ ہی بہت مشکل ہے کیونکہ مختلف گروہوں کے درمیان پہچان اور خاص خاص علاقوں پر توجہ مرتکز کرنا ہی بڑا مسئلہ ہے۔ دراصل افغانستان کی صورتِ حال کا براہِ راست اثر فاٹا کے علاقے پر پڑتا ہے۔ بہت سے مقامی قبائلیوں کا خیال ہے کہ افغانستان میں جنگ جوؤں کے کاروائیوں کی وجہ سے، خیبر پر وہاں سے بھاگ آنے والے جنگ جوؤں کا خیال رکھنے کی ذمہ داری آن پڑتی ہے۔

راحیل خاں پشتو ٹیلی وژن کے اینکر ہیں۔ وہ اسلام آباد میں مشعل ریڈیو کے چیف اور میڈیا اینڈ ریسرچ کمپنی کے سربراہ ہیں۔

MashalBooks.org

مہمند میں شدت پسندی اور تصادم

رضا خان۔اپریل 2010ء

مہمند میں بھی فاٹا کے دیگر علاقوں کی طرح، معاشی اور انتظامی مسائل کی صورتِ حال خاصی سنگین ہے، مقامی باشندوں میں صرف 27% کو پینے کے صاف پانی کی سہولت میسر ہے۔ ضلع کے سکولوں میں 21.8% بچے رجسٹرڈ ہیں اور سیکنڈری سکول میں طلبہ کی شرح خطرناک حد تک کم یعنی 3.5% (اور طالبات کی صفر فیصد) ہے۔(۲) فاٹا کے منتخب نمائندوں کا خیال ہے کہ پاکستانی حکومت مہمند میں یا فاٹا میں ترقی کے لیے کوئی منصوبہ بندی ہے ہی نہیں۔

2010ء میں حکومت نے فاٹا کے چالیس لاکھ لوگوں کے لیے صرف ایک ارب روپے (140 ملین ڈالر) مختص کیے۔ یہاں مدد کی عدم فراہمی بہت اہم مسئلہ ہے کیونکہ یہاں کے لوگوں کو یقین ہے کہ ان کی غربت دور کرنے میں حقیقی معاونت پاکستانی حکومت ہی کر سکتی ہے۔ مہمند کے لوگ خاسے مذہبی اور قدامت پسند ہیں لیکن یہ ایجنسی فاٹا کے دوسرے علاقوں کی نسبت پاکستانی معاشرے اور اس کی ثقافت سے کہیں زیادہ مربوط ہے۔ مقامی لوگ زیادہ تر دیوبندی مکتب فکر (سنی فقہ کی نسبتاً قدامت پسند سوچ) کے حامی اور عدم تشدد کے قائل ہیں۔ تاہم 1970ء کے عشرے میں جب مقامی لوگوں نے کام کی غرض سے خلیج اور عرب ممالک کا رخ کرنا شروع کیا، مہمند ایجنسی میں سلفی نظریات کی پیروی کا رجحان تیزی سے بڑھا۔ مقامی باشندوں کی اکثریت اب شریعت کے نفاذ کی بھرپور حمایت کرتی ہے لیکن کس فقہ کی شریعت؟ اس بارے میں ان میں اتفاق نہیں۔ یہاں کے نوجوان ایسے سماج میں رہ رہے ہیں جس میں (عمومی انسانی رویوں کے خلاف) روایتی ضابطہ اخلاق کی سخت پابندیاں ہوتی ہیں۔ شاید اسی تضاد کی بدولت مہمند کے بہت سے نوجوانوں کو سلفیت اور القاعدہ کے نئے اور جدید نظریات نے شدید متاثر کیا اور اب یہ ہو رہا ہے کہ عدم تشدد کی حامی تبلیغی جماعت کو، روایتی طور پر ترجیح دینے والے، اب شدت پسند گروہوں کی جانب راغب ہیں۔

بغاوت کا ڈھانچہ

فاٹا کے دوسرے علاقوں کی طرح مہمند بھی 1980ء کے عشرے کی سوویت مخالف افغان جنگ سے متاثر ہوا۔ جب افغان پناہ گزینوں کا جم غفیر مقامی معیشت اور معاشرت پر ناگہانی بوجھ بن گیا۔

تاہم دوسرے قبائلی علاقوں کے برعکس مہمند میں شدت پسندوں کی بھرتی اوران کی تربیت کے چند ہی کیمپ بن پائے تھے۔ 1989ء میں سوویت افواج کے افغانستان سے انخلا کے بعد، تحریک نفاذ شریعت محمدی جیسے مقامی شدت پسند گروپ شمالی فاٹا اور اس کے پڑوسی علاقے مالاکنڈ میں قائم ہونے لگے۔ ان تحریکوں کا مہمند پر اثر تو ضرور ہوا مگر علاقے میں ان کا کوئی خاص تنظیمی ڈھانچہ نہیں بن سکا۔

مہمند کی اپنی جنگ جویانہ روایتیں ہیں تاہم اس کا زیادہ تر تعلق صافی قبیلے سے ہے۔ شروع شروع میں پنج پیر نامی جنگ جو لیڈر رہا کرتا تھا جس نے جمیل الرحمٰن کو تربیت دی۔ اس نے 1985ء میں گلبدین حکمت یار کی حزب اسلامی چھوڑ دی اور ایک بنیاد پرست سلفی گروپ، جماعت الدعوہ میں شامل ہو گیا۔ جماعت الدعوہ میں خاصے عرب جنگ جو شامل تھے۔ سعودی اور کویتی باشندوں کی مالی معاونت سے جمیل الرحمٰن دریائے کُنڑ کی وادی میں (افغانستان میں، مہمند سے بالکل ملحق) ایک طاقت ور فورس بن گیا۔ وہ افغانستان کی وادی (Pech) میں پلا بڑھا اور 1979ء میں افغان کمیونسٹ حکومت کے خلاف بغاوت میں اس نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ اور اس کی تحریک نے مقامی کنٹرول سنبھال لیا تھا مگر 1991ء میں ایک مصری گن مین کے ہاتھوں قتل ہونے کے بعد، مقامی کنٹرول دوبارہ جمیل الرحمٰن کے قائد گلبدین حکمت یار کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ حزب اسلامی اور سلفی گروہ اگرچہ پاکستان میں اسلامی حکومت کے قیام کے لیے متفق الرائے ہیں تاہم جمیل الرحمٰن کی موت کے بعد کئی عملی معاملات اور اختیارات کے سلسلے میں، ان میں باہمی جھڑپیں ہوتی رہی ہیں۔ موجودہ طالبا کمانڈر عمر خالد کا تعلق صافی قبیلے سے ہے اور اس کی بہت سے سرگرمیوں اور طور طریقوں میں جمیل الرحمٰن کا رنگ جھلکتا ہے۔

(۱) قبیلہ: مہمند............شاخیں: ترک زئی، حلیم زئی، خوائزئی، بائزئی۔

(۲) قبیلہ: صافی............شاخیں: قندھاری، گرباز، مسعود، شنواری۔

(۳) عثمان خیل............شاخیں: عنبراتان خیل، لامن اتان خیل۔

نائن الیون کے بعد، مہمند میں ابھرنے والی شدت پسندی کی لہر شمالی اور جنوبی وزیرستان میں قبائلی طالبان کے 2004ء میں نمودار ہونے کے بعد آئی۔ یہ دونوں علاقے مہمند کے جنوب میں سینکڑوں میل تک پھیلے ہوئے ہیں، اسی وجہ سے جنگ جو مہمند کی طرف زیادہ نہیں آپائے۔ یہاں طالبان کا نفوذ پڑوسی مالاکنڈ ڈویژن کی طرف سے ہوا جہاں اسلامی شدت پسند نائن الیون یا افغانستان میں طالبان کے ظہور سے بھی پہلے موجود تھے۔ ان میں سے اہم ترین جنگ جو گروپ تحریک نفاذ شریعت محمدی تھا جو صوفی محمد نے 1989ء میں بنائی تھی۔ باجوڑ اس کا مضبوط گڑھ تھا اور

مہمند میں بھی اس کے اثرات تھے۔ افغانستان پر امریکی حملے کے فوراً بعد صوفی محمد نے مالاکنڈ، باجوڑ اور مہمند سے دس ہزار مسلح رضاکار اکٹھے کیے تاکہ امریکی اور نیٹو افواج سے جنگ کی جاسکے لیکن اس کی یہ مہم بری طرح ناکام ہوگئی۔ اس کے غیر تربیت یافتہ جنگ جو، امریکی افواج کی جدید حربی صلاحیتوں کے آگے ٹک نہ سکے اور ہزاروں لوگ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اسی وجہ سے صوفی محمد مالاکنڈ، باجوڑ اور مہمند کے قبائل میں اپنی حمایت سے محروم ہوگیا۔

تاہم اس ناکامی کے باوجود، 2006ء میں مقامی طالبان مہمند میں ایک اہم طاقت بن کر ابھرے، جب انہوں نے علاقے میں پٹرولنگ شروع کر دی اور مقامی لوگوں کو اپنے بنائے ہوئے ضابطہ اخلاق پر عمل کرنے پر مجبور کرنے لگے۔ 2006ء سے پہلے مہمند کے باشندے شدت پسندی کو زیادہ خطرہ نہیں سمجھتے تھے کیونکہ وہ پورے مہمند میں کاروائیاں کرنے کے باوجود صافی، خوائزئی اور بائزئی میں مرتکز تھے۔ تاہم جون 2006ء میں شدت پسند زیادہ موثر اور منظم ہو گئے۔ انہوں نے مہمند کے ایک جرگے میں بم کا دھاکہ کر کے اپنی اہمیت جتوائی۔ وہاں ایک رقعہ پایا گیا جس میں قبائلی عمائدین کو متنبہ کیا گیا تھا کہ وہ حکومت کی حمایت میں شدت پسندوں کے خلاف جرگے بلانا بند کر دیں۔

جولائی 2007ء میں اسلام آباد کی لال مسجد کے سانحے کے بعد مہمند میں تشدد کی لہر ابھرنا شروع ہوئی۔ ہوا یوں کہ حکومت نے اسلام آباد شہر کے عین درمیان واقع لال مسجد پر (جو شہر میں شدت پسندوں کا اہم گڑھ بن گئی تھی) پر حملہ کر دیا۔ اسلام آباد میں لڑنے والے جنگ جوؤں سے اظہار یک جہتی کے طور پر، دو سو جنگ جوؤں نے ماضی کے برطانیہ مخالف، حریت پسند حاجی صاحب تورنگ زئی کے مزار اور مہمند سے 25 میل دور واقع غازی آباد کی ایک مسجد پر قبضہ کر لیا۔ شدت پسندوں نے گاؤں کی مسجد کا نام، اسلام آباد کی مسجد میں لڑنے والوں سے یک جہتی کے لیے، لال مسجد رکھ دیا۔ گروپ نے علاقے میں عدالتی اختیارات سنبھالنے کی بھی کوشش کی اور نتیجتاً 12 اکتوبر 2007ء کو چھ مقامی مجرموں کے سر بھی قلم کر دیے۔

سر قلم کرنے کی اس واردات کے نتیجے میں مہمند کے موجودہ کمانڈ عمر خالد (طالبان) کو آگے آنے کا موقع ملا۔ اس نے اپنی تحریک نو مہمند کی تاریخی جنگ جو قیادت اور علاقے میں پاکستان کے لیے پائی جانے والی منفی مصیبت کو یہ کہہ کر باہم منسلک کیا کہ ''ہم حاجی تورنگ زئی اور لال مسجد کے خطیب غازی عبدالرشید کے مشن کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں۔ دسمبر 2007ء میں بیت اللہ محسود نے تحریک طالبان پاکستان بنائی تو فاٹا میں پاکستان مخالف تمام جنگ جو گروعمر خالد سمیت اس کی چھتری تلے اکٹھے ہو گئے۔ تحریک کی تشکیل نے عمر خالد کے طالبا کو گویا تقویت بخش دی اور

اس نے ایجنسی میں اپنی عدالتیں قائم کر کے سزائیں سنانا شروع کر دیں۔ زنا کا ایک فیصلہ بہت مشہور ہوا جس میں مرد اور عورت کو سنگسار کرنے کی سزا سنائی گئی۔ وہ جوڑا قبائلی علاقے سے فرار ہو کر نوشہرہ چلا گیا، جہاں فوجی چھاؤنی بھی ہے۔ عمر خالد کے جنگ جو اس جوڑے کو نوشہرہ واپس مہمند لائے اور انھیں بر سر عام سنگسار کیا۔ مہمند سے بہت دور، ایک فوجی چھاؤنی کے مرکز نوشہرہ سے اس جوڑے کا عمر خالد کے گروہ کے ذریعے واپس لے جایا جانا، اس گروہ کی رسائی کا کمال ہے۔ عمر خالد کی طالبان میں شمولیت کے باوجود، مقامی طالبان کی سرگرمیاں اپنے طور پر بھی جاری رہیں اور ان کارروائیوں میں جنوبی وزیرستان کی تحریک سے ان کا رابطہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ عمر نے بہرحال مہمند کے طالبان پر اپنا کنٹرول قائم رکھا ہے اور جنوبی وزیرستان میں تحریک کے لیڈروں پر فوجی حملوں کے باوجود اس کی اپنی عملی کارروائیوں میں کوئی خلل اندازی دکھائی نہیں دیتی۔

سیاست:۔ مہمند کے طالبان پاکستان کی طاقت ور مذہبی سیاسی جماعتوں سے منسلک ہیں۔ جمعیت علمائے اسلام (فضل الرحمٰن گروپ) اور جماعت اسلامی۔ 2002ء میں ان دونوں پارٹیوں نے دیگر مذہبی جماعتوں کے ساتھ مل کر متحدہ مجلس عمل تشکیل دی تھی۔ یہ اتحاد مہمند کی قومی اسمبلی کی ساری نشستیں جیت گیا تھا۔ افغانستان میں امریکی اور نیٹو لڑائی کے شدید مخالف اس اتحاد پر بعد ازاں صوبہ کے باشندوں نے کرپشن اور شدت پسندی کے حوالے سے ایم ایم اے پر شدید تنقید کی۔

بعض مشاہدہ کاروں کا خیال ہے کہ پاکستانی آئی ایس آئی نے عمر خالد کا باقاعدہ امیج اس لیے بنایا تھا تا کہ ایم ایم اے کے سیاسی مخالفتوں کو کمزور کیا جا سکے۔ اس صورتِ حال سے ظاہر ہوتا ہے کہ آئی ایس آئی سیکولر اور قوم پرست پختون (جماعت اے این پی کے) نظریات کی مخالف تھی کیونکہ محسوس یہ ہو رہا تھا کہ فروری 2008ء کے الیکشن میں اے این پی مجلس عمل سے اقتدار چھین لے گی۔

آئی ایس آئی اے این پی کو اس کے تاریخی تناظر میں بھارت کی حامی جماعت سمجھتی ہے۔ یاد رہے کہ جماعت کے بانی خان غفار خان نے آزادی کی جنگ میں نیشنل کانگریس کی حمایت کی تھی جو اکھنڈ بھارت کی پرچارک تھی۔ اسی نظریے کے تحت آئی ایس آئی نے علاقے میں اسلامی تحریکوں کو آگے بڑھایا تا کہ ایم ایم اے کی انتخابی جیت کے امکانات کو بڑھایا جا سکے۔ آئی ایس آئی کے مفادات کے مطابق ایم ایم اے اس کے لیے زیادہ قابل قبول تھی۔

وجوہ کچھ بھی رہی ہوں 2008ء کے انتخابات میں اے این پی، اپنی جیت کے بعد، فاٹا سے تعلق رکھنے والے طالبان کے مسلسل حملوں کی زد میں رہی ہے۔ 2009ء کے شروع میں، بیت اللہ محسود نے بھی اے این پی لیڈر شپ کو، 5 دن کے اندر اندر حکومت سے مستعفی نہ ہونے کی

MashalBooks.org

صورت میں خطرناک نتائج کی دھمکی دی تھی۔ انہوں نے اس دھمی پر عمل بھی کیا اور سینکڑوں اے این پی کارکنوں کو، جن میں ان کے اراکین قومی وصوبائی اسمبلی بھی شامل ہیں، قتل کر ڈالا۔

اہداف

مہمند میں شدت پسند، علیحدگی کے حامی نہیں۔ انہیں پتہ ہے کہ اتنی کٹھن صورت حال میں ایک چھوٹی سی امارت کو چلانا ناممکنات میں سے ہے۔ تحریک طالبان پاکستان کے دوسرے گروہوں کی طرح وہ بھی پورے پاکستان میں شریعت کا نفاذ چاہتے ہیں، ان کے خیال میں ایسی حکومت علما کی زیر قیادت ہو گی۔ ظاہر ہے طالبان کی تحریک کے ہراول ملاؤں کے سوا اور کون ریاست کا انتظام چلا سکے گا۔ وہ افغانستان میں امریکی اور نیٹو افواج کی کارروائیوں کے خلاف القاعدہ اور طالبان کی جدوجہد کے حامی ہیں۔ وہ عراق اور فلسطین میں مسلح بغاوتوں کے ساتھ ہیں۔ اگرچہ اس طرح کے جوشیلے بیانات دینے میں ان کا ایک مقصد مقامی باشندوں کی حمایت جیتنا بھی ہے۔ ان کا فوری مقصد مہمند میں اسلامی امارت قائم کرنا ہے جو پورے ملک کے لیے ایک مثال بن سکے۔

اصولی طور پر ان کا یہ ہدف پاکستان کی آزادی کی تحریک سے قطعی متصادم نہیں کیونکہ اس کا مقصد بھی مسلمانوں کے لیے ایسا وطن حاصل کرنا تھا جہاں وہ اپنے نظریات اور قوانین کے تحت زندگی گزار سکیں لیکن عملی طور پر مہمند طالبان شریعت کی ایک محدود تفہیم کے قائل ہیں جس میں لوگوں کے منتخب نمائندوں کے لیے اقتدار کی کوئی گنجائش نہیں۔

تنظیم

مہمند میں طالبان کا تنظیمی ڈھانچہ کچھ اس طرح ہے: امیر......عمر خالد، ڈپٹی کمانڈر......قاری شکیل، ترجمان......اسد سعید اور مہمند کی سات تحصیلوں کے مقامی امیر (ان لوگوں کے نام کبھی ظاہر نہیں کیے گئے، دوسرے طالبان شدت پسند مختلف جگہوں پر اپنے مختلف نام استعمال کرتے ہیں)

عمر خالد:۔ عمر خالد کا اصل نام عبدالولی ہے، قندھار کا باشندہ ہے اور صافی قبیلے کی شاخ قندھاری سے تعلق رکھتا ہے۔ صافی خود کو مہمند قبیلے کا حصہ سمجھتے ہیں لیکن مہمند کے قبائلی انھیں اسی نسل کا نہیں مانتے اور قبیلے کی دوسری شاخوں کی نسبت انھیں زیادہ مذہبی اور قدامت پرست سمجھا جاتا ہے۔ صافیوں کی آبادی بھی دوسری قبائلی شاخوں کی نسبت خاصی کم ہے۔ ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ قبائلی صافیوں کو (اس علاقے کے قبائل میں) سب سے بعد میں مسلمان ہونے والے لوگ سمجھتے ہیں۔

تیس سالہ خالد نے تعلیم اپنے گاؤں میں ہی پائی۔ جوانی میں اس نے حرکت المجاہدین کے ساتھ کام کیا۔ (یہ گروپ کشمیر میں بھارتی فوج سے لڑنے کے لیے معروف ہے)۔ ۱۹۹۰ء کے عشرے میں اس نے کشمیر کا دورہ کیا پھر افغانستان میں شمالی اتحاد کے خلاف لڑنے کے لیے طالبان سے مل گیا۔ کشمیر میں اس کی کاروائیوں کا کچھ پتہ نہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ جنگ جو مختلف جگہوں پر مختلف ناموں سے کام کرتے ہیں۔ تاہم لگتا ہے کہ عمر خالد کا افغانستان میں طالبان کی نسبت کشمیری مجاہدین کے ساتھ زیادہ قریبی تعلق تھا۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ نائن الیون کے بعد اپنے لڑاکوں کے ساتھ افغانستان گیا تھا تا کہ طالبان کے ساتھ دشمن سے جنگ میں شامل ہو سکے۔

عمر خالد کی مہم میں بھی اگر چہ صوفی محمد کے سے انداز جھلکتے ہیں، دونوں تحریکیں کم وبیش ایک ہی وقت میں شروع ہوئی تھیں۔ تاہم خالد نے اپنی دیرینہ خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جولائی 2007ء میں لال مسجد کے قبضے سے فائدہ اٹھایا اور شدت پسند کمانڈر کے روپ میں ظاہر ہوا۔ ان دنوں اس نے طالبان یا القاعدہ سے لاتعلقی کا اظہار کیا تھا لیکن ساتھ ہی کہا تھا۔

''اگر طالبان ہمارے پاس آئے تو ہم ان کا خیر مقدم کریں گے اور لال مسجد کے امام غازی عبدالرشید کے مشن کو پورا کرنے کے لیے ہمیں اپنی جانیں بھی قربان کرنا پڑیں تو دریغ نہیں کریں گے۔''

مہمند کے طالبان پر کنٹرول قائم کرنے کے لیے خالد کو لڑائیاں بھی کرنا پڑیں۔ اس نے اپنے مخالف شاہ صاحب کے گروپ کا خاتمہ کیا۔ شاہ صاحب سلفی عقیدے کے تھے اور ایک قومی دھارے کی جماعت ''جمعیت اہل حدیث'' سے ان کا تعلق تھا۔ جمعیت نے الزام لگایا کہ عمر خالد کے طالبان گروپ نے جان بوجھ کر شہریوں کو مار ڈالنے کی اجازت دی ہے۔ لال مسجد کے واقعے اور خالد کے منظر عام پر آنے سے پہلے شاہ صاحب کا گروپ مہمند کا سب سے بڑا گروپ تھا اور ان کی تمام تر توجہ امریکی اور نیٹو افواج کے خلاف کاروائیوں پر مرتکز تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے گروپ میں کشمیری جہادی گروہ لشکر طیبہ کے لوگ بھی شامل تھے۔

استاد یاسر سے استفادہ کے باوجود عمر خالد نے، طالبان کمانڈر کے طور پر، شاہ صاحب کے گروپ پر 2008ء میں حملہ کیا۔ اس حملے میں شاہ صاحب جاں بحق ہو گئے اور ان کی تنظیم کا صفایا کر دیا گیا۔ تنظیم کو دوبارہ بحال کرنے کی کوششیں ناکامی سے دوچار ہوئیں۔ عمر خالد کے ہاتھوں شاہ صاحب کا خاتمہ ایک اہم واقعہ تھا کیونکہ بیت اللہ محسود (TTP) ایسے تصادم کے خلاف تھا اور طالبان گروہوں کے مابین لڑائی کا خاتمہ چاہتا تھا۔

قاری شکیل اور اسد سعید:۔ یہ دونوں عمر خالد کے اہم ترین نائب کمانڈر ہیں۔ قاری شکیل

مہمند کے مچنی علاقے سے ہے اور مبینہ طور پر وہ پہلے جرائم پیشہ رہا ہے۔ اسعد سعید نے خیبر میڈیکل کالج پشاور سے میڈیسن کی ڈگری لی۔ وہ نظریاتی طور پر متشدد ہے اور القاعدہ کے تکفیری نظریے کا حامی ہے۔

مہمند میں طالبان کی استعداد:

عمر خالد کا دعویٰ ہے کہ ڈھائی ہزار جنگ جو اس کی پشت پر ہیں۔ لیکن مہمند میں وہ عوامی تائید سے محروم ہیں تاہم مضبوط اپوزیشن نہ ہونے کی وجہ سے اس کے گروپ کو خاصی طاقت حاصل ہوگئی ہے۔ خالد کے ساتھی ہر جگہ موجود ہیں اور سات میں سے تین تحصیلوں خوازئی، بائزئی، لکارو اور عنبر پر اسے مکمل کنٹرول حاصل ہے۔ یہ دور دراز علاقے ہیں تاہم لکارو اور عنبر افغان سرحد کے بالکل ساتھ ہیں۔ لکارو صافی قبیلے کا بھی گڑھ ہے اور باجوڑ سے ملا ہوا ہے۔ جو قبائلی علاقے میں طالبان کا ایک اور بڑا گڑھ ہے۔

قبائلی گروپوں پر طالبان کے حملوں نے علاقے میں منفی اثرات ڈالے ہیں۔ کئی ایک نے ان سے مقابلے کے لیے لشکر ترتیب دے لیے ہیں۔ مقامی لشکروں کے بہت سے اہم کمانڈروں کی موت کے باوجود، مقامی مزاحمت، پاکستانی فوج کی کاروائیوں کی نسبت کہیں زیادہ طاقت ور رہی ہے۔ 17 اگست 2009ء کو لشکریوں نے طابان کے ترجمان ملا محمد عمر کو پکڑ لیا جس نے 1994ء میں صوفی محمد کے گروپ میں شمولیت کی تھی اور تحریک طالبان پاکستان کی پہچان بن گیا تھا۔ گرفتاری سے قبل، وہ مسلسل میڈیا سے رابطے میں تھا تا کہ پاکستان بھر میں ہونے والے وسیع پیمانے کے تمام حملوں کا کریڈٹ طالبان کے لیے یقینی بنا سکے۔

کوئٹہ شوریٰ طالبان:

ملا عمر مہمند کے تمام شدت پسندوں کے لیے روحانی قوت کا ایک اہم مرکز ہے لیکن وہ طالبان لیڈر کی عملی ہدایات پر عموماً کان نہیں دھرتے بلکہ بعض ایسی حرکتیں بھی کر جاتے ہیں جن سے کوئٹہ شوریٰ پہ زد پڑتی ہے۔ مہمند کے شدت پسند عموماً کہتے ہیں کہ ملا عمر ان کا عظیم لیڈر ہے اور وہ خود کو اس کی سیاسی اور مذہبی تحریک کا ایک حصہ سمجھتے ہیں۔ تاہم مہمند کے شدت پسندوں پر ملا عمر کا کوئی آپریشنل کنٹرول نہیں ہے۔ دراصل شہریوں پر حملے اور ان کے سر قلم کرنے کے معاملات انھیں کوئٹہ شوریٰ طالبان کے ماڈل سے مختلف کرتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ کوئٹہ ان سے 850 میل دور ہے اور جدید کمانڈ اینڈ کنٹرول سسٹم کے بغیر، انھیں ہدایات دینا کوئٹہ شوریٰ کے لیے بہت مشکل ہے۔ مہمند کے طالبان کو کچھ مدد افغانستان کے طالبان لیڈر رضیا الرحمٰن سے بھی

ملتی رہتی ہے۔

حزب اسلامی (گلبدین)

حزب اسلامی افغانستان کے کُنڑ، ننگر ہار اور کاپیسہ (مہمند کے قریبی افغان صوبے) میں سرگرم عمل ہے تاہم مہمند طالبان کے ان کے ساتھ براہ راستہ رابطے نہیں ہیں۔ حکمت یار کی حزب اسلامی دیگر طالبان کی طرح مذہبی انتہا پسندی اور شدت پسند طریقوں سے بچنے کی کوشش کرتی ہے۔ مثلاً حال ہی میں ایک پمفلٹ مہمند میں تقسیم ہوا جس میں سوال اٹھایا گیا کہ آیا اسے وہابی ہو جانا چاہیے یا مذہبی ہی رہنا چاہیے۔ یہ پمفلٹ اس وقت شائع ہوا جب حزب اسلامی کے افغان حکومت سے 2010ء کے شروع میں مذاکرات ہونے ہی والے تھے۔ حکمت یار کا کہنا تھا کہ شدت پسندی کی کاروائیاں سلفی گروہ کررہے تھے اور سعودی حکومت کے بعض عناصر، کئی ایک عرب خیراتی تنظیمیں اور پاکستانی خفیہ اداروں کے کچھ حصے ان کی مدد کررہے ہیں ممکن ہے حکمت یار یہ بتانا چاہتا ہو کہ وہ ایک قابل اعتماد افغان سیاست دان ہے اور اس کا القاعدہ اور دوسرے شدت پسند تحریکوں سے کوئی تعلق نہیں۔

غیر ملکی شدت پسند:

مہمند کے دور دراز علاقوں کے لوگوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے مقامی جنگ جوؤں کے ساتھ بہت سے غیر ملکی شدت پسندوں کو بھی دیکھا ہے لیکن ان کی تعداد اور ممکنہ لوکیشن کے بارے میں یقین سے نہیں بتا سکتے۔ کیونکہ انھیں چھوٹے چھوٹے گروپوں میں متحرک دیکھا گیا ہے۔ 11 جون 2001ء کو چھ سو جنگ جوؤں نے جن میں غیر ملکی بھی شامل تھے، مہمند میں فرنٹیئر کور کی کئی چیک پوسٹوں پر حملہ کیا تھا۔ رات بھر کی اس لڑائی میں کور کے دس سپاہی اور 40 جنگ جو مارے گئے تھے۔

ان میں زیادہ تر شدت پسند افغان سرحد کی طرف سے آئے تھے اور مقامی طالبان کی اس کاروائی میں شامل ہوئے تھے۔ اسی مشترکہ فورس نے بعد ازاں سرحد پر واقع فرنٹیئر کور کے ایک ٹھکانے پر بھی حملہ کیا تھا۔

القاعدہ کے لیڈروں نے مہمند کو پناہ گاہ کے طور پر بھی استعمال کیا ہے اگرچہ بظاہر یہ غیر ملکی شدت پسندوں کا گڑھ نہیں ہے۔ ستمبر 2008ء میں وزیر داخلہ رحمان ملک نے انکشاف کیا تھا کہ القاعدہ کا نائب امیر ایمن الظواہری، مہمند ایجنسی میں فوجی ایکشن کے دوران بال بال بچ نکلا تھا۔

پاکستانی فوجی آپریشنز:

2007ء سے پہلے پاکستان فوج نے مہمند میں سخت فوجی آپریشنز نہیں کیے تھے۔ ایک وجہ

یہ تھی کہ شاہ صاحب کی سربراہی میں جنگ جو گروپ وہاں حاوی تھا جس کی تمام تر توجہ افغانستان میں کاروائیوں پر مرکوز تھی۔ خالد عمر کے منظر عام پر آنے کے بعد صورتِ حال بدل گئی اور دسمبر 2007ء میں اس کے تحریک طالبان پاکستان میں شامل ہونے کے بعد معاملہ اور بھی بگڑ گیا۔ اگرچہ پاکستانی فوج نے مہمند میں کوئی خاص کاروائی نہیں کی تھی مگر عمر خالد نے ایجنسی میں حکومتی نمائندوں کو نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ تاہم مئی 2008ء میں مقامی حکومتی نمائندوں اور طالبان جنگ جوؤں کے درمیان معاہدہ طے پا گیا۔

امن کے معاہدے اور شاہ صاحب کے قتل نے عمر خالد کے طالبان کی علاقے میں حاکمیت کو اور مضبوط کر دیا۔ اور اس نے پاکستانی ریاست کے متوازی انتظامی اہلیت قائم کر لی۔ معاہدے کے مطابق خالد عمر کو حکومت اور افواج پر حملے روک دینا تھے اور حکومت کی جانب سے اسے اجازت دے دی گئی کہ ''بین الاقوامی اداروں سے فنڈز لینے والی غیر سرکاری تنظیموں کی سرگرمیوں میں باقاعدگی پیدا کرے تاہم کسی بھی مذہبی تنظیم یا مدرسوں کے چلانے کی اجازت نہیں دی گئی۔

اکتوبر 2008ء میں سیاسی پریشر نے افواج کو مہمند میں طالبان کے خلاف آپریشن کرنے پر مجبور کر دیا۔ گزشتہ کیے گئے آپریشنز بے دلی اور ناقص منصوبہ بندی کے ساتھ کیے گئے تھے۔ کئی کاروائیوں میں تو شدت پسند صاف بچ نکلے اور بے گناہ شہری مارے گئے لیکن 2008ء کا آپریشن بہت جارحانہ تھا۔ پاک فوج کے مطابق اس کاروائی میں سینئر طالبان لیڈروں سمیت بہت سے طالبان مارے گئے۔ مئی 2009ء تک علاقے کے بہت سے طالبان نائب کمانڈروں نے حکومت کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے جن میں یاسر سعید (صافی تحصیل کا پہلا کمانڈر) بھی شامل تھا۔ سعید نے دعویٰ کیا کہ وہ بے خانماں لوگوں (IPPS) کی وجہ سے ہتھیار ڈال رہا ہے تاکہ ان کی مشکلات کا مداوا ہو سکے لیکن درحقیقت وہ پاک فوج کے شدید دباؤ میں آ گیا تھا۔

ستمبر 2009ء تک پاک فوج کے دعوے کے مطابق مہمند کا %80 علاقہ شدت پسندوں سے واگزار کرا لیا گیا تھا۔ البتہ افغان سرحد کے قریب کے علاقے رہ گئے کیونکہ وہ جنگ جوؤں کا زبردست گڑھ تھے۔ بہرحال مہمند میں طالبان کو شکست نہیں دی جا سکی اور مہمند کے بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ طالبان گروپ وہاں دوبارہ منظم ہو رہے ہیں۔ ہزاروں بے خانماں افراد پشاور کے نزدیک خیموں میں رہ رہے ہیں۔ انھیں خوف ہے کہ اگر وہ گھروں کو لوٹے تو ایک بار پھر قتل و غارت اور ٹارگٹ کلنگ کا نشانہ بننے پر مجبور ہوں گے۔

رضا خاں پشتو اخبار نویس ہیں وہ کئی سرکاری محکموں میں کام کرتے رہے ہیں۔

MashalBooks.org

جنوبی وزیرستان میں شدت پسندی اور تصادم

منصور خان محسود، اپریل 2010ء

گیارہ ستمبر 2001ء کے بعد فاٹا کے تمام علاقوں اور قبائل میں جنوبی وزیرستان امریکہ کے لیے سب سے زیادہ اہمیت کا حامل رہا ہے یہ چھ ہزار چھ سو انیس کلومیٹر پر پھیلا ہوا ہے اور انتہائی جنوب کی جانب، پاکستان کی وسیع ترین قبائلی ایجنسی ہے۔

پاکستان بننے کے بعد، (1947) جنوبی وزیرستان میں 76-1975ء میں ملا نور محمد وزیر کی بغاوت کے استثنا کے علاوہ، امن وامان ہی رہا۔ ملا نور کی بغاوت کو فوجی آپریشن کے ذریعے کچل دیا گیا تھا۔ تاہم 1978ء میں کمیونسٹ انقلاب (افغانستان) کے خلاف افغانستان میں بغاوت اور بعدازاں سوویت مخالف جہاد نے سرحدی قبائلی ایجنسی جنوبی وزیرستان کو بری طرح متاثر کیا ہزاروں لاکھوں افغان مہاجرین کا سیلاب وزیرستان کے پناہ گزین کیمپوں میں آیا وہیں کچھ لوگوں نے افغان مجاہدین یا جہاد کے لیے تربیتی کیمپ قائم کر لیے ان مہاجرین نے مقامی لوگوں کو بتایا کہ سوویت فوجی اور ان کے افغان اتحاد کس طرح افغان مسلمانوں کی بے عزتی کر رہے ہیں، ظلم وستم کا نشانہ بنا رہے ہیں اور اس طرح مقامی لوگوں کے دلوں میں سوویت فوج اور ان کی کٹھ پتلی افغان حکومت کے لیے نفرت پیدا کی۔ وزیرستان سے بہت سے نوجوان سوویت فوجوں سے لڑنے کے لیے افغانستان چلے گئے۔ یہ وہ رجحان تھا جس کی اس وقت پاکستان اور امریکی خفیہ ایجنسیوں نے بھرپور سپورٹ کی۔ انہوں نے سوویت یونین کے خلاف باقاعدہ پراپیگنڈہ مہم شروع کردی تاکہ جنگ جوؤں کی بھرتی کی جا سکے۔

جنوبی وزیرستان کے تقریباً تمام لوگ/سنی عقیدہ کے حامل ہیں اور ان میں سے اکثر بالکل جاہل ہیں۔ (قدامت پسند) بہت سے لوگ ان مولویوں کے پیروکار ہیں جنھیں سوویت مخالف جہاد میں حکومت پاکستان کی طرف سے مالی امداد دی جاتی رہی۔ اس زمانے میں ان مذہبی

MashalBooks.org

رہنماؤں نے قبائلی علاقوں میں لاتعداد مدرسے قائم کر لیے جہاں نوجوان محسود اور وزیر قبائل کو اسلامی جہاد کے نظریے کی تعلیم دی جانے لگی۔ ان مدرسوں کو خلیجی ممالک کی حکومتوں بالخصوص سعودی عرب سے بے پناہ مالی امداد ملی جس سے جنوبی وزیرستان میں علماء کے تشخص اور سٹیٹس کو زبردست اہمیت حاصل ہوگئی ان میں بہت سے مدرسے جمعیت علمائے اسلام سے منسلک تھے۔ یہ جماعت 1950ء کی دہائی میں تشکیل دی گئی تھی اور قبائلی علاقوں میں خاصی مقبول ہے۔ 1989ء میں سوویت افواج کے انخلا کے بعد افغان جہاد میں شریک بہت سے مقامی قبائلی وطن واپس آئے تو اپنے ساتھ ہی جہادی نظریات بھی لائے۔ ان میں سے بعض مقبوضہ کشمیر بھارتی فوجوں سے لڑنے چلے گئے۔ 1994ء میں جونہی طالبان نے افغانستان میں طاقت پکڑنا شروع کی تو بہت سے جہادیوں نے افغانستان میں ان کے ساتھ شمولیت اختیار کر لی طالبان کی افغان حکومت قائم ہوئی تو ابتداء میں اسے وزیرستان میں مقبولیت ملی۔ قبائل، طالبان کی حکومت کے نفاذ شریعت (اور اپنے زیر کنٹرول علاقوں میں امن وامان) کے اقدامات اور اسلامی حکومت کی شکل سے بہت متاثر ہوئے۔ بہت سے لوگوں نے افغان طالبان سے اپنے تعلقات استوار رکھے اور آہستہ آہستہ طالبان کے نظریات کو وزیرستان میں متعارف کرانے لگے۔ تاہم 1996ء اور 2001ء کے درمیان جنوبی وزیرستان کے لوگوں کے طالبان حکمرانوں سے زیادہ تعلقات نہیں تھے۔

جنوبی وزیرستان میں حالات نے خطرناک صورت اس وقت اختیار کی جب امریکی اور نیٹو افواج نے اکتوبر 2001ء میں افغانستان پر حملہ کر دیا۔ نائن الیون کے افسوسناک واقعے کے بعد جب افغانستان نے القاعدہ لیڈر بن لادن کو امریکہ کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا تھا، جسے اس غیر انسانی المیے کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا تھا۔ ہزارہا افغان طالبان، عرب القاعدہ اور ان کے غیر ملکی ساتھی، جن میں ازبک، چیچن اور تاجک شامل تھے، پناہ لینے کے لیے جنوبی وزیرستان آ گئے۔ وہ اسے امریکی اور نیٹو فوج کے خلاف اپنی مزاحمت کا اڈا بھی بنانا چاہتے تھے۔ مقامی قبائل نے، ان کے مقصد کی ہمدردی میں انھیں پناہ بھی دی اور جنگ جوؤں کو امداد بھی فراہم کی جبکہ مقامی جنگ جوؤں نے، جو افغان طالبان حکومت سے متعلق رہ چکے تھے، پورے جنوبی وزیرستان میں مقامی طالبان گروپس منظم کرنے شروع کر دیے۔ ان میں عبداللہ محسود، بیت اللہ محسود، نیک محمد، حاجی شریف اور حاجی عمر شامل تھے۔

نیک محمد احمد زئی وزیر قبیلے کا تھا اور تحریک طالبان میں 1993ء میں شامل ہوا اور اٹھارہ سال کی عمر میں جنوبی وزیرستان میں طالبان کا پہلا امیر بنا دیا گیا۔ بعد میں اس نے شمالی اتحاد سے جنگ کی اور افغانستان پر امریکی حملے کے بعد، کابل کے نزدیک بگرام ائیر بیس پر بھی کاروائیاں کیں۔

طالبان کی حکومت کے خاتمے کے بعد (نیک محمد) 2001ء دسمبر میں جنوبی وزیرستان واپس لوٹا اور یہاں اس نے مقامی طالبان کو منظم کرنا شروع کر دیا۔ کچھ سومقامی وزیر قبائل کو ساتھ ملا کر 2003ء میں وہ افغانستان میں امریکی فوج کے خلاف کاروائیاں کرنے لگا۔ حاجی عمر، حاجی شریف اور مولوی عباس جیسے مجاہد کمانڈر اس کی حمایت میں تھے۔ نیک محمد نے افغانستان سے بھاگنے والے افغان جنگ جوؤں، عرب القاعدہ شدت پسندوں اور (طاہر یلداشیف کی) ازبک تحریک اسلامی کے اراکین کو اپنے ہاں پناہ دی۔ مختلف طرح کے شدت پسندوں کے جنوبی وزیرستان میں اکٹھ اور ان کی جنگ جویانہ کاروائیوں پر امریکی حکومت نے پاکستان پر شدید دباؤ ڈالا جس کے نتیجے میں حکومت نے پہلا فوجی آپریشن وانا میں 2004ء میں کیا۔ طالبان اور ان کے غیر ملکی جنگ جو ساتھیوں سے مقابلے کے لیے سات ہزار فوجی علاقے میں بھیجے گئے۔

نیک محمد جنگ جوؤں کا امیر تھا جبکہ بیت اللہ محسود، عبداللہ محسود اور ان کے ساتھی انکی بھرپور معاونت کر رہے تھے، کئی ہفتوں کی شدید جنگ کے بعد، حکومت کو نیک محمد کے شدت پسندوں سے صلح کا معاہدہ کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ نام ونہاد شکئی معاہدے کے تحت، نیک محمد نے ہتھیار ڈالنے اور علاقے میں موجود غیر ملکیوں کو رجسٹر کرانے پر اتفاق کیا اور حکومت نے مقامی طالبان کو رقم فراہم کرنے کا وعدہ کیا تاکہ وہ لوگ القاعدہ سے لیے ہوئے قرضے واپس کر سکیں۔ معاہدہ جلد ہی توٹ گیا۔ نیک محمد کچھ ہی دنوں بعد ایک امریکی ڈرون حملے میں مارا گیا۔ وہ اس وقت سیٹلائٹ فون کے ذریعے ایک غیر فلکی نیوز ایجنسی کو انٹرویو دے رہا تھا کرشماتی نیک محمد وزیرستان میں ایک ہیرو کی شکل اختیار کر گیا۔ وہ مردآہن جس نے پاکستانی فوج کو شکست دی۔ محسود اور وزیر قبائل کے ہزارہا لوگ وہاں موجود جنگ جوؤں کے ساتھ شامل ہونے، جنوبی وزیرستان پہنچنے لگے۔

نیک محمد کی موت کے بعد، حاجی عمر وانا کے طالبان کا امیر بن گیا۔ اس نے بھی جنوبی وزیرستان میں موجود ازبک اور دوسرے غیر ملکی شدت پسندوں کی حمایت جاری رکھی۔ ازبک سمجھتے تھے کہ سرحد پار افغانستان میں امریکی اور نیٹو فوج پر حملے کرنے کے بجائے پاکستانی حکومت اور فوج سے جنگ کیا جانا زیادہ اہم ہے۔ اسی بنا پر طالبان کمانڈر ملا نذیر اور ان کے درمیان تنازعہ پیدا ہو گیا اور اس نے غیر ملکی شدت پسندوں اور ان کے حامی حاجی عمر اور حاجی شریف کو، اپریل 2007ء میں اپنے گروپ سے نکال دیا۔ ازبکوں نے اس وقت جنوبی وزیرستان میں محسود قبیلے کے زیر کنٹرول علاقے میں پناہ لی جہاں اس وقت تک عبداللہ محسود اور بیت اللہ محسود مقامی طالبان تحریک منظم کر چکے تھے جو مغرب مخالف ہونے کے ساتھ ساتھ پاکستان مخالف بھی تھی۔ یہ گروپ سرحد

پار امریکی اور نیٹو افواج کے خلاف کاروائیاں کرنے لگے جبکہ ان کے افغان (مقامی) اتحاد ایسی شدت پسندانہ کاروائیاں پاکستان میں کرنے لگے۔

تحریک طالبان پاکستان کا ظہور

ایک لمبے عرصے میں مقامی طالبان جنگ جو گروپس اتنے طاقتور ہو گئے کہ دسمبر 2007ء میں انہوں نے پاکستان بھر میں موجود شدت پسند گروپوں کو اکٹھا کر کے تحریک طالبان پاکستان تشکیل دے ڈالی۔ بیت اللہ محسود اور حافظ گل بہادر اس کی ابتدائی قیادت تھے۔ مولانا گل بہادر کو امیر اور فضل اللہ (سوات میں طالبان کا امیر) کو جنرل سیکرٹری منتخب کیا گیا (جنرل سیکرٹری کا عہدہ صرف فضل اللہ کو خوش کرنے کے لیے دیا گیا تھا اور اس کی عملی اہمیت نہ ہونے کے برابر تھی) گل بہادر نے 2008ء میں خود کو طالبان سے علیحدہ کر لیا کیونکہ وہ پاکستانی حکومت سے جنگ نہیں چاہتا تھا۔ جبکہ بیت اللہ محسود حکومت، فوج اور شہری ٹھکانوں کو ٹارگٹ کرنا چاہتا تھا۔ 2009ء کے موسم بہار میں، بہادر، نذیر اور بیت اللہ نے شوریٰ اتحاد المجاہدین (ان تینوں کے گروپس کا اتحاد) تشکیل دیا اور اپنے پچھلے اختلافات ختم کرنے کا دعویٰ کیا لیکن 2009ء کے خزاں تک، نذیر کے گیارہ آدمیوں کے قتل کے واقعے کے بعد، یہ اتحاد بکھرنا شروع ہو گیا۔ یہ واردات ازبک جنگ جوؤں نے سالے ردغا میں کی تھی۔ ازبکوں کے تحفظ کے دعوے دار بیت اللہ نے ان (ازبک اور 4 محسود) قاتلوں کو ملا نذیر کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔

جنوبی وزیرستان اور ضلع ٹانک کے ذرائع کے مطابق، تقریباً 40 طالبان گروپس نے تحریک طالبان پاکستان میں شمولیت اختیار کی ان تمام گروپوں کو TTP کی شوریٰ میں نمائندگی حاصل ہے۔ اس مجلس شوریٰ کا مرکز میراں شاہ (شمالی وزیرستان کا انتظامی مرکز) ہے اس کا مقصد افغانستان میں امریکی اور نیٹو افواج کے خلاف جہاد کو مربوط کرنا اور قابض افواج کے ساتھ ساتھ پاکستانی فوج پر زیادہ سے زیادہ دباؤ بڑھانا تھا۔ نیٹو کے ذرائع سے موصول شدہ ایک اطلاع کے مطابق طالبان پاکستان نے یہ فیصلہ بھی کیا تھا کہ اگر پاکستانی فوج نے طالبان کے کسی بھی حامی گروہ پر حملہ کیا تو وہ حملہ تحریک کے تمام گروہوں پر تصور ہوگا۔ تحریک طالبان پاکستان نے اپنا نیٹ ورک تمام قبائلی علاقوں اور سرحد کی درج ذیل ضلعوں تک پھیلا رہا ہے۔ بنوں، کرک، ہنگو، کلاچی، دیر، بنیر، ڈیرہ اسماعیل خان، لکی مروت، دوآبہ، کوہاٹ اور کسی حد تک مردان، وادی سوات اور ضلع شانگلہ۔

طالبان نے جنوبی وزیرستان کا پورا کنٹرول سنبھال لیا تھا۔ انہوں نے اپنی عدالتیں بنالیں

اور مقامی لوگوں سے ٹیکس وصول کرنے لگے۔ انہوں نے محسود اور وزیر قبائل میں القاعدہ شیعہ مخالف نظریات بھی پھیلانا شروع کر دیئے۔ اس سے پہلے یہاں فرقہ واریت کا کوئی تصور نہیں تھا۔ تحریک طالبان نے شیعوں کے خلاف کئی خودکش حملے بھی کیے۔ انہوں نے ڈی آئی خان، ہنگو، ٹانک اور کرم قبائلی علاقے میں اس اقلیتی فرقے کو باقاعدہ ٹارگٹ کیا۔ مثلاً: 20 فروری 2009ء کو ڈیرہ اسماعیل خان میں ایک شیعہ رہنما کے قتل ہونے کے بعد، ان کی آخری رسومات کی ادائیگی کے دوران، طالبان نے ایک خودکش حملہ کیا جس کے نتیجے میں کم از کم 32 شیعہ مارے گئے، جنازے میں شریک سو سے زیادہ دوسرے لوگ شدید زخمی ہوئے۔ شیعہ مخالفت میں بدنام قاری حسین محسود طالبان کمانڈر رہے اور خودکش حملوں کی تربیت بھی دیتا ہے۔ وہ کالعدم سپاہ صحابہ کا جنوبی وزیرستان میں انتہائی سرگرم کارکن ہے۔ ایک اور بدنام زمانہ دہشت گرد قاری ظفر، جسے قاری حسین کا قریبی دوست سمجھا جاتا ہے، 2006ء میں کراچی کے امریکی کونسل خانے پر خودکش حملے میں ملوث تھا۔ اس نے بعد میں جنوبی وزیرستان میں پناہ لی۔ کراچی کے اس خودکش حملے میں ایک امریکی سفارت کار اور تین پاکستانی مارے گئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ظفر فروری 2010ء میں شمالی وزیرستان میں ایک میزائل حملے میں مارا گیا۔

جنوبی وزیرستان میں بغاوتوں کا ڈھانچہ

جنوبی وزیرستان میں طالبان اپنے ساتھی ایجنسی کے پختون قبائل میں سے لیتے ہیں۔ جن میں احمد زئی، وزیر، محسود اور بھٹانی شامل ہیں۔ غیر ملکی شدت پسندوں کی موجودگی ان میں خلفشار کا باعث بنتی رہی ہے کیونکہ ہمیشہ یہ سوال اٹھتا ہے کہ امریکی اور نیٹو فوجوں کے ساتھ پاکستانی حکومت/ ریاست کو بھی جنگی ہدف بنایا جائے یا نہیں۔ مرحوم بیت اللہ محسود اور اس کے جانشین ہمیشہ پاکستانی ریاست کے خلاف کاروائیوں کے حق میں رہے ہیں اور ازبک جنگ جوؤں کو پناہ دیتے رہتے ہیں۔ دوسری جانب ملا نذیر اپنے طالبان جنگ جوؤں کو، جو دانا میں مرتکز ہیں، افغانستان میں مغربی افواج کے خلاف کاروائیوں تک محدود رکھتا ہے۔ اس نے 2007ء میں ازبک جہادیوں کو زبردستی نکال باہر کیا تھا۔

القاعدہ اور ازبک اسلامی تحریک

2002ء کی ابتدا میں امریکی فوجوں کے ہاتھوں طالبان حکومت کے خاتمے کے فوراً بعد ازبک اسلامی تحریک کے ہزار ہا لوگ طاہر یلداشیف کی قیادت میں اور القاعدہ کے سینکڑوں عرب اراکین جنوبی وزیرستان آ گئے۔ پہلے یہ لوگ دانا میں رہائش پذیر ہوئے۔ یہ احمد زئی وزیر قبیلے کا

علاقہ ہے۔ ازبک اور عرب باشندے فرفر پشتو بولتے تھے اور مقامی شلوار قمیض پہنتے تھے۔ اسی لیے فوری طور پر ان کی پہچان بھی خاصا مشکل مسئلہ تھی۔ انہوں نے انگوراڈہ۔ اعظم وارسک، اور شن وارسک (دانا کے اردگرد، افغان سرحد کے ساتھ ساتھ) میں جائیداد اور زرعی زمینیں بھی خرید لیں۔ تاجک، ترکمان اور چیچن لوگوں نے بھی یہی کچھ کیا۔ وانا میں، 2004ء کے فوجی آپریشن کے دوران، القاعدہ کا نائب امیر ایمن الظواہری بھی مبینہ طور پر دانا کے قریب ہی کہیں مقیم تھا۔

2008-09ء میں امریکی ڈرون کے مسلسل حملوں کی وجہ سے القاعدہ سے وابستہ بہت سے عرب جنوبی وزیرستان کے محسود قبیلے کے زیر کنٹرول علاقوں میں منتقل ہو گئے، مثلاً: بارونڈ، ملکین، لدھا، سام، درگا، سراروگاہ اور دعا توئی وغیرہ ہیں۔ ازبک اسلامی تحریک کا لیڈر طاہر یلدا شیف محسودوں کے اسی علاقے میں امریکی ڈرون حملے کے نتیجے میں (اگست 2009ء کے آخر میں) شدید زخمی ہو کر جاں بحق ہو گیا۔ اگرچہ تازہ اطلاعات یہ ہیں کہ وہ ان حملوں سے بچ نکلا تھا۔ حالیہ پاکستانی فوجی آپریشنز کی وجہ سے مجبور ہو کر، ازبکوں کی اکثریت، لگ بھگ 2500، لدھا کے نزدیک ایک پہاڑی علاقے پیر گھر میں جا بسی۔

اسی دوران وہاں میں مقیم ازبک جنگ جوؤں سے محسود طالبان کو بہت توقعات تھیں کہ وہ خزاں 2009ء کے فوجی آپریشن کے خلاف سپنکئی، راغ زئی، بارونڈ، ملکین، لدھا، سراروگا میں بھرپور جوابی کاروائی کریں گے لیکن انہوں نے مایوس کیا تو جنوبی وزیرستان کے تمام اہم دیہات اور قصبوں میں ان کا تعاقب کیا گیا اور ان میں سے اکثر کو شمالی وزیرستان میں جا کر پناہ لینا پڑی۔ تاہم بچے کھچے ازبک پاکستانی فوج کے خلاف کاروائیاں کرتے رہتے ہیں۔ لدھا، ملکین، کانی گرم اور دعا توئی کی فوجی چوکیوں کو اور بعض اوقات جنوبی وزیرستان میں سرورا گا تک فوجی ٹھکانوں کو نشانہ بناتے ہیں۔ شمالی اور جنوبی وزیرستان کے درمیان (پیر گھر کے) پہاڑی راستوں پر وہ گھوڑوں پر سفر کرتے ہیں۔ رات کے وقت بورا کئی اور کوچ پنڈئی کے دیہات میں قیام کرتے ہیں اور اس طرح میر علی اور میراں شاہ لوٹتے ہیں۔

القاعدہ سے وابستہ زیادہ تر عرب باشندے، جنوبی وزیرستان کے شہروں اور ان کے اردگرد ڈرون حملوں کی وجہ سے، جنوبی وزیرستان سے شمالی وزیرستان شفٹ ہو گئے ہیں۔ فاٹا تحقیقاتی مرکز کے لیے جنوبی وزیرستان کے نمائندے سیلاب محسود اور ایسوسی ایٹڈ پریس کے رپورٹر اشتیاق محسود کے مطابق 2009ء کے آخر اور 2010ء کی ابتداء میں پاکستانی فوج کے ساتھ تصادم میں (اور امریکی ڈرون حملوں) 32 سینئر یا درمیانے درجے کے القاعدہ شدت پسند عرب مارے گئے تھے۔

کوئٹہ شوریٰ طالبان:۔ پاکستانی طالبان تحریک (وزیرستان) اور کوئٹہ شوریٰ کے مابین تعلق بہت غیر واضح ہے۔ دونوں تنظیمیں ہی انتہائی خفیہ ہیں لیکن پاکستانی طالبان ملا عمر کو اپنا امیر سمجھتے ہیں۔کوئٹہ شوریٰ طالبان کے موسم گرما 2009ء میں جاری کردہ ضابطہ اخلاق کا جنوبی وزیرستان TTP کے آپریشنز پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔تاہم سراج حقانی اور اس کے ایک اہم کمانڈر ملا سنگین کے ذریعے پاکستانی طالبان اور کوئٹہ شوریٰ طالبان کے درمیان ماضی میں رابطے رہے ہیں۔

تحریک طالبان پاکستان

نیچے دیا گیا چارٹ تحریک طالبان کے جنوبی وزیرستان میں موجود ڈھانچے کا ایک مختصر سا خاکہ ہے جس کی تفصیلات کچھ یوں ہیں:

امیر: حکیم اللہ محسود

نائب امیر: مولوی فقیر محمد

جنرل سیکرٹری: مولانا فضل اللہ

(وہ سوات کے طالبان کے بھی لیڈر ہیں۔

امیر جنوبی وزیرستان: ولی الرحمٰن محسود

نائب امیر جنوبی وزیرستان: خان سعید موسوم سجنا

طالبان کا فوجی منصوبہ ساز اور خودکش حملوں کا سربراہ: قاری حسین

جرائم پیشہ افراد کا سربراہ: شمیم محسود

اور لدھا کا امیر

ترجمان: رئیس خان محسود (موسوم اعظم طارق)

وزیرستان میں ٹرانسپورٹ کا سربراہ: نور محمد

فاٹا میں TTP گروپس سے: شیر اعظم اکا

وانا طالبان:

سربراہ: ملا نذیر

نائب امیر: ملنگ وزیر حلیم خاں وزیر

وانا میں احمد زئی وزیر قبیلے کی شاخوں کے ساتھ رابطہ کار: مٹھا خان وزیر

عبداللہ محسود گروپ:

گروپ کا سرپرست اعلیٰ: بانت خاں محسود شیر محمد محسود

MashalBooks.org

فوجی سرگرمیوں کا انچارج: مصباح الدین محسود نائب امیر: ترکستان بھٹانی
ترکستان بھٹانی گروپ
امیر ترکستانی گروپ: ترکستان بھٹانی
نائب امیر: اخلاص خان بموسوم وزیرستان بابا

وزیرستان کی جنگ: بیت اللہ کے بعد

تحریک طالبان کا پہلا لیڈر بیت اللہ محسود 1980ء کی دہائی میں سوویت مخالف جہاد کے دوران ایک کرشماتی شخصیت بن گیا تھا۔ شوبی خیل کی شاخ سے تعلق رکھنے والا ایک محسود، جو دعا توئی کا باشندہ تھا، افغانستان سے واپس آیا تو بنوں کے نزدیک لنڈی دھوک کے بوائز پرائمری سکول میں جم ٹیچر بننے کا خواہاں تھا۔ 1990ء کے عشرے کے آخر میں اس کے افغان طالبان سے قریبی تعلقات ہو گئے تھے کیونکہ وہ علاقے میں آنے والے افغان مجاہدین سے مسلسل رابطے میں رہتا تھا۔ 2001ء میں افغانستان میں طالبان حکومت کے خاتمے کے بعد، بیت اللہ محسود نے جنوبی وزیرستان میں مقامی طالبان تحریک منظّم کرنا شروع کر دی۔ اس تحریک نے افغانستان سے آنے والے طالبان اور القاعدہ کے لوگوں کو زبردست مدد دی۔ اس طرح اس کے ان سے رابطے اور بھی گہرے ہو گئے۔ بیت اللہ محسود اپنی ذہانت، تحمل اور برداشت کے لیے مشہور تھا اور اپنے پرجوش اور وفادار (اور علاقے میں آنے والے ازبک باشندوں) ساتھیوں کی پہنچ میں رہتا تھا۔ تحریک طالبان پاکستان کی تشکیل کے ساتھ ہی وہ منظرِ عام پر آیا جس میں اس نے مختلف طالبان گروپوں کو ایک ہی تنظیم کے تحت اکٹھا کر لیا۔ اس کے دو اہم منصوبے بہت مشہور ہوئے۔ ایک تو سابق وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کے 2007ء میں قتل کا منصوبہ تھا اور دوسرا بارسلونا میں پبلک ٹرانزٹ کو نشانہ بنانے کے لیے پاکستانیوں کی ٹیم روانہ کرنا۔

5 اگست 2009ء کو مارے جانے سے قبل، وہ مسلسل امریکی ڈرون حملوں کا ٹارگٹ رہا۔ بیت اللہ محسود کی وفات کے بعد، اس کا ترجمان، حکیم اللہ محسود، جو کبھی اس کا ڈرائیور رہا تھا، قاری حسین (ولی الرحمٰن محسود، نور سعید، مولوی عظمت محسود، رئیس خان بموسوم اعظم طارق) کے ساتھ ساتھ، خود بھی تحریک طالبان پاکستان کی امارت کا اہم امیدوار بن گیا۔ افغان جہاد کے ایک دیومالائی کردار جلال الدین حقانی کے بیٹے سراج الدین حقانی نے مداخلت کر کے طالبان کے موجودہ امیر کی جنگ کو گروہی تصادم ہونے سے بچا لیا۔ اس نے انھیں بتایا کہ ''عظیم لیڈر کے راستے کی پیروی کرو (اور) اپنی گولیاں اپنے حقیقی دشمنوں کے لیے بچاؤ۔'' حکیم اللہ اور ولی الرحمٰن

MashalBooks.org

بھی تصادم سے بچنا چاہتے تھے۔ انھیں پتہ تھا کہ اس طرح (جنوبی وزیرستان میں ہی نہیں بلکہ پورے فاٹا اور صوبہ سرحد میں) ساری تحریک تتر بتر ہو جائے گی۔ کہا جاتا ہے کہ ولی الرحمٰن کو آئیندہ فوجی آپریشنز کے بارے میں علم تھا اور وہ پاکستانی طالبان میں کوئی تفرقہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

امارت کے لیے تین اہم امیدواروں حکیم اللہ محسود، قاری حسین اور اعظم طارق کا تعلق محسود قبیلے کی بہلول زئی شاخ سے تھا جبکہ ولی الرحمٰن، مولوی عظمت اللہ اور نور سعید مان زئی شاخ سے تھے۔ تاریخی طور پر مان زئی محسود علاقے کی اقتدار کی سیاست میں ہمیشہ آگے آگے رہے ہیں۔ مزید براں جنوبی وزیرستان میں محسود طالبان نے مبینہ طور پر ولی الرحمٰن کی حمایت کی کیونکہ وہ بیت اللہ کا نائب رہ چکا تھا۔

2009ء کے موسم گرما کے آخر میں، کئی ہفتوں کے لڑائی جھگڑے کے بعد، مان زئی بہلول زئی کے مقابلے میں امارت کی جنگ ہار گئے کیونکہ حکیم اللہ محسود کے لیے بہلول زئی قبیلے کی حمایت تو تھی ہی خیبر، باجوڑ، کرم اور اورک زئی کے علاقوں میں طالبان جنگ جوؤں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ ان بحرانی ہفتوں میں، یہ افواہیں تک پھیل گئیں کہ حکیم اللہ محسود ولی الرحمٰن کے ساتھ ایک تصادم میں مارا گیا ہے لیکن بعد میں مقامی انتظامیہ نے جنوبی وزیرستان کے صحافیوں کو مدعو کیا اور اس میٹنگ میں سارے لیڈروں کو ایک ساتھ بٹھا کر اپنے اتحاد کا مظاہرہ کیا۔ جب حکیم اللہ محسود نے سارے اہم امیدواروں کو ایک طرف کر دیا تو 40 رکنی طالبان شوریٰ کے لیے اسے تحریک کا امیر بنانے کے سوا کوئی چارا نہ رہا۔ حوصلہ افزائی کے لیے ولی الرحمٰن کو جنوبی وزیرستان کے طالبان کا امیر بنا دیا گیا، جہاں سے 7 سے دس ہزار افراد اس کی کمان میں ہیں۔

مقامی ذرائع کے مطابق حکیم اللہ، حسین اور اعظم طارق نے جنوبی وزیرستان کے محسود طالبان پر کنٹرول حاصل کیا اور اب وہ پاکستانی فوج سے نبرد آزما ہیں۔ وزیرستان میں طالبان ذرائع نے یہ بھی کہا ہے کہ حکیم اللہ نے اپنے اہل خانہ کو شمالی وزیرستان شفٹ کر دیا ہے جہاں (شمالی وزیرستان کا طالبان امیر) حافظ گل بہادر ان کا خیال رکھتا ہے۔ ولی الرحمٰن بھی اپنے گھرانے کے ساتھ میراں شاہ میں ہی مقیم ہے۔

جنوبی وزیرستان میں اہم جنگ جو کمانڈر

محسود: تحریک طالبان کا پہلا امیر، 30 سالہ حکیم اللہ محسود اشانگی کی ایک شاخ ووجی خیل سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ عبداللہ دین محسود کا بیٹا تھا۔ اس کے چار بھائیوں میں سے کم از کم دو، اعجاز اور کلیم اللہ، 2008ء میں پاکستانی فوج کے ساتھ ایک تصادم میں مارے گئے تھے۔ اس کی چار بہنیں

بھی ہیں۔ حکیم اللہ کوٹ کئی (سپین کئی راغ زئی) کے علاقے سے تھا۔ تحریک کے اس امیر کی دو بیویاں تھیں۔ ایک اس کے اپنے اشانگی قبیلے سے اور دوسری اورک زئی میں آفریدی قبیلے سے۔ اس نے پانچ سال کی عمر میں اپنی ابتدائی تعلیم جنوبی وزیرستان کی تحصیل سروکئی میں واقع دارالعلوم شریعت کے مدرسے سے حاصل کی۔ کوٹ کئی سے ہی اس نے مڈل سکول کا امتحان بھی پاس کیا۔ اس نے مذہبی تعلیم ادھوری ہی چھوڑ دی کیونکہ اس نے 2003ء میں جنوبی وزیرستان میں قائم ہونے والی مقامی طالبان تنظیم میں شمولیت کر لی اور امریکیوں سے لڑنے افغانستان چلا گیا، جہاں اس نے چار ماہ گزارے۔ افغانستان میں حکیم اللہ کا پہلا جنگی تجربہ بیت اللہ محسود کی قیادت میں ہوا۔ وہ ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ اس نے 2006ء میں کچھ وقت کے لیے بیت اللہ محسود کے ترجمان کے فرائض بھی انجام دیئے۔ پکتیا میں طالبان کمانڈر مولانا سنگین اور سراج الدین حقانی کے جنگ جوؤں کے ساتھ مل کر، 2004ء میں صوبہ خوست میں مشا کند کی چیک پوسٹ پر حملہ کیا۔ افغانستان میں قیام کے دوران حکیم اللہ نے صوبہ مہمند کے ضلع سنگین میں اتحادی افواج کے خلاف کئی ہفتے تک جنگی سرگرمیاں جاری رکھیں۔

غالباً وہ سرحد پار حالیہ حملوں میں شریک رہا ہے اور نیٹو کے فوجی قافلوں اور اشیائے رسد کے سینکڑوں ٹرکوں کو نشانہ بناتا رہا ہے۔ پشاور میں دسمبر 2008ء کا سانحہ بھی حکیم اللہ کی ہی منصوبہ بندی کا شاخسانہ تھا جس میں درجنوں HUMVEES ٹرک جل کر راکھ کا ڈھیر ہو گئے۔

2004ء کے شروع میں افغانستان میں واپسی کے بعد، حکیم اللہ نے وانا کے علاقے کالوشہ میں پاکستانی فوج پر اپنی توجہ مرکوز کی۔ جہاں پاکستانی فوج نے (طالبان کے مقامی امیر) نیک محمد کے خلاف آپریشن شروع کیا تھا۔ حکیم اللہ 2006ء اور 2008ء میں بھی پاکستانی فوج سے لڑتا رہا۔ ان دنوں بھی فوج مقامی طالبان کے خلاف آپریشن میں مصروف تھی۔ حکیم اللہ اس وقت تک سو سے ڈیڑھ سو طالبان جنگ جوؤں کا کمانڈر بن چکا تھا۔ دونوں بار ہی پاکستانی فوج کو امن معاہدے کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ حکیم اللہ نے القاعدہ کے جنگ جوؤں اور افغان طالبان کو علاقے میں نہ صرف پناہ دی بلکہ انھیں ٹھکانے بھی فراہم کیے اور آج بھی وہ اس قسم کی کارروائیوں میں مصروف ہے۔

حکیم اللہ جب وزیرستانی طالبان میں شامل ہوا تو اس کی عمر 23 سال تھی۔ ایک ڈیڑھ سال کے عرصے میں گروپ پوری طرح منظم ہو چکا تھا۔ طالبان شوریٰ نے پہلے اسے کرم میں محسود طالبان کا امیر بنایا اور پھر اورک زئی اور خیبر ایجنسیاں بھی اس کے ماتحت کر دیں۔ حکیم اللہ بہت مستعد لیڈر تھا اور غالباً واحد شخص تھا جسے تین ایجنسیوں کا انتظام سونپا گیا۔ اس نے اپنی امارت کے

دوران TTP کو تینوں ایجنسیوں میں انتہائی مضبوط بنا دیا۔ کچھ عرصے کے لیے وہ مہمند اور باجوڑ میں بھی محسود طالبان کا امیر رہا۔ لیکن اس کی زیادہ تر توجہ اورک زئی، کرم اور خیبر پر ہی مرکوز رہی۔

حکیم اللہ شیعوں کا سخت مخالف تھا اور انھیں کافر گردانتا تھا۔ طالبان کی حامی اور شیعہ مخالف ایک شدت پسند گروپ سپاہ صحابہ سے اس کے قریبی تعلقات رہے ہیں۔ کرم میں طالبان کے امیر کی حیثیت میں، اس نے شیعوں کے خلاف خاصی لڑائیاں لڑیں اور 2007ء کے شروع میں ہنگو میں بھی فرقہ وارانہ فسادات میں حصہ لیا۔

حکیم اللہ خاصا گرم مزاج آدمی تھا۔ اسے جلدی غصہ آ جاتا تھا، مخالفت برداشت نہیں کر پاتا تھا۔ وہ اپنی بد دماغی اور جذباتیت کے لیے مشہور تھا۔ مبینہ طور پر کئی لوگ اس کے ہاتھوں ہلاک ہوئے۔ ان میں بعض ایسے طالبان بھی شامل تھے جنہوں نے اس کے احکامات سے انحراف کیا تھا البتہ بیت اللہ محسود کی نسبت صحافیوں سے دوستانہ زیادہ رکھتا تھا۔ اس نے کئی ویڈیوز اور آڈیو ٹیپس جاری کیں۔ ان میں سے ایک ٹیپ خودکش بمبار کی تھی جس نے 30 دسمبر 2009ء کو خوست (افغانستان) میں سی آئی اے کے مرکز پر حملہ کیا تھا۔ حکیم اللہ کو تحریک طالبان پاکستان کی امارت اس وقت ملی جب فوج کے ہاتھوں بری طرح کمزور ہو کر تحریک کو جنوبی وزیرستان کے ہی نہیں، فاٹا کے دوسرے تمام قبائل کی حمایت بھی ختم ہو گئی تھی۔ مستقبل قریب میں مشکل ہی سے تحریک طالبان پاکستانی حکومت کے خلاف مزید محاذ آرائی کر پائے گی۔ تحریک مقامی محسود طالبان پر حملوں میں بھی ہچکچاہٹ کا شکار ہو گی کیونکہ قبائل کے مابین خون ریزی کا خوف ان پر سوار ہو گا۔

ممکن ہے خوست کا حملہ ایک ٹرننگ پوائنٹ رہا ہو تاہم حکیم اللہ نے اس خودکش حملے کی ذمہ داری قبول کر لی جس میں سی آئی اے کے ساتھ ایک افسر اور اردن کا ایک خفیہ ایجنٹ مارے گئے تھے اور کئی لوگ زخمی ہوئے تھے۔ تحریک طالبان پاکستان نے اس کی ویڈیو ریلیز کی تھی جس میں حکیم اللہ اور خودکش بمبار (حمام البلاوی) اکٹھے بیٹھے دکھائے گئے تھے۔ البلاوی نے کہا تھا کہ اگست 2009ء میں ڈرون حملے کے ذریعے بیت اللہ محسود کی ہلاکت کا انتقام لینے کے لیے یہ حملہ کیا گیا تھا۔ مبینہ طور پر کئی ڈرون حملے، خوست میں موجود سی آئی اے ٹیم کنٹرول کرتی ہے۔ اگلے چند ہفتوں میں شمالی وزیرستان میں اتنے ڈرون میزائل، مختلف جگہوں پر، برسائے گئے جن کی مثال نہیں ملتی۔ انہی میں سے ایک میزائل فائر سے حکیم اللہ محسود زخمی ہوا تھا امریکی حکام کا کہنا ہے کہ وہ ان زخموں سے جانبر نہیں ہو سکا ہو گا مگر تحریک کے ذرائع اس کی موت کے انکاری ہیں۔ 16 یا 17 جنوری کو حکیم اللہ محسود نے ایک ویڈیو ٹیپ جاری کی تاکہ اس کی موت کی افواہیں ختم ہو جائیں لیکن اس کے بعد اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملی۔ طالبان کے مسلسل انکار کے باوجود، عام خیال

MashalBooks.org

یہی ہے کہ وہ مارا جا چکا ہے۔

ولی الرحمٰن محسود

40 سالہ ولی الرحمٰن، عصمت اللہ کا بیٹا ہے اور جنوبی وزیرستان کے مال خیل قبیلے (محسود قبیلے کی شاخ) کی مڈل کلاس گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا گھرانہ میراں شاہ میں رہتا ہے لیکن وہ پورے وزیرستان میں گھومتا رہتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ آج کل مومی کرم کے علاقے میں رہتا ہے اور وہ جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد میں پڑھتا رہا ہے۔ 1996ء میں گریجویشن کے بعد، وہ کان گرم کے مدرسے میں پڑھانے کے لیے جنوبی وزیرستان لوٹا۔ 2004ء میں طالبان میں شامل ہونے سے پہلے، ولی الرحمٰن جمعیت علمائے اسلام (فضل اکرحمٰن گروپ) سے وابستہ تھا۔ اب بھی اس کے ان سے روابط ہیں۔

ولی الرحمٰن منکسر المزاج، ذہین، متحمل اور نرم گفتار سمجھا جاتا ہے۔ تحریک طالبان پاکستان کی جانشینی کے مسئلے پر ابتدائی تنازعے کے باوجود، وہ آج بھی شعلہ رو حکیم اللہ کا قریبی اتحادی جانا جاتا ہے۔ آج کل وہ جنوبی وزیرستان کی امارت کے ساتھ ساتھ، تنظیم کی فوجی حکمت عملی کا نگران بھی ہے۔ 2007ء میں اسے تحریک کے مالی معاملات دیکھنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ وہ سرحد پار افغان علاقوں میں امریکی اور نیٹو افواج پر حملوں میں شریک رہا ہے اور 2008ء کے دوران پاکستانی فوج سے بھی برسرپیکار رہا ہے۔ اس کا بھائی قریب الرحمٰن، جنوبی وزستان کے سیلی ٹوٹی قلعے پر شدت پسندوں کے حملے دوران (2008ء میں) پاکستانی فوج کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

فاٹا ریسرچ سنٹر کے مقامی رپورٹر سیلاب محسود کا اندازہ ہے کہ ولی اور حکیم اللہ کے درمیان ان دنوں مخاصمت بہت بڑھ گئی تھی کیونکہ ولی پاکستانی فوج سے TTP کا تصادم نہیں چاہتا تھا۔ ولی کا خیال تھا کہ اس صورت حال نے محسود قبیلے کو تباہ کر ڈالا ہے۔ ولی الرحمٰن کے پاکستانی حکومت کے ساتھ، مبینہ طور پر پشاور یا خیبر میں خفیہ مذاکرات چل رہے ہیں لیکن قاری حسین اور حکیم اللہ پاکستانی فوج سے جنگ جاری رکھنا چاہتے ہیں۔

قاری حسین

بیت اللہ محسود کی موت کے بعد، TTP کا ایک اور اہم کمانڈر 36 سالہ قاری حسین ہے اور اس کا تعلق جنوبی وزیرستان کے بہلول زئی قبیلے کی شاخ اشانگی سے ہے۔ اصلاً وہ سپن کئی راغ زئی کے علاقے میں رہائش پذیر تھا اور بیت اللہ محسود کا قریبی معاون سمجھا جاتا تھا۔ اس نے کراچی کے جامعہ بنوریہ سے 1994ء میں گریجویشن کی اور شیعہ مخالف (شدت پسند) گروپ سپاہ صحابہ کا

رکن بن گیا۔ 2004ء میں اس نے تحریک طالبان میں شمولیت اختیار کی حسین کی شہرت ایک بدد ماغ، سفاک، شیعہ مخالف اور شعلہ بیان مقرر کی ہے۔اس نے 2006ء کے دوران پاکستان بھر میں خودکش حملوں کی (سفاکانہ) مہم کے لیے خود کو وقف کر دیا۔اس نے سینکڑوں خودکش بمبار تیار کیے۔ (ان میں بعض تو گیارہ سال کے لگ بھگ تھے) تاکہ پاکستانی فوج اور حکومت کے مراکز کے ساتھ ساتھ، مارکیٹوں، جنازوں، اسپتالوں اور دوسرے ''نرم'' ٹارگٹس کو دہشت گردی کا نشانہ بنایا جاسکے۔صرف 2008ء میں پورے پاکستان میں 66 خودکش حملوں کے دوران، مبینہ طور پر 965 افراد مارے گئے جن میں پولیس اور فوج کے اہل کاروں کے ساتھ ساتھ بہت سے معصوم شہری بھی شامل تھے۔

2009ء میں 1200 افراد جاں بحق ہوئے اور 2800 افراد زخمی ہوئے۔ پاکستان خفیہ حکام کا کہنا ہے کہ پاکستان میں 70% خودکش بمباروں کی تربیت قاری حسین کے کیمپوں میں کی گئی تھی۔ پاکستانی حکومت نے قاری حسین کی گرفتاری یا موت پر 5 کروڑ روپے کا انعام رکھا ہوا ہے۔اس کا اثر صرف پاکستان تک ہی محدود نہیں۔ 2007ء کی اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ کے مطابق افغانستان میں 80% خودکش بمبار پاکستان کے کیمپوں سے آئے تھے۔

حسین کی شیعوں کے خلاف انتہائی نفرت کا ذکر بے جانہ ہوگا۔ وہ مبینہ طور پر شیعوں کو ٹانک اور ڈیرہ اسمٰعیل خان سے پکڑ کر سپن کئی راغ زئی میں اپنے ٹھکانے پر لے جاتا تھا اور انھیں تشدد کا نشانہ بنانے کے لیے جنگلی جانوروں کے ساتھ باندھ دیتا تھا۔بعض قیدی شیعوں کے اس نے سر بھی قلم کیے۔قاری حسین نے وزیرستان میں سپاہ صحابہ کو مضبوط بنانے کے لیے بھی خاصا کام کیا۔اور سرحد کے علاقوں میں فرقہ وارانہ فسادات کے لیے محسود اور وزیر قبائل کو بھی شامل کیا۔ پاکستانی طالبان کے کوٹ کئی کے امیر کی حیثیت سے ایک بار حسین نے موجودہ فوجی آپریشن کو اشتعال انگیز قرار دیتے ہوئے دھمکی دی تھی کہ وہ حکومت کے خلاف اور زیادہ خودکش بمباروں کا استعمال کرے گا۔حسین کے ایک بھائی نے 2009ء (نومبر) میں پشاور میں خودکش حملہ کیا تھا۔ ایسا حملہ پہلی دفعہ کسی طالبان کمانڈر کے قریبی رشتہ دار نے کیا تھا۔ (2009ء کی خزاں میں) فوجی آپریشن کے بعد وہ جنوبی وزیرستان سے فرار ہوکر، مبینہ طور پر آج کل میر علی (شمالی وزیرستان) میں مقیم ہے۔ وہاں سے جنوبی اور وسطی وزیرستان کے علاقوں میراں شاہ، میر علی، دتہ خیل اور دوس علی میں پھیلے ہوئے دوڑ قبیلے کی زبردست حمایت حاصل ہے۔

جنوبی وزیرستان کے مقامی اور طالبان ذرائع کے مطابق قاری حسین نے حکیم اللہ کی مبینہ موت کے بعد تحریک کا امیر بننے سے انکار کر دیا ہے۔غالباً موت کا شکار ہونے سے بچنے کے

لیے، وہ زیادہ نمایاں نہیں ہونا چاہتا۔ اسی لیے وہ زیادہ تر میر علی میں رہتا ہے۔

اعظم طارق

جنوبی وزیرستان میں TTP کا موجودہ ترجمان 40 سالہ اعظم طارق محسود قبیلے کی شاخ کئی خیل سے تعلق رکھتا ہے اور ڈی لے (Delay) کے علاقے کا باشندہ ہے۔ رئیس خان محسود اس کا اصلی نام ہے۔ تاہم ایک زمانے میں ٹانک شہر کا سکول ٹیچر، استاد کے نام سے بھی خاصا مشہور ہے۔ 9-2008ء میں وہ ٹانک شہر کا امیر تھا۔ یہاں محسود قبیلے کی بھاری اکثریت ہے سپاہ صحابہ سے بھی اس کا تعلق ہے۔ ذہین ہونے کے ساتھ اسے مقامی محسود قبائل کی روایات اور سیاست کا ماہر بھی جانا جاتا ہے۔ اسی لیے مقامی لوگ پاکستانی عدالتی نظام کے بجائے، اپنے تنازعات کے حل کے لیے اس کے پاس آیا کرتے تھے۔ ستمبر 2009ء میں طارق کو TTP کا ترجمان مقرر کیا گیا (وسط اگست میں مولوی عمر (باجوڑ) کی گرفتاری کے بعد) حکیم اللہ اور قاری حسین سے اس کا قریبی تعلق ہے۔

نور سعید

30 سالہ نور سعید کا تعلق محسود قبیلے کی شاخ شوبی خیل سے ہے۔ وہ TTP کی شوریٰ کا رکن ہے۔ وہ محسود طالبان میں، بیت اللہ محسود کا نائب اور جز وقتی ترجمان ہونے کے ناطے بہت مقبول ہے۔ (2004ء میں) محسود طالبان کی تحریک میں شامل ہونے سے پہلے وہ ایک کسان تھا۔ نور سعید کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بہت مذہبی شخص ہے اور لوگوں کے ساتھ میل جول میں انتہائی منکسر المزاج ہے۔

شمیم محسود

جرائم پیشہ افراد سے متعلق TTP کے نیٹ ورک کا سربراہ 35 سالہ شمیم محسود قبیلے کی شاخ شامان خیل سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا آبائی گاؤں ٹانگی (لاھاد) میں ہے۔ شمیم کا تعلق لدھا کے ایک انتہائی غریب گھرانے سے ہے۔ 2007ء میں TTP کا لدھا میں امیر بنائے جانے سے قبل وہ سپن کئی راغ زئی میں بطور ویٹر کام کرتا تھا۔ آج کل وہ 30 جرائم پیشہ افراد پر مشتمل طالبان کمانڈر گروپ کا سربراہ ہے۔ یہ گروپ ڈاکہ زنی، اغوا برائے تاوان اور بینکوں میں وارداتوں کے ذریعے، موجودہ شدت پسند کارروائیوں کے لیے لاکھوں کروڑوں روپے اکٹھے کرتا ہے۔ پورے پاکستان میں اس کے مخبر موجود ہیں جو انھیں کارروائی کی جگہوں اور وہاں سے متوقع فائدے کے بارے میں خفیہ معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔

MashalBooks.org

وزیرستان میں چھوٹے چھوٹے محسود جنگ جو گروپس

عبداللہ محسود گروپ (پاکستان کا حامی)

شدت پسندوں کے ایک چھوٹے سے گروپ کا سربراہ، عبداللہ محسود ابتدا میں جنوبی وزیرستان کے گاؤں نانو اور بعدازاں شمالی وزیرستان میں میراں شاہ میں رہا کرتا تھا۔ اس نے دو سال امریکی فوجی جیل گوانتاناموبے میں گزارے۔ مارچ 2004ء میں وہاں سے رہائی کے بعد اس نے امریکی افواج کے خلاف لڑائی کے لیے مقامی محسود طالبان کو منظم کرنا شروع کر دیا۔ اکتوبر 2004ء میں وہ دو چینی انجینئرز کے اغوا میں ملوث رہا۔ ان میں سے ایک پاکستانی فوج کے ریسکیو آپریشن کے دوران مارا گیا۔ عبداللہ نے ژوب (بلوچستان) میں دستی بم کے دھماکے کے ذریعے خود کو موت کے حوالے کر دیا۔ پاک فوج کا کہنا تھا کہ جولائی 2007ء میں وہ فوجی دستوں سے لڑتے ہوئے مارا گیا تھا۔

عبداللہ کے انتقال کے بعد، اس کے پیروکار سیف الرحمٰن محسود کے اردگرد جمع ہو گئے۔ بعد میں عبداللہ کا کزن زین الدین سود اس گروہ کا سربراہ بن گیا۔ وہ قاری زین کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ قاری زین کے حملوں کو امریکی افواج تک محدود کرنے اور پاکستانی فوجی اداروں کو نشانہ نہ بنانے کے مسئلے پر شدید اختلافات ہو گئے۔ تحریک طالبان پاکستان حکومت سے بھی جنگ کرنا چاہتی تھی چنانچہ 2008ء میں قتل وغارت کے واقعات کے بعد انھیں جنوبی وزیرستان سے نکال دیا گیا تھا۔ جون 2009ء میں زین الدین اپنے ہی ایک محافظ کے ہاتھوں مارا گیا زین الدین کا چھوٹا بھائی مصباح الدین محسود آج کل گروپ کا لیڈر ہے اور نسبتاً حکومتی حامی سمجھا جاتا ہے۔ اس کی دو وجوہ ہیں۔ ایک تو گروپ کی تحریک طالبان سے پاکستان سے دشمنی کے مسئلے پر علیحدگی اور دوسرے مصباح الدین کی فوجی طاقت کا TTP سے کوئی مقابلہ ہی نہیں اس لیے اسے حکومتی تحفظ چاہیے۔

عبداللہ محسود کا گروپ جس میں لگ بھگ دو ہزار جنگ جو شامل ہیں سرحد کے ٹانک اور ڈی آئی خاں میں مرکوز ہے اور اسے پاکستانی حکومت کی مدد حاصل ہے۔ اس کے جنگجو ترکستانی بھٹانی گروپ کے اتحادی ہیں۔ بھٹانی بھی TTP مخالف گروپ ہے اور اس کے لیے مشکلات پیدا کرتا رہتا ہے۔ ان دونوں گروہوں نے مل کر پاکستانی طالبان کو ٹانک اور ڈی آئی خان سے واپس جنوبی وزیرستان کی جانب دھکیل دیا ہے۔ اس کشمکش میں دونوں اطراف کے بہت سے لوگ مارے گئے۔

MashalBooks.org

شہریار محسود (پاکستان مخالف) گروپ

35 سالہ شہریار کا تعلق شوبی خیل شاخ سے ہے اور وہ جنوبی وزیرستان کے گاؤں جھنگرا کا باشندہ ہے۔ بیت اللہ محسود سے اس کی کبھی نہیں بنی۔ شہریار کا خیال تھا کہ اس کا خاندان زیادہ دولت مند اور شہریار کے چھوٹے سے گروپ میں 150 جنگ جو شامل ہیں جو افغانستان میں سرحد پار کارروائیاں کرتے ہیں۔ ساتھ ہی (ٹانک اور ڈی آئی خان میں) کاریں چھیننے اور اغوا برائے تاوان جیسی مجرمانہ سرگرمیوں میں بھی ملوث ہیں۔

بیت اللہ محسود والی محاذ آرائی، حکیم اللہ کے زمانے میں بھی چلتی رہی۔ وہ حکومت مخالف گروپ سمجھا جاتا ہے کیونکہ وہ پاکستانی پولیس اور حکومت کے اہل کاروں کو نشانہ بناتا رہتا ہے۔

وزیر جنگ جو:

ملا نذیر، وانا طالبان (حکومت کے حامی)

وانا کے احمد زئی قبیلے کا ایک اہم کمانڈر ملا نذیر ہے۔ اس نے مدرسے میں تربیت حاصل کی تھی۔ افغانستان اور پاکستان، دونوں ملکوں کی شہریت کا حامل ملا نذیر حزب اسلامی کے امیر گلبدین حکمت یار کا قریبی معاون تھا۔ 2006ء کے آخر میں اس نے جنوبی وزیرستان میں مقیم ازبک اسلامی تحریک کے (ہزارہا) جنگ جوؤں کی موجودگی کے مسئلے پر حاجی شریف اور حاجی عمر اور ان کے ساتھیوں کی قیادت کو چیلنج کر دیا اور وانا طالبان کا امیر بن گیا۔ اس نے ازبک جنگ جوؤں پر احمد زئی وزیر قبیلے کے بہت سے عمائدین کے قتل کا الزام لگایا تھا۔ اپریل 2007ء میں دس دن کی لڑائی کے بعد ملا نذیر کے ساتھیوں نے مقامی احمد زئی وزیر قبیلے کی ملیشیا اور پاکستانی حکومت کی مدد سے دو ہزار ازبک جنگ جوؤں کو وانا سے نکال باہر کیا۔ بیت اللہ محسود نے فرار ہونے والے ازبک جنگ جوؤں کو محسود علاقے (درگا، سیرار وگاہ اور باروند) میں پناہ کی پیش کش کی۔ جس سے ملا نذیر آگ بگولا ہو گیا۔ بیت اللہ محسود کو غالباً سراج الدین حقانی نے ان ازبکوں کو پناہ فراہم کرنے کے لیے کہا تھا کیونکہ ازبکوں کے لیے کہیں اور جائے پناہ تھی ہی نہیں۔ ان دنوں ملا نذیر وانا طالبان کے چودہ گروہوں کا منتظم ہے۔ ان میں ایک ہزار جنگ جو شامل ہیں جو امریکی اور نیٹو افواج کے خلاف، سرحد پار کارروائیوں میں مصروف رہتے ہیں۔ امریکی ڈرون حملوں کے ذریعے کم از کم دو دفعہ اسے نشانہ بنایا گیا۔ ایک حملے میں اس کی ٹانگ بری طرح زخمی ہو گئی تھی اسے حکومت کے حامی طالبان سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس کی تمام تر توجہ افغانستان میں اتحادی افواج کے خلاف کارروائی پر مرکوز ہوتی ہے تاہم عرب القاعدہ تحریک سے بھی اس کے قریبی تعلقات ہیں جیسے

MashalBooks.org

کہ پہلے بھی بیان کیا گیا کہ ستمبر 2009ء کے واقعے کے بعد، پاکستانی طالبان سے اس کی مخاصمت چلتی رہی ہے۔ ملا نذیر نے الزام لگایا تھا کہ اس کے گیارہ افراد محسود علاقے سالے روگا (جنوبی وزیرستان) سے وانا واپس آتے ہوئے مار دیئے گئے تھے۔ محسود قبیلے نے اپنے چار افراد اور چار ازبک، جو اس حملے میں ملوث تھے، ملا نذیر کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اسی باعث محسود اور احمد زئی وزیر قبائل کے درمیان کشیدگی چل رہی ہے۔ بیت اللہ محسود، ملا نذیر اور حافظ گل بہادر کی تشکیل شدہ شوریٰ اتحاد المجاہدین (2009ء) بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئی نذیر کو اب وانا طالبان کا کمانڈر سمجھا جاتا ہے۔

ملا نذیر مخالف وزیر گروپس

حاجی شریف گروپ (حکومت مخالف)

وانا کے احمد زئی وزیر قبیلے کا پچاس سالہ حاجی شریف 500 جنگ جوؤں کا سربراہ ہے۔ وہ پاکستانی اور افغان، دونوں حکومت کے خلاف لڑتا رہا ہے۔ وانا سے ازبک جنگ جوؤں کے نکالے جانے کے وقت اس نے ان کی بھرپور مدد کی۔ ازبکوں کے نکالے جانے کے بعد، حاجی شریف میراں شاہ منتقل ہو گیا اور مرحوم بیت اللہ محسود کا حلیف بن گیا تاہم ستمبر 2007ء میں حاجی شریف نے مقامی لوگوں اور حکومت کو نشانہ بنانے کے مسئلے پر ازبکوں سے اختلافات کے بعد، ملا نذیر سے مصالحت کر لی۔ اس کے بعد حاجی شریف نے جنوبی وزیرستان میں قبائلی عمائدین اور حکومتی اہلکاروں پر حملے بند کر دیے۔ پھر وہ وانا واپس چلا گیا اور آج کل وہیں مقیم ہے۔

حاجی عمر گروپ (حکومت مخالف

اٹھاون سالہ حاجی عمر 80ء کی دہائی کے سوویت مخالف جہاد کے شرکاء میں سے ہے۔ احمد زئی وزیر قبیلے کی شاخ یار گل خیل سے اس کا تعلق ہے۔ 2004ء میں جب فوج نے غیر ملکی جنگی جوؤں اور ان کے حامیوں کو (نیک محمد کی وفات کے بعد) جنوبی وزیرستان سے نکالنے کے لیے آپریشن شروع کیا تو حاجی عمر وانا طالبان کا امیر تھا۔ مبینہ طور پر القاعدہ جنگ جوؤں سے اس کے گہرے تعلقات تھے۔ وہ وانا میں مقامی عمائدین کے قتل میں ملوث تھا اور وزیرستان میں ازبکوں کا زبردست مددگار تھا۔ ازبکوں کی خاطر اس نے ملا نذیر سے جنگ مول لی اور پھر اپنے بھائی حاجی شریف کی طرح، میراں شاہ میں پناہ حاصل کرنے پر مجبور ہوا، جہاں وہ مرحوم بیت اللہ کا اتحادی بن گیا۔ دسمبر 2006ء کے ایک امریکی ڈرون حملے میں مبینہ طور پر وہ ہلاک ہو گیا چند سو افراد پر

مشتمل اس کا گروہ اب بے اثر ہو کر رہ گیا ہے۔

عباس گروپ (حکومت مخالف)

مولوی عباس وزیر حاجی شریف اور حاجی عمر کا کزن ہے۔ اپریل 2007ء میں وہ ازبکوں کے مسئلے پر ان دونوں بھائیوں کی مخالفت میں، ملا نذیر اور احمد زئی قبیلے کی ملیشیا کے ساتھ مل کر لڑا تھا۔ 42 سالہ مولوی عباس بھی احمد زئی قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ بھی امریکی اور نیٹو افواج کے خلاف سرحد پار حملوں میں شامل رہا ہے۔ 150 سے 200 جنگ جو اس کی کمانڈ میں بتائے جاتے ہیں۔

نور اسلام گروپ (حکومت مخالف)

وزیر زئی قبیلے کا ایک اور اہم جنگ جو، نور اسلام سوویت مخالف جہاد میں شریک رہا تھا۔ وہ حاجی شریف اور حاجی عمر کا بھائی ہے۔ اپریل 2007ء میں وہ ازبک جنگ جوؤں کی طرف سے لڑا تھا اور نتیجتاً وانا چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ وہاں سے وہ بیت اللہ محسود کی پناہ میں چلا گیا۔ وہ ملا نذیر کا شدید دشمن ہے۔ اسی کے ساتھیوں نے ملا نذیر کے نائب ولک خاناں کو مئی 2008ء میں جنوبی وزیرستان میں مار ڈالا تھا۔ نور اسلام کے پاس مبینہ طور پر 250 سے 300 جنگ جو ہیں۔ وہ انھیں سرحد پار امریکی اور نیٹو افواج پر حملوں کے لیے استعمال کرتا ہے۔ 2004ء میں اس نے پاک فوج پر بھی حملہ کیا تھا۔

وزیرستان میں بھٹانی گروپس

ترکستان بھٹانی گروپ (حکومت حامی)

جنوبی وزیرستان میں بھٹانی گروپس کے سرگرم عمل تین اہم کمانڈروں میں سے ایک ملک ترکستان بھٹانی فرنٹیئر کور کا ریٹائرڈ کارپورل ہے۔ وہ بھٹانی قبیلے کی شاخ نعمت خیل سے تعلق رکھتا ہے اور جندولہ کے علاقے سرگھر کا باشندہ ہے۔ وہیں وہ امن کمیٹی کا سربراہ بھی ہے جس کا مقصد ٹانک اور جندولہ سے تحریک طالبان پاکستان کو دور رکھنا ہے۔ وہ حکومت کا حامی سمجھا جاتا ہے اور TTP کے خلاف عبداللہ محسود کا اتحادی ہے۔ پاکستانی طالبان نے کئی دفعہ ترکستان گروپ پر حملے کیے ہیں۔ 2008ء میں پاکستانی طالبان جنگ جوؤں نے جندولہ پر حملہ کر کے امن کمیٹی کے تیس اراکین کو مار ڈالا تھا۔ ستمبر 2009ء میں TTP نے دوسرے بھٹانی شدت پسندوں کے ساتھ مل کر ٹانک، جندولہ اور سرگھر پر حملہ کر کے درجنوں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ اس حملے میں ترکستان بچ نکلا تھا۔ آج کل وہ TTP کے خطرات سے بچنے کے لیے، ٹانک اور ڈیرہ اسماعیل خاں

میں زیادہ سرگرم نہیں ہے اگر چہ ترکستان قبیلہ محسود اور وزیر قبائل کے مقابلے میں عدداً چھوٹا ہے تاہم ضلع ٹانک سے جنوبی وزیرستان جانے والے انتہائی اہم روڈ کے اردگرد آباد ہونے کی وجہ سے اسے خصوصی سیاسی اثر ورسوخ اور اہمیت حاصل ہے۔ ترکستان بھٹانی عبداللہ محسود کے گروپ کا نائب امیر بھی ہے کیونکہ وہ تن تنہا PTTP مقابلہ نہیں کر سکتا۔

عصمت اللہ شاہین گروپ (حکومت مخالف)

جندولہ کے علاقے میں دوسرا اہم بھٹانی گروپ عصمت اللہ شاہین کا ہے۔ بھٹانی قبیلے کی شاخ کھجی سے اس کا تعلق ہے اور وہ کھجی گاؤں کا باشندہ ہے۔ ابتداء میں عصمت اسلامی شدت پسند گروپ (مولانا فضل الرحمٰن کے) حرکت المجاہدین سے وابستہ تھا لیکن بعد میں بیت اللہ محسود کی TTP میں شامل ہو گیا۔ اغوا برائے تاوان، کاریں چھیننے اور سرحد پار امریکی اور نیٹو افواج پر حملوں کی کاروائیوں میں خاصا ملوث رہا ہے۔ آج کل عصمت اللہ ترکستان بھٹانی کے شدید خلاف ہے کیونکہ اس نے اسے جولائی 2009ء میں جندولہ سے نکل کر محسود علاقوں میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا تھا 200 سے 250 جنگ جو عصمت اللہ کی کمان میں ہیں۔

اوّل خان بھٹانی گروپ (حکومت مخالف)

بھٹانی گروپس میں تیسرا اہم گروپ، جندولہ میں ہی، اوّل خان کا ہے۔ وہ سرحد پار اتحادی افواج کے خلاف کاروائیوں میں ملوث ہے۔ عصمت اللہ کی طرح، اول خان کے بھی ترکستان بھٹانی سے اچھے تعلقات نہیں۔ تاہم جندولہ کے اردگرد TTP کے جنگ جوؤں کے ساتھ اس کے اچھے رابطے ہیں۔

وانا کا پنجابی طالبان گروپ (حکومت حامی)

اور آخر میں پنجابی طالبان (نسبتاً ایک نیا عامل) وانا کے باہر کاروائیاں کیا کرتا تھا۔ اس کی وابستگی مختلف قسم کے کالعدم فرقہ پرست اور شدت پسند گروپوں مثلاً: حرکت جہاد اسلامی، لشکر جھنگوی، جمعیت الانصار، جمعیت الفرقان اور ایک پنجابی عبدالرحمٰن کی سپاہ صحابہ سے ہے۔ ازبکوں کے خلاف وہ ملا نذیر کے اتحادی ہیں اور ان کے لگ بھگ تین ہزار لوگ ہیں۔ وہ وزیر علاقوں کے ساتھ ساتھ محسود قبیلے کے زیرنگیں علاقوں سراروگاہ، مکین، لدھا، انگور اڈہ، اور اعظم وارسک میں رہائش پذیر ہیں۔ وہ صرف سرحد پار امریکی اور نیٹو افواج کے خلاف کاروائیاں کرتے ہیں۔ تاہم اکثر پنجابی طالبان جنوبی وزیرستان سے شمالی وزیرستان منتقل ہو گئے ہیں کیونکہ اپنے رنگ وروپ

MashalBooks.org

کی وجہ سے ان کے لیے مقامی لوگوں میں گھل مل جانا مشکل تھا اور نئے ہونے کی وجہ سے علاقے میں، ان کے اچھے رابطے نہیں ہو پائے تھے۔ وزیرستان میں صفدر دور نامی ایک صحافی کے مطابق ان لوگوں کا شمالی وزیرستان میں ٹھہرنا زیادہ آسان اس لیے بھی ہے کہ سوویت مخالف جہاد کے دوران شمالی وزیرستان ہی ان کا بیس تھا اور مقامی عثمان زئی اور دور قبائل سے ان کے پرانے تعلقات ہیں۔

☆☆☆

MashalBooks.org

جنوبی وزیرستان میں فوجی آپریشنز اور امن معاہدوں کی مختصر تاریخ (2004-08ء)

جنوبی وزیرستان میں طالبان کے مختلف جنگ جو گروپس کے خلاف 2004ء سے اب تک چار فوجی آپریشن کیے گئے ہیں۔ جن میں سے راہ نجات آپریشن اب بھی جاری ہے۔ پہلی مہم 2004ء کے موسم بہار اور موسم گرما میں، نوجوان اور کرشمہ ساز شخصیت نیک محمد اور (بشمول حاجی شریف اور نور الاسلام) اس کے ہزار ہا ساتھیوں کے خلاف تھی۔ وانا کے مغربی علاقے میں کیے گئے اس آپریشن میں سات ہزار فوجی جواں شریک تھے۔ دو ہفتے طویل آپریشن کے دوران 16 فوجی مارے گئے۔ چھ ماہ بعد فوج نے وانا کے شمال میں دس ہزار جوانوں کے ساتھ حملہ کیا۔ جہاں 200 سے زاید چیچن اور ازبک جنگ جوؤں کے علاوہ، کچھ عرب اور چند سو مقامی شدت پسند موجود تھے۔ خاصے جانی نقصان کی وجہ سے، پاکستانی حکومت نے مقامی جنگ جوؤں کے ساتھ کئی امن معاہدے کیے پہلا معاہدہ شکئی معاہدے کے نام سے موسوم ہوا۔ جس پر نیک محمد، اس کے اتحادیوں نے ایک طرف اور جنوبی وزیرستان میں پاکستانی فوجی کمانڈر جنرل صفدر حسین نے دوسری جانب سے دستخط کیے۔ یہ معاہدہ شکئی کے ایک مدرسے میں ہوا تھا۔ فوج نے نیک محمد کے علاقے سے فوج ہٹانے اور جنگ جوؤں کے نقصانات کے ازالے سے اتفاق کیا جبکہ نیک محمد نے ہتھیار ڈالنے اور تمام غیر ملکیوں کو ''رجسٹر'' کرانے کا وعدہ کیا۔ امن معاہدہ زیادہ عرصہ نہیں چل سکا۔ نیک محمد نے (جلد ہی) معاہدے کی خلاف ورزی کی جون 2004ء میں نیک محمد (وانا کے قریب) ایک امریکی ڈرون حملے میں مارا گیا۔

دوسرا فوجی آپریشن 2005ء کے شروع میں کیا گیا محسود قبیلے کے زیر کنٹرول علاقے میں یہ آپریشن بیت اللہ محسود اور عبداللہ محسود کے چار ہزار جنگ جوؤں کے خلاف ہوا تھا۔ پچھلی فوجی مہم کی طرح، اس میں بھی فوج کو خاصا جانی نقصان ہوا اور بالآخر شدت پسندوں کے ساتھ مصالحت کر لی گئی۔ اس معاہدے میں سراروگاہ میں بیت اللہ محسود، تین قبائلی عمائدین اور پاکستانی حکومت

کے نمائندوں نے دستخط کیے۔ سراج الدین حقانی نے مبینہ طور پر اس معاہدے کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ بیت اللہ محسود نے وعدہ کیا کہ وہ غیر ملکی جنگ جوؤں کو پناہ نہیں دے گا۔ علاقے میں فوج پر حملہ نہیں کرے گا اور حکومتی تعمیرات کو نشانہ نہیں بنائے گا جبکہ فوج دوبارہ اپنے دستے علاقے سے باہر نکالنے اور ان کے نقصانات کے ازالے کے لیے تیار ہوگئی۔ امن معاہدہ زیادہ دیر نہیں چلا۔ بیت اللہ نے پاکستانی انتظامیہ کو نشانہ بنانے کے لیے خودکش بمبار بھیجنا شروع کر دیے جو اس کی موت اگست 2009ء تک جاری رہے۔ تاہم امن معاہدے نے ان کے حوصلے بڑھا دیے اور حقیقتاً وہ جنوبی وزیرستان پر حکمرانی کرنے لگا۔ ہزاروں مقامی جنگ جوؤں نے اس کی تحریک میں شمولیت اختیار کر لی اور علاقے سے پاکستانی حکومت کی رٹ کا خاتمہ ہوگیا۔

جنوبی وزیرستان میں تیسرا بڑا آپریشن جنوری 2008ء میں کیا گیا تا کہ بیت اللہ محسود کے ساتھیوں کا صفایا کیا جا سکے۔ اور اہم طالبان لیڈروں بشمول بیت اللہ محسود اور خودکش حملوں کے منتظم قاری حسین کو گرفتار یا ختم کیا جا سکے۔ اس تصادم کے دوران دو لاکھ مقامی افراد بے گھر ہو گئے چھ ہفتے کی شدید لڑائی کے بعد، گزشتہ معاہدوں کی شرائط سے ملتی جلتی شرائط پر امن معاہدے کی بات ہونے لگی۔ مئی میں پاک فوج نے علاقہ خالی کرنا شروع کر دیا۔ ایک پاکستانی کمانڈر نے تبصرہ کیا۔ ہم باہر نہیں جا رہے، صرف اپنی پوزیشنیں بدل رہے ہیں۔ امن معاہدے (2008ء کے موسم بہار) میں بیت اللہ محسود کی نقل و حرکت پر لگائی گئی پابندی کا بیت اللہ نے اسی طرح مذاق اڑایا کہ اس نے جون میں اپنی مشہور پریس کانفرنس کر ڈالی جس میں اس نے جنوبی وزیرستان کے تمام مقامی صحافیوں کو دعوت دی اس بار بھی حکومت اور شدت پسندوں کے درمیان سراج الدین حقانی نے مذکرات کا ڈول ڈالنے میں اہم کردار ادا کیا۔ رپورٹ کے مطابق وہ فریقین کا تصادم ختم کرانے کے لیے گیارہ گاڑیوں پر مشتمل قافلے کے جلو میں وہاں آیا تھا۔ امن معاہدہ جلد ہی ٹوٹ گیا۔ خودکش حملوں کی مہم اسی طرح چلتی رہی۔ قاری حسین نے سپن کئی راغ زئی میں خودکش بمباروں کا ایک نیا تربیتی کیمپ قائم کر لیا اور بیت اللہ محسود بدستور پاکستانی فوجوں کو ٹارگٹ بناتا رہا۔ اگست 2007ء اور جنوری 2008ء میں پاکستانی طالبان نے جنوبی وزیرستان کے دو فوجی ٹھکانوں پر حملہ کر کے اپنی طاقت کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ پہلے حملہ میں انہوں نے سو فوجیوں کو یرغمال بنا لیا اور دوسرے حملے میں محسود جنگ جوؤں نے سراروگاہ کے قلعے پر قبضہ کر لیا بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ شدت پسندوں سے براہ راست مذاکرات نے نہ صرف انتہا پسندوں کو قانونی جواز فراہم کر دیا بلکہ قبائل کو بھی شدید خطرات سے دوچار کر دیا۔ پاکستانی تجزیہ نگار شجاع نواز کے مطابق یہ فوج نے فرنٹیئر کور پر بہت زیادہ بھروسہ کیا جو جارحانہ پٹرولنگ یا مسلح اور تربیت یافتہ شدت پسندوں سے

MashalBooks.org

لڑنے کی اہل ہی نہیں تھی۔اس کے خیال میں، کارروائی کے سارے طریقہ میں تبدیلی درکار ہے۔

آپریشن راہ نجات۔اکتوبر2000ء سے تا حال

مہینوں کی محنت کے بعد 17 اکتوبر 2009ء کو تیس ہزار جوانوں پر مشتمل فوج جنوبی وزیرستان بھیجی گئی تا کہ وہ ہزارہا طالبان جنگ جوؤں کا صفایا کر سکے کئی ہفتے گزر جانے کے بعد دونوں جانب سے ابتدائی کامیابیوں کے دعوے کیے گئے۔محاذ جنگ سے آنے والی اطلاعات کی تصدیق کرنا ناممکن تھا۔ کیونکہ فوج نے صحافیوں اوران کے معاونوں کو اس علاقے میں داخلے سے روک دیا تھا۔لاکھوں افراد آپریشن سے پہلے ہی اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے تھے جنگ کے پہلے دوہفتوں میں طالبان نے شدید مزاحمت کی لیکن بہت سے جنگ جوادھرادھر کے علاقوں مثلاً اورک زئی اور شمالی وزیرستان کی جانب غائب ہوگئے۔انہوں نے گوریلا کارروائیاں بھی کیں۔مثلاً: رات کے وقت پاکستانی چیک پوسٹوں پرحملہ کردیایاراستوں میں بارودی سرنگیں بچھادیں۔

پاکستانی فوج لگتا ہے، اپنی اس مہم میں شدت پسند تحریک کوشکست سے دوچار کردے گی۔ نومبر 2009ء کی ابتداء میں حملے کے تین ہفتے کے بعد، حکیم اللہ محسود نے کہا تھا۔ بزدل جہنم میں جائیں گے۔ یہ الفاظ اس بات کا اشارہ ہیں کہ (پاکستان طالبان کے مابین) سب کچھ ٹھیک نہیں ہے عبداللہ محسود اور ترکستان بھٹانی، دونوں TTP مخالف گروپ جنوبی وزیرستان میں پاکستانی فوج کے ہمراہ مقابلے پر آ گئے۔حکومت کو اس کا حقیقی فائدہ ہوا کیونکہ قبائلی اپنے علاقے اوراس کے پُر پیچ راستوں سے بخوبی واقف ہیں۔ان دونوں گروپوں نے ٹانک اور ڈی آئی خان میں امن قائم رکھنے کی بھی خاصی کوششیں کی ہیں کیونکہ TTP جنگ جو وزیرستان کی پہاڑیوں میں جا چھپے ہیں مزید براں، جنوبی وزیرستان سے نکلنے والے ہزارہا مہاجرین TTP کے خلاف ہو گئے ہیں اور وہ اسے موجودہ جنگ کا ذمہ دار قرار دے رہے ہیں۔

پاکستانی طالبان مخالف قبائلی ملیشیا یا لشکر کی تشکیل دن بدن مقبول ہوتی جارہی ہے۔اسے پاکستانی حکومت کی مکمل حمایت حاصل ہے۔اس نے محسود قبائل کے عمائدین پر مبینہ طور پر (ایسی ملیشیا بنانے کے لیے) دباؤ ڈالا ہے اور انھیں مکمل تحفظ اور مالی معاونت کی یقین دہانی کرائی ہے۔ ساتھ ہی انھیں بتایا گیا ہے کہ حمایت نہ کرنے کی صورت میں انھیں دی گئی تمام مراعات ختم کر دی جائیں گی۔

جنوبی وزیرستان میں معروف برطانیہ مخالف شہزادہ فضل دین محسود کا بیٹا ہمایوں خان ایسے کسی وزیرستانی قبائلی لشکر کا ممکنہ سربراہ ہوسکتا ہے تاہم اسے کمیونٹی کی عملی حمایت حاصل نہیں کیونکہ

مقامی عمائدین حکومت پر اعتبار کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اگر حکومت نے قبائل سے ایک اور امن معاہدہ کر لیا (جس کی توقع بھی ہے) اور شدت پسند اپنے مضبوط گڑھ وزیرستان لوٹ آئے تو لشکر کے جنگ جوؤں کو طالبان کی جانب سے شدید مخاصحانہ صورتِ حال کا سامنا ہوگا۔

جس طرح آپریشن راہِ نجات نے TTP کو شمالی وزیرستان میں پناہ لینے پر مجبور کیا ہے، ویسے ہی جنگ جوؤں نے پوری ایجنسی میں اپنے تیرہ ٹھکانے بنا لیے ہیں جن میں سپالی گاہ، میراں شاہ، میر علی، دیگن اور دتہ خیل شامل ہیں۔ محسود طالبان شدت پسند جنوبی وزیرستان میں فوجی چیک پوسٹوں اور فوجی کیمپوں پر حملے کرنے کے لیے انہی ٹھکانوں سے متحرک ہوتے ہیں۔ TTP کے رہنما حکیم اللہ (اگر وہ امریکی ڈرون حملے سے بچ گیا ہے تو)، ولی الرحمٰن، قاری حسین اور اعظم طارق آج کل حافظ گل بہادر کی پناہ میں، اپنے بال بچوں سمیت شمالی وزیرستان میں مقیم ہیں۔

لدھا میں طالبان کے امیر شاہین محسود کے نائب سراج محسود کے مطابق، پاکستانی فوج کے خلاف گوریلا کارروائیوں کے لیے، وزیر اور دور قبائل کے لوگ 30 سے 50 کی ٹولیوں میں یہاں آتے ہیں۔ دس بارہ دن ٹھہرتے ہیں اور پھر شمالی وزیرستان چلے جاتے ہیں، جہاں سے مزید نئے لوگوں کا گروہ اسی طرح کی کارروائیوں کے لیے بھیج دیا جاتا ہے اور یوں یہ چکر چلتا رہتا ہے۔

جنوبی وزیرستان میں امریکی ڈرون حملے

2008ء کے موسم گرما میں (شمال مغربی پاکستان میں) شروع ہونے والا امریکی ڈرون حملوں کا یہ پروگرام ڈرامائی رفتار سے آگے بڑھا ہے۔ 2008ء میں 38 ڈرون حملے ہوئے جبکہ 2009ء میں ان کی تعداد 53 تھی۔ ان حملوں میں القاعدہ، ازبک جنگ جوؤں اور تحریک طالبان پاکستان کے اہم رہنما بشمول بیت اللہ محسود (اگست 2009ء میں) مارڈالے گئے انہی حملوں کے نتیجے میں طالبان کمانڈروں اور ان کے سپاہیوں نے اپنی آپریشنل سکیورتی میں اضافے کے اقدامات کیے ہیں۔ وہ کھلی جگہوں پر اکٹھے ہونے اور دن کے دوران گاڑیوں کے ذریعے سفر کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ فون کا استعمال بہت کم کر دیا ہے اور قابل اعتماد ایجنٹوں کے ذریعے پیغامات بھیجے جاتے ہیں۔ طالبان لیڈر اپنی آمدورفت کو بہت خفیہ رکھتے ہیں یہاں تک کہ اپنے نائبین کو بھی لاعلم رکھتے ہیں حالانکہ حملوں سے بچنے کے لیے اکثر اوقات انھیں اپنی جگہیں بدلنا پڑتی ہیں۔

جنوبی وزیرستان میں اہم قبائل کا ایک طائرانہ جائزہ

فاٹا کی دوسری قبائلی ایجنسیوں کی طرح، جنوبی وزیرستان بھی مختلف النوع قبائل کا گھر ہے۔ ان میں اہم ترین محسود، احمد زئی، وزیر، بھٹانی، اُرمر برکس، سلیمان خیل اور دوتانی ہیں۔

MashalBooks.org

تاریخی اہمیت اور آبادی کے لحاظ سے محسود سب سے بڑا قبیلہ احمد زئی اور بھٹانی قبائل اس کے بعد آتے ہیں۔ فاٹا کے قبائل معاشرے میں عمائدین انتہائی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ تاہم 1979ء میں افغانستان پر سوویت حملے اور علاقے میں مذہبی گروہوں کی اسلامی احیاء کے تصور کی بنا پر ان عمائدین کا کردار کم ہو گیا ہے۔ حالیہ سالوں میں طالبان کمانڈروں نے اپنے علاقوں اور قبائل میں ان عمائدین کی جگہ لینا شروع کر دی ہے۔ تاہم ان کے کردار کی اہمیت اب بھی باقی ہے اور ان کا روایتی کردار مکمل طور پر ختم نہیں کیا جا سکا۔

نیچے دیئے گئے چارٹ میں (جنوبی وزیرستان کے) اہم انتظامی مراکز یا تحصیلوں کے نام اور ان میں مقیم قبائلی شاخوں کی تفصیل دی گئی ہے۔

(1)	لدھا تحصیل	شامان خیل، لانگر خیل، گڑی اشانگی، میل خیل، شمیری، سید، شوبی خیل، اُرمُر برکی، بابا خیل، بودن زئی، سلاموتی، گلی شائی، ملک دینائی۔
(2)	مکین تحصیل	عبدالائی، امر خیل، ملک شئی، اشانگی، شوبی خیل، بند خیل، نذر خیل۔
(3)	سراروگا تحصیل	شامان خیل، گلی شائی، شمیری، لانگر خیل، ہیبت خیل، جلال خیل، شوبی خیل، گوای خیل، عبدالائی، اشانگی، ملک شئی، فریدی، ککاری، ہرائے خیل، کئی خیل۔
(4)	تیارزہ تحصیل	مچی خیل، نکزان خیل، عبدالرحمٰن خیل، پرائے خیل، لانگر خیل، باند خیل
(5)	شوال تحصیل	جلال خیل، شوبی خیل، ہیبت خیل، عبدلائی۔
(6)	سروا کئی تحصیل	جلال خیل، مچی خیل، عبدالرحمٰن خیل، نکزان خیل، فریدی، ککاری
(7)	وانا (احمد زئی وزیر)	زالی خیل، یار گل خیال، کاکا خیل، خونی خیل، کھوجل خیل، سرکی خیل، گنجی خیل، توجی خیل، مغل خیل،

محسود قبیلہ

یہ قبیلہ جنوبی وزیرستان کے وسطی علاقے میں رہتا ہے اور اس کی زیادہ تر آبادی مکین، لدھا، سراروگاہ، سپن کئی، راغ زئی اور کوٹ کئی میں ہے۔ محسود قبیلے کی تین اہم شاخیں ورمی ماسد ہے (جس کی ایک شاخ علی زئی ہے، اس کی مزید تقسیم میں شوبی خیل اور مالا زئی ہیں) بہلول زئی: اس میں اشانگزئی شامل ہیں اور تیسرا شامان خیل ہے۔ مان زئی تعداد میں سب سے زیادہ ہیں۔ بہلول زئی اور شامان خیل عددی طور پر اس سے کم ہیں۔ محسود قبائل کی تعداد جنوبی وزیرستان میں (اندازاً) ساڑھے چھ سے سات لاکھ تک ہے۔

MashalBooks.org

تحریک طالبان پاکستان کی لیڈرشپ کی اکثریت کا تعلق اسی قبیلے سے ہے۔ بیت اللہ محسود کا تعلق شوبی خیل شاخ سے تھا اسی طرح حکیم اللہ اور قاری حسین بہلول زئی شاخ کے اشانگی حصے سے تعلق رکھتے ہیں۔ تحریک میں سرگرم، قبیلے کی دوسری شاخوں میں عبدالائی، کیا خیل، لانگر خیل اور ہیبت خیل شامل ہیں۔

وانا کے احمد زئی وزیر قبیلہ

احمد زئی وزیر محسودوں کے کزن ہیں اور جنوبی وزیرستان مغربی اور جنوبی حصوں میں آباد ہیں۔ محسودوں کی نسبت ان کی تعداد زیادہ نہیں۔ یہ تقریباً ڈیڑھ سے دو لاکھ لوگ ہیں لیکن علاقے کا انتظامی مرکز وانا ان کے کنٹرول میں ہے۔ احمد زئی وزیر قبیلے کی نو شاخیں ہیں۔ زالی خیل جن میں سب سے بڑا ہے 2003ء سے 2007ء تک پاکستانی طالبان کی سربراہی یارگل خیل کے لوگوں کے ہاتھ میں تھی۔ (یہ زالی خیل کی سب سے بڑی شاخ ہے) احمد زئی وزیر کا سپریم کمانڈر ملا نذیر کاکا خیل سے تعلق رکھتا ہے (کاکا خیل زالی خیل کی سب سے چھوٹی شاخ ہے) ملک حنان اور ملنگ وزیر قبیلے کے اہم عمائدین میں سے ہیں۔

جندولہ کا بھٹانی قبیلہ

یہ جنوبی وزیرستان کا تیسرا بڑا قبیلہ ہے اور یہ ایجنسی کے مغربی علاقے میں آباد ہیں، ٹانک اور ڈیرہ اسمٰعیل خان کے بارڈر کے ساتھ ساتھ۔ اگرچہ اس کی تعداد 70 سے 80 ہزار تک ہے تاہم سرحد سے جنوبی وزیرستان میں داخلے کا راستہ ان کے زیرتسلط ہے۔ محسود اور وزیر قبائل ایجنسی سے باہر جانے اور آنے کے لیے یہی راستہ استعمال کرتے ہیں۔ عصمت اللہ شاہین، ترکستان بھٹانی اور شبیر رحمان بھٹانی قبیلے کے عمائدین ہیں۔

کانی گروم کا اُرمُر برکی قبیلہ

یہ سات سے دس ہزار افراد پر مشتمل چھوٹا سا قبیلہ، ایک تاریخی قصبے کانی گرم کا باسی ہے۔ کانی گرم لدھا کے قریب نیچے کی طرف واقع ہے اور چاروں طرف سے محسود قبیلے سے گھرا ہوا ہے۔ اومر برکی قبیلے کے لوگ اپنی زبان ''اُرمُر'' بولتے ہیں۔

دوتانی قبیلہ

دس ہزار افراد کا یہ قبیلہ جنوبی وزیرستان کی جنوبی سرحد کے قریب (بلوچستان کی ژوب ضلع کی بالائی جانب) رہتا ہے۔

مقامی آبادی کی مشکلات و مسائل: طالبان کا عروج وزوال

2003ء سے پہلے جنوبی وزیرستان کے باشندوں میں نااہل اور مبینہ طور پر کرپٹ مقامی انتظامیہ کی وجہ سے بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ روزگار کے مواقع، آمدورفت کی سہولتیں، سڑکیں، سکول اور ہسپتال مقامی آبادی کے لیے نہ ہونے کے برابر تھے۔ پولٹیکل ایجنٹ اور قبائلی لیڈرز، مکین، لدھا، سراروگاہ، ساروا کی اور دوا کے علاقوں میں قائم اسکولوں اور اسپتالوں کو اپنے دوستوں کے لیے ذاتی گیسٹ ہاؤس کے طور پر استعمال کرتے تھے۔قبائلی عمائدین اور ان کے خاندان کے افراد کو سکول اساتذہ اور اسپتالوں کے سٹاف کی تنخواہیں بطور تحفہ یا رشوت دے دی جاتی تھیں۔ اساتذہ کو اپنے فرائض کی انجام دہی کے بغیر، تنخواہیں ملتی تھیں۔ اسپتالوں میں سٹاف ہی نہیں ہوتا تھا۔ ڈاکٹرز اور ایڈمنسٹریٹرز، ایمبولینسز کو ذاتی استعمال میں رکھتے تھے۔ رشوت اور کرپشن ہر جگہ دیکھی جا سکتی تھی۔

بے چینی اور پریشانی کے اس ماحول میں، طالبان نے 2003ء میں پورے جنوبی وزیرستان پر قبضہ جما لیا۔ مقامی قبائلیوں کا خیال تھا کہ طالبان اساتذہ اور ڈاکٹرز کو اپنے فرائض انجام دینے پر مجبور کریں گے اور مقامی سیاسی سسٹم میں کرپشن کو ختم نہیں تو کم ضرور کر دیں گے۔ پہلے سال یا اس کے لگ بھگ، طالبان نے پیشہ ورانہ خدمات کی فراہمی پر خاصا دباؤ ڈالا۔ انصاف کی فوری فراہمی کے لیے لوگوں کو مارا گیا یا انھیں علاقے سے نکال دیا گیا۔ اس سے دوسروں کو عبرت ہوئی کہ اگر وہ پکڑے گئے تو انھیں خوفناک نتائج یقینی موت کا سامنا کرنا ہوگا۔ ساتھ ہی طالبان نے جہاد کے لیے ٹیکس بھی نافذ کر دیا تاکہ اتحادی افواج اور پاکستانی فوج کے خلاف جنگ کے لیے فنڈز فراہم کیے جا سکیں۔ جنوبی وزیرستان کے سنی العقیدہ، بنیاد پرست مسلمان مغربی افواج کے خلاف جہاد کے سادہ سے نظریے سے خاصے متاثر ہوئے تاہم پاکستانی طالبان کے گروہوں نے ایک زبردست تزویراتی غلطی کی۔ انہوں نے ایجنسی کے اندر قبائلی ڈھانچے پر ہی حملہ کرنا شروع کر دیا یہ قبائلی ڈھانچے نسلوں سے اس سماج کی بنیاد بنے ہوئے تھے۔ شدت پسندوں نے 200 سے زائد قبائلی سرداروں اور عمائدین کو چپ سادھ لینے یا علاقے سے باہر جانے پر مجبور کر دیا یا قتل کر ڈالا۔ یہ عمائدین حکومت اور قبیلوں کے درمیان پل کا کام دیتے تھے۔

طالبان کو خوف تھا کہ شدت پسندوں اور حکومت کے مابین تصادم کی صورت میں قبائلی عمائدین طالبان مخالف لشکر تشکیل دے سکتے ہیں۔ اور مقامی لوگوں کو طالبان کے خلاف جمع کر سکتے ہیں۔ چنانچہ 2000ء کے دورانیے میں جب طالبان نے علاقے میں اپنی طاقت مجستمع کی تو درحقیقت اپنی غیر مقبولیت کی بنیاد خود ہی رکھ دی۔

جوں جوں جنوبی وزیرستان میں طالبان طاقت ور ہوتے گئے، ان کے مقامی کمانڈروں

MashalBooks.org

کا قبائلیوں کے ساتھ رویہ انتہائی ظالمانہ ہوتا گیا۔ وہ جرائم کے مرتکب طالبان کو سزا دینے سے گریز کرتے اور دوسروں کے خلاف فوراً ہی بدزبانی پر اتر آتے۔ پھر انہوں نے معمولی چوروں کو بھی تحریک میں شامل کر لیا طالبان پر رشوت لینے اور مقامی حکام کو رشوت دینے کے الزامات بھی لگے۔ مزید براں تحریک کی ہی وجہ سے فوجی آپریشن کا آغاز ہوا جس کی وجہ سے ہزاروں لاکھوں قبائلیوں کو اپنا گھر بار چھوڑنا پڑا جس سے عام آبادی طالبان کے خلاف ہوگئی اور آخر میں تحریک طالبان پاکستان کے بھیجے ہوئے خودکش بمباروں کی وجہ سے کثیر معصوم شہریوں کی ہلاکتیں ہوئیں جس کی وجہ سے جنوبی وزیرستان کے لوگوں میں طالبان سے برگشتگی مزید بڑھ گئی۔

منصور خاں محسود اسلام آباد میں قائم تھنک ٹینک فاٹا ریسرچ سنٹر میں ریسرچ کوآرڈی نیٹر ہیں وہ کئی این جی اوز کے لئے کام کرتے رہے ہیں۔

MashalBooks.org

وادی سوات میں شدت پسندی اور تصادم

داوٗد خان خٹک۔ اپریل 2010ء

سوات مالاکنڈ ڈویژن کے ساتھ اضلاع میں سے ایک ہے۔ ہندوکش کے سیاحوں کے لیے کبھی یہ منزل انتہائی پرکشش تھی۔ یہ پشاور کے شمال مشرق میں 170 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اگرچہ اپنے خوبصورت مناظر کی وجہ سے سوات کو ایشیا کا سوئٹزرلینڈ کہا جاتا تھا تاہم 2000ء کے ابتدائی سالوں میں طالبان کے ظہور اور بعدازاں پاکستان کے فوجی آپریشنز کی وجہ سے یہ نام، دنیا میں اور بھی، پہچانا جانے لگا۔ طالبان نے سوات کے پرامن علاقے میں تباہی مچادی۔ طالبان مخالف سینکڑوں لوگوں کو گولیوں کا نشانہ بنا دیا گیا، ان کے سر قلم کیے گئے، اغوا کرلیا گیا یا انھیں علاقے سے باہر نکال دیا گیا۔ بدامنی اور خون ریزی کی انتہا ہوگئی۔ پاکستان میں ہر جگہ اس کا شدید ردعمل ہوا اور حکومت اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے انتہائی اقدام پر مجبور ہوگئی۔ چنانچہ اپریل 2009ء میں آپریشن راہ نجات شروع کیا گیا۔ اس حملے میں سوات میں موجود شدت پسند طالبان کا صفایا کردیا گیا۔ چھ سو جنگ جو طالبان اور ان کے کمانڈر مارے گئے تاہم پچیس لاکھ لوگوں کو اس آپریشن کے دوران بے گھر ہونا پڑا۔ آپریشن کے دوران بہت سے معصوم شہری بھی جنگ کا ایندھن بنے۔ فوج کی ہوائی جہازوں سے بمباری اور زمینی شیلنگ کے ذریعے لاتعداد گھر تباہ ہوگئے۔ آپریشن کے اختتام پر وسط جولائی میں لوگ اپنے گھروں کو واپس ہوگئے طالبان کا خاتمہ ہوگیا ہے تاہم اکا دکا واقعات اب بھی ہوتے رہتے ہیں۔

سوات میں بغاوت کا ڈھانچہ

مالاکنڈ اور سوات میں شدت پسندی کی جڑیں اس وقت سے ہیں جب سوات والی سوات کے تحت آزاد ریاست ہوتا تھا۔ 1969ء میں اسے پاکستان میں شامل کرلیا گیا 1949ء میں والی سوات میاں گل عبدالودود اپنے بیٹے میاں گل جہاں زیب کے حق میں دست بردار ہوگیا۔ نئے والی گل جہاں زیب کا دور وادی کی تاریخ کا سنہری دور کہا جاتا ہے۔ سکول، اسپتال، سڑکیں اور ذرائع مواصلات، سب کچھ اسی دور میں تعمیر ہوا۔ پوری وادی امن کا گہوارہ تھی۔ انصاف کے اہم

MashalBooks.org

معاملات کا فیصلہ، اپنے وزیروں اور قبائلی اسمبلی یا جرگے کی مدد سے، والی، چند دنوں کے اندر، خود کرتا تھا۔ تاہم 1969ء میں ریاست کے پاکستان میں ادغام کے بعد، وادی میں مزید ترقی نہیں ہو سکی۔ چند ایک سکول بنائے گئے اور عدالتی نظام ایسا بنا کہ دیوانی یا فوجداری، دونوں ہی مقدمات سالوں تک لٹکے رہنے لگے۔ اس صورت حال نے لوگوں میں بے چینی پیدا کرنی شروع کر دی۔ وادی سوات، افغان سرحد کے قریب ہونے کے باوجود، 1980ء کے عشرے کی سوویت افغان جنگ سے زیادہ متاثر نہیں ہوئی۔ البتہ جب طالبان افغانستان میں برسر اقتدار آئے تو مذہبی شدت پسندوں کو روس کے خلاف جنگ آزادی کے ہیرو کی حیثیت میں ایک عمومی حمایت ضرور ملی۔ یہ تصور دوران جنگ پاکستان میڈیا نے پیدا کیا۔ جس نے اس جدوجہد کو جہاد کا اور لڑنے والوں کو مجاہدین کا نام دیا۔ بہت سے جہادی لیڈر بسوں، ٹرکوں اور پک اپ میں، اپنے گن مینوں کے ہمراہ سوات کے گلی کوچوں میں آزادی سے گھومتے پھرتے، روس کے خلاف اپنے کارنامے بیان کرتے۔ سوات میں افغان طالبان کی حمایت کے اس تصور نے، جزوی طور پر صوفی محمد کے عروج میں اہم رول ادا کیا۔

صوفی محمد

وادی سوات میں بدامنی کی علامات مذہبی رہنما صوفی محمد کے ابھرتے ہوئے طاقت ور تشخص کے ساتھ ہی ظاہر ہونے لگی تھیں۔ وہ ضلع لوئر دیر کے علاقے میدان میں جماعت اسلامی کے ایک مقامی لیڈر تھے تحریک نفاذ شریعت محمدی کی ابتدائی تشکیل بھی انہوں نے یہیں پر کی۔ ان کا تعلق لوئر دیر کے علاقے قمبر سے ہے جہاں انہوں نے مذہبی تعلیم حاصل کی۔ 1985ء میں وہ جماعت اسلامی کے رکن کے طور پر، گاؤں کی مقامی کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔ 1980ء کے عشرے میں وہ جماعت کے خاصے سرگرم کارکن تھے تاہم کچھ عرصے بعد جماعت سے مایوس ہو گئے اور میدان واپس آ کر ایک مسجد میں امام ہو گئے اور کسی مدرسے میں پڑھانے لگے۔ انہی دنوں انہوں نے نفاذ شریعت کے لیے ایجی ٹیشن شروع کر دیا۔ صوفی محمد خاموش طبع انسان ہیں اور ان میں کوئی خاص کرشماتی خصوصیت نہیں۔ ان کی گفتگو میں سلاست اور روانی ہے اور وہ دوسرے ملاؤں کی طرح غصیلے بیانات نہیں دیتے۔

1990ء کی دہائی کے شروع میں، صوفی محمد نے وادی میں محدود پیمانے پر، ایک نسبتاً پرامن مہم، نفاذ شریعت کے لیے شروع کی لیکن آہستہ آہستہ تحریک میں شدت پسندی کا رنگ آتا گیا۔ مالاکنڈ میں آہستہ رو عدالتی نظام اور مقامی حکام کی کرپشن نے صوفی محمد کے ساتھیوں کو بری

طرح بھڑکا دیا۔انہوں نے یہ نعرہ لگانا شروع کردیا:''شریعت یا شہادت''

1994ء میں صوفی محمد کے کالی پگڑی والے ساتھیوں نے اپنے مطالبات کے سلسلے میں حکومتی بے حسی کے خلاف روڈ بلاک کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔سڑکیں بلاک کرنے کا وہی طریقہ، جو جماعت اسلامی کے قاضی حسین احمد نے بھی اپنے مطالبات کے حق میں استعمال کیا۔ تاہم صوفی محمد نے 1984ء میں تحریک نفاذ شریعت(TNSM) کے قیام کے ساتھ ہی جماعت اسلامی سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ روڈ بلاک ہونے سے شدت پسندوں اور سیکورٹی اداروں کے درمیان تصادم، ہوااوراس طرح 16 مئی 1994ء کوضلع بونیر میں گیارہ افراد کا مارا جانا، مالاکنڈ میں شریعت کے حامیوں کی طرف سے لاقانونیت اور بدامنی کی پہلی مثال بنا۔

اس دوران صوفی محمد کے حامیوں اور حکومتی حفاظتی اداروں کے درمیان بارہا تصادم ہوا اوراس میں طرفین کے لوگ بھی مارے گئے۔نومبر 1994ء میں یہ بغاوت ختم ہوئی۔طرفین نے ایک معاہدہ کیا جس کے مطابق حکومت نے (مالاکنڈ میں) نظام عدل ریگولیشن کے نفاذ کا وعدہ کیا۔ اس معاہدے کوحکومت کی طرف سے ایک زبردست رعایت اور صوفی محمد کے حامیوں کی فتح سمجھا گیا تاہم اس کے بعد مسلح بغاوت ختم ہوگئی۔ 1990ء کی دہائی کے آخیر میں سوات اور مالاکنڈ میں صوفی محمد کی مقبولیت ختم ہوکر رہ گئی کیونکہ بغاوت کے دوران بہت سے لوگ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔خودصوفی محمد کو بھاگ کر جان بچانا پڑی اور بعد میں وہ حکومت کے ساتھ مذاکرات میں شریک ہوگئے۔ان کے حامیوں نے سوال اٹھایا کہ پہلے انہوں نے تصادم کی کیفیت پیدا کردی اور بعد میں خود روپوش ہو گئے۔صوفی محمد نے اپنا امیج بحال کرنے کے لیے بہت محنت کی۔ افغانستان میں قائم طالبان حکومت کوسوات کے پختون باشندوں میں مقبول بنانے کی کوشش بھی کی۔ان دنوں پاکستان کا واحد سرکاری ٹی وی بھی افغانستان میں طالبان کی کامیابیوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا کرتا تھا۔گیارہ ستمبر 2001ء کوامریکہ میں دہشت انگیز حملوں نے صوفی محمد کوایک بار پھر طاقت کا مظہر بنا ڈالا۔اور وہ سوات (دیر، بونیر اور شانگلہ نیز باجوڑ اور مہمند کے قبائلی علاقوں) سے دس ہزار لڑاکا رضا کاروں کا لشکر لے کر امریکی فوجوں سے جنگ کرنے افغانستان کی طرف چل پڑے۔

تاہم سوات اور دیر کے شہری اپنے قریبی رشتہ داروں کواس طرح افغانستان لے جانے پر صوفی محمد سے خوش نہیں تھے۔انہوں نے ان کی موت اور گم شدگی کا صوفی محمد کو ذمہ دار ٹھہرایا۔ حکومت نے غیر قانونی طور پر سرحد پار کرنے اور امریکی فوج سے لڑنے کے جرم میں صوفی محمد کو سات سال کے لیے ڈی آئی خان کی جیل میں قید کر کے اس کی بہت بڑی مدد کی۔اس دوران

MashalBooks.org

لوگوں کا غم وغصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ان دنوں تحریک نفاذ شریعت پر پابندی لگا دی گئی تھی۔

مولانا فضل اللہ

2001ء میں صوفی محمد کی گرفتاری سے وادی سوات کے شدت پسندوں کے لیے بڑا خلا پیدا ہو گیا۔صوفی محمد کے داماد فضل حیات نے، جو افغان جنگ میں اور وہاں سے واپسی پر سترہ ماہ تک جیل میں بھی ان کے ساتھ رہا تھا، خود کو آگے بڑھایا اور سوات کے ایک چھوٹے قصبے امام ڈھیری کی ایک چھوٹی سی مسجد میں، جسے اسلامی رنگ دینے کے لیے اس کا نام ''امام ڈھیری'' رکھ دیا اور تبلیغ کرنے لگا تاہم خود کو زیادہ اسلامی ظاہر کرنے کے لیے اس نے اپنا نام بدل کر فضل اللہ رکھ لیا۔کبھی وہ فضہ گھاٹ کے ایک Resort میں کام کیا کرتا تھا اور برملا کہتا تھا کہ وہ کوئی عالم نہیں ہے تاہم اس نے سوات میں نفاذ شریعت کی وکالت جاری رکھی۔

ابتداء میں فضل اللہ مام ڈھیری کی مسجد میں بچوں کو قرآن پڑھایا کرتا تھا۔ 2004ء میں جب اس نے اپنی غیر قانونی چینل پر وعظ کرنا شروع کیا تو اس کے لہجے میں نرمی کے بجائے سختی اور درشتی آ گئی۔لوگوں نے جانی اور مالی، ہر طرح کی امداد اسے دینا شروع کر دی۔اس کا نام ہی ''مولانا ریڈیو'' پڑ گیا۔فضل اللہ نے اپنی پہلی ریڈیائی تقریر میں عام سی باتیں کی تھیں مگر جلد ہی اسے قدامت پرست پختونوں اور جیل میں قید صوفی محمد کے حامیوں کی پرزور حمایت ملنی شروع ہو گئی۔دبئی اور سعودی عرب میں ملازم افراد بھی اس کے حامی ہو گئے، جن کے گھرانے مقامی علاقوں میں اس کے پیغامات پھیلانے لگے۔فضل اللہ کا اثر اتنا بڑھا کہ عورتوں نے اپنے بندے، چوڑیاں اور گلے کے ہار تک اتار کر اسے چندے میں دے ڈالے۔

وہ اپنے وعظ میں لوگوں کو پانچ وقت نماز پڑھنے اور گناہوں سے بچنے کا کہا کرتا۔اس نے امریکہ کے خلاف بھی تبلیغ شروع کی اور افغان طالبان کے خلاف امریکی مداخلت اور افغانستان پر فوجی حملے پر لوگوں کی خصوصی توجہ دلائی۔

جونہی اس کے سامعین کی تعداد بڑھی، اس نے والدین کو بچیوں کو سکول بھیجنے ٹی وی دیکھنے اور موسیقی سننے سے منع کرنا شروع کر دیا۔وہ ان زمینداروں پر کڑی تنقید کرتا جو اس کے مدرسے کو چندہ دینے سے انکار کرتے تھے۔مقامی ذرائع کے مطابق، پاکستانی تجزیہ نگار امتیاز علی کا خیال ہے: ''تحریک نفاذ شرعی اور اس کے سخت مذہبی تصورات کے سائے میں ایک پوری نسل پل کر جوان ہو گئی ہے جس سے فضل کو لڑاکوں کا ایک بنا بنایا گروہ دستیاب ہو گیا۔'' 2007ء میں جب فضل اللہ نے ٹی وی پر تنقید کی تو جواب میں سوات کے مقامیوں نے اپنے ہزاروں ٹی وی سیٹ جلا کر راکھ

کر دیئے۔

فضل اللہ کی شعلہ بیانی نے ہر کسی کو متاثر کیا چاہے وہ گھریلو خواتین ہوں، مزدور ہوں یا زمیندار ایک کثیر تعداد تھی جو گندم کا آٹا، کھانے کا تیل اور چینی بطور عطیہ دینے گھروں سے نکل آئی۔ بہت سے لوگوں نے تعمیراتی کام کے لیے سیمنٹ اور اینٹیں فراہم کرنا شروع کر دیں۔ فضل اللہ نے سوات کے لوگوں کو سماجی انصاف کی فراہمی کے ساتھ ساتھ، آخرت میں جنت کی نوید بھی دی۔ سوات کے لوگ، جو پاکستانی عدالتی نظام سے بری طرح بدظن ہو چکے تھے اور اپنے والی کا سنہری دور یاد کرتے تھے، فضل اللہ کی تقریروں میں انھیں اچھے مستقبل کی جھلک دکھائی دی۔ فضل اللہ نے اور اس سے پہلے صوفی محمد نے اہل سوات کی اس ذہنیت کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ بقول ایک تجزیہ نگار مختار خان کے ''وہ جمہوریت یا کسی اور طرز حکومت کی نسبت شخصی حکمرانی کے زیادہ عادی تھے۔'' انہوں نے اپنے گرد ایسا ہی ایک دلکش تشخص ابھارا اور کامیاب رہے۔ مثلاً: فضل اللہ نے ایک (دومنزلہ) مدرسہ تعمیر کرنے کے لیے 35 ملین روپے اپنے حامیوں سے اکٹھے کیے۔ اس مدرسے کو پاکستانی فوج نے 2009ء کے موسم بہار میں تباہ کر دیا۔

پولیو ویکسی نیشن کے خلاف فضل اللہ کی مہم کو پورے پاکستان میں ''وارننگ'' کی علامت کے طور پر لیا گیا۔ ویکسی نیشن کو اس نے مسلمانوں کی آبادی میں اضافے کو روکنے کے لیے یہودیوں اور عیسائیوں کی سازش قرار دیا۔ ستمبر 2007ء میں فضل اللہ کے حامیوں نے سوات میں مہاتما بدھ کے صدیوں پرانے مجسموں اور قبل از تاریخ، چٹانوں پر بنائے گئے نقش ونگار کو ختم کرنے کی کوشش کی کیونکہ ان کے خیال میں یہ سب غیر اسلامی تھی۔ (طالبان نے بین الاقوامی احتجاج کے باوجود، 2001ء میں بامیان میں موجود مہاتما بدھ کے دیوہیکل مجسموں کو بموں سے اڑا دیا تھا) فضل اللہ کے کہنے کے مطابق، اس نے ٹی وی سیٹ، ویڈیو آلات، کمپیوٹرز، اور کیمرے (جن کی مالیت 20 ملین روپے تھی) صرف اس لیے جلا کر راکھ کر دیئے کہ یہ گناہ کا بنیادی ذریعہ ہیں۔'' اس نے جامع انداز میں کہا ''ہر طرح کے گناہ بشمول موسیقی، رقص، شراب نوشی میں ڈوبے ہوئے معاشرے کو ٹھیک کرنے کے لیے ہمیں اپنی تحریک اور اپنے کام کو دوبارہ منظم کرنا ہوگا۔ اس کے علاوہ کوئی اور چارہ ہے ہی نہیں۔''

صوفی محمد کی طرح، فضل اللہ نے بھی سماجی برابری، فوری انصاف، شہری سہولتوں کی فراہمی، سواتیوں کے لیے زیادہ روزگار اور جائیداد کی دوبارہ تقسیم کی بات کی۔ سوات میں زمین کی تقسیم کے وعدے نے بہت سے لوگوں کو فضل اللہ کی تحریک کا حامی بنا دیا۔ انہوں نے (مقامی خانوں، رہنماؤں اور زمینداروں) باغات، کھیتوں اور زمینوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ ان کے

MashalBooks.org

مالکان 2007ء اور 2008ء کے درمیان، فضل اللہ کے حامیوں کے ہاتھوں ٹارگٹ کلنگ کے خوف سے علاقہ چھوڑ چکے تھے۔

زیادہ تر لوگوں نے فضل اللہ کی اخلاقی حمایت کی مگر کچھ لوگوں نے اس کی ایف ایم ریڈیو کی دھواں دھار تقریروں سے متاثر ہو کر ہتھیار اٹھا لیے۔ ان میں سے اکثر انتہائی غریب، جاہل اور بے روزگار نوجوان تھے طالبان لیڈر نے یہ کہہ کر بھی عام سواتیوں کے مذہبی جذبات کو برانگیخت کیا کہ افغانستان میں غیر ملکی فوجیں موجود ہیں اور یہ جنگ اسلام اور کفر کے درمیان جنگ ہے۔ فضل اللہ نے اپنے بھائی کی موت کو (وہ باجوڑ میں ایک ڈرون حملے کا نشانہ بنا تھا۔ جنوری 2006ء) بھی اپنی حمایت بڑھانے کے لیے استعمال کیا۔ 2007ء میں اسلام آباد کی لال مسجد میں حفاظتی اداروں کی کاروائی کو بھی اس نے مقامی لوگوں میں اشتعال پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا۔ اہل سوات کی ابتدائی حمایت کے بعد، فضل اللہ کی تحریک کی مقبولیت کم ہونے لگی۔ فضل اللہ کے اسلحہ بردار لوگ سوات کی مارکیٹوں میں دندناتے پھرتے۔ مقامیوں کو انتہائی درشتی سے، اپنی بچیوں کو سکول جانے سے روکنے کا کہتے اور اپنے مخالفوں کے سر قلم کر ڈالتے تھے۔ عوام ظاہر ہے، کھل کر ان کی مخالفت نہیں کر سکتے تھے کیونکہ 2007ء کے آخر تک فضل اللہ بہت طاقتور ہو چکا تھا۔

بہت سے طالبان رنگروٹ جرائم پیشہ تھے اور وہ تحریک میں شامل ہو کر، اپنی ذاتی کمائی کا ذریعہ بنا رہے تھے۔ کچھ لوگ سواتی طالبان کے ساتھ اس لیے آ ملے تا کہ اپنے مخالفین سے بدلے چکا سکیں۔ طالبان نے جرائم پیشہ افراد کا خیر مقدم کیا تا کہ فوج کے خلاف اپنی طاقت بڑھا سکیں اور سوات کے خانوں سے، جن کے پاس اپنے مسلح محافظ تھے، بھی نمٹا جا سکے۔ یہ انتظام تھا ہی ایک دوسرے کو تقویت دینے کے لیے۔ طالبان کو طاقت ور جرائم پیشہ گروہوں کی ضرورت تھی تا کہ لوگوں کو دہشت زدہ کیا جا سکے اور پیسہ اکٹھا کیا جا سکے اور مجرموں کو اپنی جان بچانے اور مجرمانہ سرگرمیاں جاری رکھنے کے لیے ایک پردے کی ضرورت تھی۔

فضل اللہ کے جنگ جو، اسکے عروج کے زمانے میں بھی پانچ ہزار سے زیادہ نہیں تھے۔ اس کا نائب شاہ دوران، مذہبی ہونے کے ساتھ ساتھ جرائم میں بھی ملوث تھا۔ تحریک میں شامل ہونے سے پہلے وہ سوات کے مرکزی شہر منگورہ میں بچوں کے کھانے پینے کی چیزیں بیچا کرتا تھا۔ وہ مبینہ طور پر 2009ء کے آخر میں گردے فعل ہونے کے باعث، باجوڑ میں فوت ہو گیا۔ بعد میں چونکہ سوات میں طالبان کا تنظیمی ڈھانچہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا اس لیے اس کی جگہ لینے کے لیے کوئی بھی آگے نہیں آیا۔ سوات طالبان میں مسلم خان ایک اور اہم آدمی تھا وہ تحریک کا ترجمان تھا

اور آج کل فوج کی تحویل میں ہے۔ 2009ء کے فوجی آپریشن کے فوراً بعد فضل اللہ روپوش ہو گیا اور کہا جاتا ہے کہ وہ (باجوڑ میں) TTP کے نائب امیر مولوی فقیر محمد کے پاس چھپا ہوا ہے۔ فقیر محمد کے بارے میں سنا گیا کہ وہ 2009ء میں پاکستانی فوج کے ایک ہوائی حملے میں مارا گیا تھا لیکن مصدقہ اطلاعات کے مطابق وہ زندہ ہے۔

تنظیمی ڈھانچہ

سوات میں طالبان کا تنظیمی ڈھانچہ جنوبی وزیرستان کی طرح منظم نہیں تھا کیونکہ ان کا مشن صرف علاقے میں اسلامی قوانین کا نفاذ تھا اور مغربی افواج کے ٹارگٹس پر حملے ان کا مقصد نہیں تھا۔ 2000ء کی دہائی کے وسط میں اقتدار لینے کے بعد، گروپ کے لیڈر نے ایک شوریٰ تشکیل دی جس میں اراکین بدلتے رہتے تھے۔ سوات کے طالبان کا پہلا ترجمان سراج الدین تھا۔ ایک کشمیری جہادی گروپ جیش محمد سے اس کا تعلق رہا تھا۔ 2007ء میں اسے نامعلوم وجوہ کی بنا پر ہٹا دیا گیا۔ مسلم خان اس کا ترجمان بنا جو آج کل فوج کی تحویل میں ہے۔ مسلم خان پچپن سال کا مقامی باشندہ ہے۔ پشتو، اردو، انگلش اور جاپانی زبانیں بول سکتا ہے۔ 1970ء میں طالب علمی کے زمانے میں پیپلز پارٹی کے سٹوڈنٹس ونگ پیپلز سٹوڈنٹس فیڈریشن سے وابستہ رہا۔ 1990ء کے ابتدائی سالوں میں صوفی محمد کی تحریک نفاذ شریعت میں سرگرم کردار ادا کیا۔ بعد ازاں کئی سال تک ایک برٹش جہاز ران کمپنی میں کام کرتا رہا۔ نوکری کی تلاش میں وہ کویت بھی گیا۔ بعد میں امریکہ اور جاپان میں وقت گزارا۔ 1999ء میں وہ امریکہ میں کسی رنگ بنانے والے ادارے میں کام کرتا رہا۔ ایک دفعہ بی بی سی (اردو سروس) کو اس نے بتایا کہ ''امریکی حکومت ایک لعنت ہے لیکن امریکی باشندے مہذب ہیں۔'' اس نے یہ رائے بھی دی کہ وہ جاپانیوں کو سب سے زیادہ پسند کرتا ہے کیونکہ وہ سخت کوش ہیں۔ ستمبر 11، 2001ء کے بعد، وہ پاکستان واپس آیا اور اس نے میڈیکل اسٹور کھول لیا۔ ساتھ ہی وہ فضل اللہ کی مقتدر قوت کا حامی ہو گیا۔ مقامی ذرائع کا کہنا ہے کہ ایف ایم ریڈیو اسٹیشن خریدنے کے لیے مسلم خان نے بھی کچھ فنڈز فراہم کیے تھے۔

فضل اللہ مجلس شوریٰ کا سربراہ تھا۔ شوریٰ کے اراکین، کسی خاص وقت میں 30 سے 50 تک ہوتے تھے اور وہ عموماً تحریک کے کمانڈرز کی حیثیت میں کام کرتے تھے۔ یہ رکن ایک خاص علاقے کے ذمہ دار تھے اور جنگ جوؤں کے انفرادی یونٹوں کو کنٹرول کرتے تھے۔ ان جنگ جوؤں کی بطور سپاہی، خودکش بمبار، تربیت کار اور سپیشل کمانڈوز کے طور پر تخصیص بھی کی گئی۔ 2007ء میں فضل اللہ نے اپنی شاہین کمانڈو فورس کا اعلان کیا جس میں چار سے پانچ ہزار لڑاکے

شامل تھے۔ اس نے بے برقع عورتوں کے مارکیٹ میں جانے، گاڑیوں میں آلات موسیقی کی تلاش، موسیقی کی دکانوں کو بند کرنے، سینماؤں اور خواتین کے کپڑے فروخت کرنے والے سٹور کو بند کرنے کے لیے اخلاقی پولیس کے دستے بھی بنائے۔

سوات کے طالبان کا تنظیمی ڈھانچہ درج ذیل ہے:

(1) امیر: ملا فضل اللہ۔ (2) نائب امیر: شاہ دوران (مرحوم) (3) ترجمان: مسلم خان (فوج کی تحویل میں) (4) اراکین شوریٰ: سراج الدین (فضل اللہ کا سابقہ ترجمان)، مسلم خان، محمود خان (فوجی تحویل میں)، قاری مشتاق، نثار خان (کوزہ بندائی)، ابن امین (لشکر جھنگوی کا ایک رہنما، پتہ نہیں کہ وہ زندہ ہے یا نہیں) مولانا محمد عالم بنوری (ایف ایم چینل کا منتظم مارچ 2010ء میں مارا گیا)

کوئٹہ شوریٰ طالبان

ملا عمر کی کوئٹہ شوریٰ طالبان کے سوات کے طالبان کے ساتھ کوئی معلوم رابطے نہیں ہیں۔ کوئٹہ شوریٰ وزیرستان اور فاٹا کے دوسرے قبائلی علاقوں میں طالبان سے حقانی نیٹ ورک کے ذریعے رابطے رکھتی ہے۔ اس نیٹ ورک کے کرتا دھرتا عمر رسیدہ باغی رہنما جلال الدین حقانی اور ان کا بیٹا سراج الدین ہیں۔ سراج الدین ہی تحریک کا آپریشنل کمانڈر بھی ہے۔ تاہم صوفی محمد اور فضل اللہ کی ان کے ایف ایم ریڈیو پر ملا عمر اور کوئٹہ شوریٰ کے لیے (2000ء کی دہائی میں) تعریفیں ڈھکی چھپی نہیں تھیں۔ بہرحال اب دونوں گروپس کے درمیان کسی طرح کے آپریشنل رابطے موجود نہیں۔ صوفی محمد نے 2001ء میں امریکی اور نیٹو افواج سے براہ راست ٹکر لینے کے لیے سرحد پار دس ہزار زبردست جنگ جوؤں کا لشکر لے جا کر، ملا عمر کی عملی مدد کا مظاہرہ بھی کیا تھا۔ تاہم صوفی محمد کا شوریٰ طالبان کے ساتھ (کبھی بھی) براہ راست تعلق کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔

2009ء کے موسم گرما میں، طالبان کا افغانستان میں شائع کیا گیا ''ضابطہ اخلاق'' کا سوات کے جنگ جوؤں پر کوئی اثر نہیں ہوا یہ ضابطہ خاص طور سے افغانستان میں نبرآزما طالبان کے لیے تھا یا کسی حد تک وزیرستان کے لیے تھا جہاں سے سرحد پار افغانستان میں اتحادی افواج کے خلاف حملے منظم کیے جاتے تھے یا شاید سوات کے لڑاکا طالبان (TNSM) کے لیے یہ تھا ہی نہیں کوئٹہ شوریٰ طالبان کے ایک ترجمان نے مذاق میں کہا۔ ''کس قسم کے لوگ ہیں یہ؟'' وہ سوات میں سکول تباہ کرنے اور دشمنوں کے سر قلم کیے جانے کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

القاعدہ، طالبان پاکستان اور غیر ملکی جنگ جو

MashalBooks.org

2000ء کی پہلی دہائی میں، طالبان نے فضل اللہ کی سربراہی میں زور پکڑا اور پھر یہ تحریک پورے سوات میں پھیل گئی۔ مالا کنڈ میں القاعدہ کی کوئی موجودگی نہیں تھی تاہم (2009ء میں) پاکستانی فوج (کے دعوؤں کے مطابق) آپریشن کے دوران بہت سے غاروں میں جمع شدہ اسلحہ اور گولہ بارود برآمد کیا گیا۔ بہرحال کہیں بھی القاعدہ کا کوئی تعلق نہیں ملا۔

صوفی محمد کی تحریک نفاذ شریعت محمدی دو عشرے قبل تشکیل پائی تھی اور اس کے کبھی بھی تحریک طالبان پاکستان سے کسی قسم کے تعلقات نہیں رہے۔ TTP بیت اللہ محسود کی زیر قیادت 2007ء میں طالبان کے مختلف گروہوں کو (ایک چھتری تلے) متحد کرنے کے لیے بنائی گئی۔ تاہم فضل اللہ کے تحت سواتی طالبان کے TTP کے ساتھ قریبی رابطے موجود تھے کیونکہ فضل اللہ نے بیت اللہ محسود اور ملا عمر کے ساتھ یک جہتی کا اظہار 2007ء کے موسم گرما میں کر دیا تھا۔ یاد رہے یہ واقعہ اسلام آباد میں لال مسجد کے خلاف حکومتی ایکشن کے بعد پیش آیا تھا۔ جون 2009ء میں پاکستانی فوج نے مسلم خان کی بیت اللہ محسود کے کسی قریبی ساتھی سے گفتگو Interecpt کی جس میں اس نے سوات میں ہونے والے حالیہ فوجی آپریشن کے متعلق بتایا اور بیت اللہ محسود سے مدد چاہی تھی۔ بیت اللہ کے ساتھی نے وعدہ کیا کہ TTP پورے پاکستان میں خودکش حملے اور زیادہ کر دے گی اور حکومتی اور فوجی ٹھکانوں کو نشانہ بنائے گی تاکہ سوات کے فوجی آپریشن سے ان کی توجہ ہٹائی جا سکے۔ اس گفتگو کے بعد، خودکش حملوں کی تعداد کہیں زیادہ بڑھ گئی۔ تاہم وزیرستان کے رہنماؤں کے تحت طالبان جنگ جوؤں کے بالائی ڈھانچے اور ان کی فیصلہ سازی کے عمل میں فضل اللہ کا کوئی کردار معلوم نہیں ہوتا۔

بعض ازبک اور عرب جنگجو جن کی تعداد چند درجن ہو گی وزیرستان سے 2009ء کے موسم گرما میں سوات کے جنگ جوؤں کی مدد کے لیے یہاں آئے تھے۔ شاید یہ محض اتفاق تھا کہ ان کے آنے کے بعد سوات میں ٹارگٹ کلنگ اور سر قلم کیے جانے کے واقعات اور زیادہ ہونے لگے۔ تاہم مئی 2009ء میں جب فوجی آپریشن میں سختی آ گئی تو یہ غیر ملکی جنگ جو سوات سے غائب ہو گئے۔ ان کے سوات کے صرف ان جنگ جوؤں سے رابطے بنے جو باجوڑ اور مہمند کے قریبی علاقوں میں آپریشنل سرگرمیوں میں مصروف تھے۔

مالی معاونت

سوات کے طالبان کو مختلف ذرائع سے مالی مدد ملتی رہی ہے۔ فضل اللہ، ابتدائی زمانے میں، جب وہ ایف ایم ریڈیو پر قرآن کا درس دیا کرتا تھا، کا انحصار سوات کے لوگوں کے خیراتی

چندوں پر تھا، تاہم طاقت ور ہونے کے بعد، اس کے ریڈیو کے سامعین میں بھی اضافہ ہو گیا اور وہ امیروں سے بھی فنڈز اکٹھے کرنے لگا۔ کاروباری لوگوں پر ٹیکس لگایا گیا۔ مقامی خانوں کی چھوڑی ہوئی دو کانوں اور مارکیٹوں کو کرائے پر چڑھا دیا گیا۔ مزید براں، طالبان نے مقامی اور قریبی علاقوں کے ٹھیکیداروں اور انتہائی قیمتی درختوں کو کاٹنے اور اس لکڑی کو مارکیٹ میں بیچنے کی اجازت دے دی۔

2008ء میں منگورہ پر قبضہ کرنے کے بعد، قیمتی پتھروں اور موتیوں کی تین کانوں کا کنٹرول بھی سنبھال لیا۔ ان میں سے دو کانیں آپریشنل تھیں، انھیں ٹھیکیداروں کو ٹھیکے پر دے دیا۔ ''میں تمام مشینری اور سروے ورک اسی طرح چھوڑ آیا، کروڑوں کا نقصان ہوا۔ انہوں نے کان پر قبضہ کر لیا اور لوگوں سے کہا کہ کھدائی کر کے قیمتی پتھر باہر نکالیں۔'' یہ ایک ماہر ارضیات حکمت اللہ شنواری کے الفاظ میں جسے 2007ء میں پتھروں کی کان لیز پر دی گئی تھی۔

اغوا برائے تاوان بھی سوات کے طالبان کی آمدنی کا ایک اہم ذریعہ تھا کیونکہ تحریک میں خاصے جرائم پیشہ افراد شامل ہو گئے تھے۔ 2008ء کے دوران وزیرستان کے طالبان کی طرف سے بھی سوات کے جنگ جوؤں کو مدد ملتی رہی۔

سوات میں حالیہ فوجی آپریشنز

سوات میں فوجی آپریشنز کے نتائج کبھی کچھ رہے اور کبھی کچھ۔ 2000ء کی دہائی کے کئی آپریشنز ناکامی سے دوچار ہوئے اور پاکستان فوج کو مجبوراً سوات کے طالبان کو خاصی رعایتیں دینا پڑیں۔ موسم بہار 2009ء کے حالیہ آپریشنز کے ذریعے فوج نے شدت پسندوں کی تحریک پر قابو پالیا۔

آپریشن راہ نجات

وادی میں طالبان کی شدت پسند قوت میں اضافے کے باوجود 7-2006ء میں صوبائی اور وفاقی حکومت نے ان کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ وہ سی ڈی/موسیقی کی دکانیں بند کراتے رہے، عورتوں کو گھروں سے باہر نہیں نکلنے دیتے تھے، مہاتما بدھ کے مجسمے کو تباہ کرنے کی کوشش کر ڈالی۔ 7 جولائی 2007ء کو اسلام آباد میں لال مسجد کے آپریشن کے بعد فضل اللہ کو گویا نئی اہمیت مل گئی۔ اسے ایک نیا پلیٹ فارم مل گیا جس کے ذریعے وہ پاکستانی حفاظتی اداروں کے خلاف سوات میں لڑ سکتا تھا۔ اگلے چند ماہ میں، فضل اللہ کے حامیوں نے وادی میں فوجی ٹھکانوں پر خودکش حملوں کا سلسلہ شروع کر دیا اور سوات کے طالبان نے منگورہ میں عورتوں پر باہر نکلنے اور مارکیٹ جانے کی پابندیاں لگا دیں۔

MashalBooks.org

24 اکتوبر 2007ء کو صوبائی حکومت نے فضل اللہ اور اس کے ساتھیوں کے خلاف پہلا آپریشن کرنے کا اعلان کیا تا کہ سوات کی تحصیل مٹا کے 59 دیہات سے انھیں بے دخل کیا جا سکے جہاں انہوں نے متوازی حکومت قائم کر لی تھی۔ پولیس سٹیشنوں پر قبضہ کر کے ان پر ''طالبان پولیس اسٹیشن'' کی علامات بھی لکھ ڈالی تھیں۔ 31 اکتوبر تک حفاظتی فوج کے دعوے کے مطابق، ایک محدود آپریشن میں 130 شدت پسند مارے گئے تھے۔لیکن اگلے ہی دن طالبان ایک فوجی چوکی پر چڑھ دوڑے اور تقریباً 50 سپاہی گرفتار کر لیے۔ بعد میں انھیں غیر مسلح کر کے رہا کر دیا گیا۔ طالبان جنگ جوؤں کے ساتھ سختی سے نمٹنے کے ساتھ ساتھ، پولیس نے نومبر کے شروع میں مٹہ اور خوازخیلہ کے شہروں میں موجود سارے پولیس اسٹیشن طالبان سے خالی کرا لیے۔

پاکستانی فوج نے راہ نجات کا پہلا مرحلہ نومبر 2007ء میں شروع کیا نومبر کے دوران جنگ جوؤں سے اور فوج کے درمیان زبردست جنگ ہوئی۔فوج نے جس میں بھاری آرٹلری استعمال کی شدت پسندوں نے تمام حکومتی عمارات، پولیس سٹیشن اور دوسری پبلک جگہیں بشمول امام ڈھیری میں فضل اللہ کے ہیڈکوارٹر کے، خالی کر دیں۔ اور دسمبر کے آخر تک وہ پیچھے ہٹ کر، پہاڑوں میں چلے گئے۔

اپنی پسپائی کے باوجود طالبان نے 2008ء کے موسم بہار تک، پہاڑوں سے ہی، حملہ کرو اور بھاگ جاؤ، جیسی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ انہی دنوں عوامی نیشنل پارٹی نے اقتدار سنبھالا۔ اس وقت لاقانونیت بے پناہ بڑھ چکی تھی۔ سرحد حکومت کی فروری 2008ء کی ایک رپورٹ کے مطابق، ایک سال کے اندر 300 افراد بشمول فوجی سپاہیوں کے اس تصادم کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔ اور طالبانائزیشن اور ملٹری آپریشن سے براہ راست اور بالواسطہ طور پر چھ لاکھ افراد متاثر ہوئے تھے۔

سیکولر پختون قوم پرست جماعت نیشنل عوامی پارٹی نے حکومت سنبھالتے ہی شدت پسندوں کے ساتھ مذاکرات شروع کیے اور خیر سگالی ظاہر کرنے کے لیے اپریل میں صوفی محمد کو جیل سے رہا کر دیا۔ 21 مئی 2008ء کو طرفین نے 16 نکاتی معاہدے پر دستخط کر دیئے معاہدے کا حاصل یہ تھا کہ سوات میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے بدلے طالبان پولیس، فوج اور فرنٹیئر کور پر حملے بند کر دیں گے اور جائیداد کو تباہ کرنا بند کر دیں گے۔ معاہدے میں یہ بھی ذکر تھا کہ اگر طالبان نے معاہدے کا احترام کیا تو حکومت بعض طالبان قیدیوں کو رہا کر دے گی۔ مذاکرات کے کئی راؤنڈ ہوئے جن میں مسلم خان، علی بخت (ایک کمانڈر جو بعد میں مارا گیا) اور محمود خان (جو ستمبر 2009ء میں مسلم خان کے ساتھ گرفتار ہوا) فضل اللہ کی نمائندگی کر رہے تھے جبکہ سرحد کے کئی

MashalBooks.org

وزراء نے حکومت کی نمائندگی کی۔ اگر چہ دونوں اطراف نے فتح کے دعوے کیے، طالبان نے شریعت کے نفاذ کے حوالے سے اور حکومت نے سوات میں دوبارہ امن کے قیام کے حصول پر۔ تاہم دونوں ہی نہ جیت سکے کیونکہ سوات میں نہ شریعت نافذ ہوئی اور نہ ہی امن آیا۔

آپریشن راہ نجات

معاہدے کی بعض شرائط پر عمل درآمد میں اختلافات کی بنا پر فضل اللہ سوات سے فوجوں کی واپسی پر اصرار کر رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ شدت پسند فوج کے واپس جانے کے بعد ہتھیار ڈالیں گے جبکہ حکومت چاہتی تھی کہ پہلے طالبان ہتھیار ڈالیں اور پھر فوج سوات سے نکلے...... فضل اللہ نے 27 جون 2008ء کو معاہدہ ختم کر دیا اور طالبان شدت پسندوں کو، اپنے لڑاکوں کے خلاف فوج کی جاسوسی کے شبہ میں، پاکستان فوج پر حملوں کا حکم دے دیا۔ شدت پسندوں نے بالائی سوات میں آئی ایس آئی کے دو جونیئر افسروں کو مار ڈالا۔ اس پر فوج نے 29 جون کو نیا آپریشن شروع کر دیا۔ کبل، مٹہ اور خوازخیلہ، باڑہ بندئی، کوزہ بندئی اور سوات کے دوسرے اہم شہروں میں شدید لڑائیاں ہوئیں۔ طور ملا اور علی بخت سمیت کئی اہم طالبان لیڈر دوسرے مرحلے میں مارے گئے لیکن جون کے آخر میں جنگ جوؤں نے مالم جبہ میں پاکستان کے سب سے بلند تفریحی مرکز پی ٹی ڈی سی موٹیل کو اڑا دیا اور فوج پر ٹارگٹ کلنگ اور باقاعدہ حملے تیز تر کر دیئے۔

2008ء کے نصف آخر اور 2009ء کے ابتدائی مہینوں میں، سوات کی تاریخ کے بدترین دن گزرے۔ بہت سے سکولوں کو جلا دیا گیا، ان پر بمباری کی گئی یا فوجی آپریشن کے ذریعے تباہ ہو گئے، موسیقی پر پابندی لگا دی گئی۔ نائیوں کو ایک بار پھر مردوں کی داڑھی مونڈنے سے منع کر دیا گیا۔ تقریباً 20 لاکھ افراد سوات سے نکل کر پشاور، اسلام آباد اور دوسرے شہروں کی طرف پناہ کے لیے بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ آٹھ ہزار فوجیوں (بعد ازاں یہ تعداد 20 ہزار تک جا پہنچی) نے 5 سے چھ ہزار طالبان جنگ جوؤں سے باقاعدہ جنگ کی۔ پاکستانی پولیس صرف منگورہ میں ہی موجود تھی باقی سارا سوات طالبان کے قبضے میں تھا جہاں وہ اپنی عدالتیں چلاتے تھے اور لوگوں کو غلط کاموں پر سزائیں دیتے رہتے تھے۔

صوفی محمد کے مطالبے کے مطابق، سرحد حکومت ایک بار پھر نظام عدل ریگولیشن لانے پر رضامند ہو گئی۔ اس ایکٹ کے ذریعے مالاکنڈ ڈویژن میں شرعی قوانین نافذ ہونا تھے۔ اس طرح ایک اور امن معاہدہ 15 فروری 2009ء کو کیا گیا۔ یہ قدم سیکولر عوامی نیشنل پارٹی کے لیے بڑا مشکل تھا تاہم پارٹی شدت پسندوں کا یہ دباؤ برداشت کر گئی اور دوسری جماعتوں مثلاً پختون خواہ ملی عوامی

پارٹی اور نیٹو کے دباؤ کے باوجود، شرعی قوانین کے نفاذ کا وعدہ کرلیا۔ نیٹو افواج طالبان کی ازسرنو تقویت (اس معاہدے کے ذریعے) نہیں چاہتی تھیں کیونکہ اس طرح طالبان کے افغانستان میں ان کے دستوں پر حملے میں اضافہ ہوجاتا۔

صوفی محمد نے 18 فروری کو منگورہ کی جلسہ گاہ گراسی گراؤنڈ میں ایک بڑی ریلی منعقد کی، جہاں متنازعہ معاہدے کے فوراً بعد، اس نے سوات میں دائمی امن کا وعدہ کیا۔ امن کوشش کی حمایت میں ہزار ہا افراد نے اس ریلی میں شرکت کی اور اسی روز فضل اللہ نے فوج پر حملے روک دینے کا حکم دے دیا لیکن فوراً ہی فضل اللہ اور اس کے کمانڈروں نے شکایت شروع کردی کہ ان کے آدمیوں کو بلاوجہ روک کر تلاشی لی جارہی ہے۔ وہ معاہدے کی شرائط پوری کرنے میں بھی ناکام رہے۔ نہ انہوں نے ہتھیار ڈالے اور نہ ہی اپنی چوکیاں ختم کیں۔ جب فوج نے بزور طاقت ان سے معاہدے کی پابندی کرانے کی کوشش کی تو انہوں نے سوات اور مالاکنڈ کے علاقوں میں افراتفری پھیلاتے ہوئے سرکاری حکام کو مارنا شروع کردیا۔ شدت پسندوں نے لوئر دیر میں ایک ضلعی پولیس افسر کو مار ڈالا جبکہ ایک اور حملے میں، اپر دیر میں، پانچ پولیس اہلکاروں کو اڑا دیا۔ امن معاہدے کے دو ماہ کے اندر اندر طالبان بونیر تک پھیل گئے۔ بونیر، اسلام آباد سے صرف 70 میل کے فاصلے پر ہے۔ انہوں نے ڈاگر کا قصبہ اور اس کے اردگرد کے دیہات قبضے میں لے لیے اور وہاں پٹرولنگ شروع کردی۔ ان علاقوں کے بارے میں عمومی خیال یہ ہے کہ تحریک نفاذ شریعت کی یہاں تک رسائی دلفریبی کی انتہا تھی۔

بونیر، دیر اور سوات (ان علاقوں میں طالبان نے 2009ء کے ابتدائی مہینوں میں اپنا کنٹرول مستحکم کرلیا تھا) سے طالبان کے انخلا کی جب تمام کوششیں ناکام ہوگئیں، تو اپریل کے آخیر میں فوج نے بھرپور آپریشن شروع کردیا۔ مقامی لوگوں کو پہلے سے یہ علاقہ خالی کرنے کے لیے کہہ دیا گیا۔ مئی اور وسط جولائی کے درمیان 25 لاکھ لوگ گھروں سے نکل کر پشاور، مردان، صوابی، چارسدہ، نوشہرہ اور دوسرے پاکستانی شہروں میں موجود کیمپوں میں یا اپنے رشتہ داروں کے پاس یا کرایے کے گھروں میں رہنے پہنچ گئے۔ طالبان جنگ جوؤں کے لئے جتھوں نے سوات میں منگورہ اور ڈاگر (بونیر) کے اہم شہروں پر مکمل قبضہ جما لیا تھا۔ 2007ء اور 2008ء کے فوجی اور پولیس کی کارروائیوں کے باوجود یہ سب کچھ غیر متوقع نہیں تھا۔ وہ طالبان کا مالاکنڈ میں کنٹرول ختم کرنے میں ہی ناکام نہیں ہوئے تھے بلکہ شدت پسندوں کی تحریک اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی اور ایسا بھی وقت آیا کہ وہ اسلام آباد سے صرف 70 میل کے فاصلے پر تھے۔ یہ نہ صرف پاکستان کے لیے بلکہ دنیا بھر کے لیے خطرے کی گھنٹی تھی۔

MashalBooks.org

2009ء میں لڑائی کے دوران بہت سے طالبان کمانڈر مارے گئے اور سوات کے طالبان کا ترجمان مسلم خان گرفتار ہو گیا۔ (ستمبر میں) فوج کے اعداد و شمار کے مطابق، سوات میں 2009ء کے آپریشن میں (سوات، دیر، بونیر اور شانگلہ کے اضلاع میں) 1300 جنگ جو مارے گئے اور کئی سو لوگ گرفتار ہوئے۔ جولائی میں فوج طالبان کے گڑھ پیوچار پہنچی، جہاں ان کے کہنے کے مطابق، غاروں میں اسلحہ اور بارود کے انبار لگے ہوئے تھے۔

پاکستانی فوج کے دعوے کے مطابق جولائی 2009ء میں وادی سوات پر ان کا مکمل کنٹرول ہو گیا۔ شدت پسند مارے گئے یا بھاگ گئے یا روپوش ہو گئے۔ اس کے بعد منگورہ، خوازخیلہ، کانجو، مٹہ، کالام اور منگل وار کے علاقوں میں طالبان جنگ جوؤں کی گولیوں سے چھلنی لاشیں لوگوں کو نظر آنے لگیں۔ غالباً ان لوگوں کو حکومت کے حمایت یافتہ لشکروں یا قبائلی شدت پسندوں نے شکار کیا تھا تاکہ مستقبل میں طالبان میں شمولیت کے خواہاں افراد کو واضح پیغام دیا جاسکے۔

تاہم خوف ہراس کی فضا آج بھی سوات میں طاری ہے۔ نومبر 2009ء میں اے این پی کے مقامی لیڈر اور سرحد اسمبلی کے رکن شمشیر خاں کو خودکش حملے کے ذریعے، اس کے اپنے گھر منگورہ میں قتل کر دیا گیا۔ ان کے بھائی رحمت علی نے وہی نشست ضمنی الیکشن کے ذریعے جیت لی۔ یہ ضمنی انتخاب پرامن اور قواعد وضوابط کے مطابق تھا۔

فوجی آپریشنز کے بعد سوات کی صورتِ حال

سوات کے لوگ اپنے گھروں کو واپس آ گئے مگر حکومت انھیں کوئی خاص سہولتیں فراہم نہیں کر پائی۔ سکول ابھی تک کھنڈر بنے ہوئے ہیں اور بچوں کو کھلے آسمان تلے تعلیم دی جا رہی ہے۔ اگرچہ حکومت نے نئی بھرتیاں کر کے پولیس کا محکمہ منظم کرنے کی کوشش کی ہے تاہم لوگ یہ سارا انتظام فوج کے بجائے شہری انتظامیہ کے ہاتھوں میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور سیاسی معاملات میں اپنی شراکت چاہتے ہیں۔ برسوں پر پھیلی جنگ کے نتیجے میں تباہ شدہ معیشت کی وجہ سے مقامی باشندوں کو روزگار کی اشد ضرورت ہے۔ وہ کاروبار کی بحالی خصوصاً ایک زمانے کی مانی ہوئی، سیاحت کی انڈسٹری کو فروغ دینے کے لیے حکومتی معاونت کے خواہاں ہیں۔ 2009ء کی فوجی مہم، گزشتہ آپریشنز کے مقابلے میں کئی عوامل کی وجہ سے ممتاز ہے پہلی اور سب سے اہم بات پورے پاکستان میں عوامی رائے طالبان کے خلاف ہو گئی۔ خصوصاً سوات کے معصوم عوام پر طالبان کے وحشیانہ طرز عمل نے جلتی پر آگ کا کام کیا۔ لوگوں کا سر قلم کیا جانا، بم باری کے ذریعے عوام میں

دہشت پھیلانا اور لاقانونیت کو انتہا پر پہنچا دینا، سب کچھ لوگوں کے سامنے آ گیا۔ چنانچہ وادی کے عوام نے 2009ء کے فوجی آپریشن کی بھرپور حمایت کی۔ مئی 2009ء میں سرحد میں کیے گئے ایک سروے کے مطابق 86% لوگ حکومتی اقدامات کے لیے ہمدردانہ جذبات رکھتے تھے جبکہ صرف 6% لوگوں نے پاکستانی طالبان کی حمایت کی۔

دوسرے گزشتہ فوجی اور پولیس آپریشنز بے دلی کے ساتھ کیے گئے تھے۔ پھر انھیں روک دیا گیا۔ فوج سوات کے بعض علاقوں میں طالبان کے پیچھے تھی جبکہ بعض دوسرے علاقوں میں انھیں پوچھنے والا کوئی بھی نہ تھا۔ فوج آپریشن شروع کرتی تو جنگ جو پہاڑوں میں جا چھپتے 2009ء کا آپریشن، اس کے برعکس، پوری وادی میں کیا گیا اور اس سے پہلے مقامی آبادی کو اس علاقے سے نکال دیا گیا۔ اس سے پاکستانی فوج کی سنجیدگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

تیسرے عوامی نیشنل پارٹی 2009ء میں صوبے میں برسر اقتدار آئی۔ اس نے صوبے میں امن لانے کا وعدہ کیا تھا اس لیے اس نے دو دفعہ سوات کے طالبان کے ساتھ مسائل حل کرنے کی کوشش کی لیکن دونوں دفعہ کوشش ناکام رہی۔ شدت پسند اس صورت حال میں زیادہ نڈر ہو گئے اور انہوں نے پولیس اور حکومتی اداروں پر (فرنٹیئر کے افسران اور معصوم شہریوں پر) حملے تیز کر دیئے۔ اس وقت اے این پی کی حکومت نے چاہا کہ فوجی آپریشن سنجیدگی سے کیا جائے۔ درحقیقت، صوبائی حکومت نے، وفاقی حکومت کی حمایت سے فوج کو سخت تر آپریشن کرنے کا الٹی میٹم دے دیا، دوسری صورت میں اس نے صوبائی حکومت چھوڑ دینے کی دھمکی دی۔

2009ء کا آپریشن بظاہر تو کامیاب ہو گیا مگر مسائل موجود ہیں۔ ابن امین اور ابن عقیل جیسے خطرناک کمانڈر ابھی تک آزاد ہیں۔ اسی طرح طالبان کا امیر فضل اللہ بھی روپوش ہے۔ مبینہ طور پر اس نے افغانستان میں کسی جگہ سے کہا کہ وہ سوات میں دوبارہ گوریلا وار شروع کرے گا۔ تاہم موسم بہار 2009ء کے فوجی آپریشن نے اہل سوات کا اعتماد بحال کرنے میں مدد دی ہے، وادی میں سکون آ گیا۔ لڑکیوں کے سکول اڑائے جانے، اسپتال اور پولیس سٹیشن تباہ کرنے اور (سرکاری اہل کاروں اور) مخالفین کے سر قلم کرنے، اغوا کی وارداتیں اور خودکش حملوں کے واقعات ختم ہو گئے۔ سوات کے اکثر باشندے اب پر امید ہیں کہ فوج اب مزید کسی بغاوت کی اجازت نہیں دے گی۔ اور اگر ایسا ہوا بھی تو وہ اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوں گے۔ بعض لوگ اب بھی نفاذ شریعت کی بات کرتے ہیں جیسے صوفی محمد، جواب جیل میں ہے، اور فضل اللہ اور اس کے کمانڈر، جن میں سے کچھ مارے گئے اور کچھ روپوش ہو گئے۔

سوات کا قبائلی ڈھانچہ

وادی میں پختون نسل کے یوسف زئی قبیلے کی اکثریت ہے۔ تاہم دور دراز علاقوں اور پہاڑوں میں کئی اور نسلی گروہ بھی آباد ہیں۔ ذیل میں تین بڑے نسلی گروہوں اور ان کے علاقوں کی تفصیل دی گئی ہے۔

نسلی گروہ	علاقہ	زبان
پختون	تمام وادی سوات اور مالاکنڈ ڈویژن	پشتو
گجر	بکھرے ہوئے ہیں مگر زیادہ تر ضلع مٹہ میں آباد ہیں	گجری
کوہستان	زیادہ تر کوہستان، بحرین اور کالام میں آباد ہیں	کوہستانی

گجر اور کوہستانی آبادی کا 15% ہیں۔ سوات کے اہم پختون عمائدین میں افضل خان لالہ (جس کے پاس خواز خیلہ کا کنٹرول ہے) شجاعت علی خان اور بخت بدر خان (جو 2008ء میں مارے گئے مگر ان کا خاندان وادی میں آج بھی طاقتور ہے) شجاعت علی خان شدت پسندوں کے خوف سے، سب سے پہلے علاقہ چھوڑ گیا اور پشاور/ اسلام آباد میں جا بسا تھا۔ طالبان نے اس کی زمینوں پر قبضہ کر کے، اس میں سے کچھ حصہ دوبارہ تقسیم کر دیا تھا۔ افضل خاں لالہ پر سوات میں طالبان نے کئی حملے کیے۔ وہ زخمی ہوا، اس کے کئی رشتہ دار بھی مارے گئے لیکن وہ وادی ہی میں مقیم رہا۔ بہت سے مقامی باشندوں کے نزدیک، وہ (طالبان کے خلاف) مزاحمت کی علامت بن گیا ہے۔ اگرچہ صوفی محمد کی زیادہ تر حمایت پختون علاقوں میں تھی تاہم فضل اللہ نے ایف ایم ریڈیو پر تقریروں کے ذریعے گجر برادری میں بھی اپنی جگہ بنالی تھی۔ اس کے حامی زیادہ تر غریب پختون اور گجر تھے۔ جو ایف ایم چینل پر سماجی انصاف اور پختون سرداروں اور زمینداروں کے خلاف فضل اللہ کی شعلہ بار تقاریر سن کر، اس کے ساتھ ہو گئے۔ زمینوں پر کام کرنے والے کسان، جو مساوات چاہتے تھے، بھی فضل اللہ کے حامی ہو گئے۔ پھر وہ پختونوں میں اپنی بنیاد مضبوط کرنے کے لیے روایات کا سہارا لینے لگا۔ انتقام پختون زندگی کا اہم حصہ ہے۔ وہ لوگ، جو طاقتور دشمنوں سے انتقام نہیں لے سکتے تھے، بھی فضل اللہ کی تحریک میں، اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے شامل ہو گئے۔

آبادی کے مسائل اور مشکلات

سوات میں، طالبان کے عروج میں اہم ترین رول آہستہ رو، کرپٹ اور غیر مستعد عدالتی نظام کا تھا۔ چالیس سال پاکستانی قانون کے تحت گزارنے کے باوجود، اہل سوات اپنے آخری والی کا دور یاد کرتے تھے۔ اس کا دور ''آسان فہم اور فوری انصاف، سب کے لیے'' کی وجہ سے

یادگار ہے۔ (سابقہ شاہی خاندان کے رکن اور سرحد اور بلوچستان کے سبق گورنر میاں گل جہاں زیب کے مطابق) والی کے دور میں اہم ترین معاملہ بھی ایک یا دو ہفتے میں حل کر لیا جاتا تھا لیکن پاکستانی عدالتی نظام میں معاملہ سالوں تک لٹکا رہتا تھا۔ اسی صورتِ حال نے صوفی محمد اور بعد ازاں فضل اللہ کے فوری انصاف کے وعدوں کے لیے مقبول فضا پیدا کر دی۔

''طویل تر قانونی طریقہ کار.......... بلاوجہ کی تاخیر، اخراجات کی طومار، رشوت اور بہت سے دوسری خرابیاں تھیں...... جن سے اہل سوات پہلے ہی بہت پریشان تھے.......... (ان سب نے مل کر) سوات میں تحریک نفاذ شریعت محمدی کو مہمیز دی۔'' نئی دہلی کے ایک آزاد تجزیاتی ادارے کے لیے سلطان روم نے اپنی اہم تجزیے میں یہ ریمارکس دیئے۔ ''عوامی جذبات و مطالبات کی پذیرائی، آسانی اور فوری انصاف یقینی بنانے اور روزگار وغیرہ کی سہولتیں فراہم کرنے کی بجائے، تحریک کے مطالبات کا مذاق اڑا کر، حکومت نے صورت حال کو اور بھی پراگندہ کر دیا اگر حکومت شہریوں کو سہولتیں مہیا کر دیتی تو تحریک نفاذ شریعت خود بخود ختم ہو جاتی۔'' سوات کی ایک مقامی NGO کے سربراہ شوکت شرار نے طالبان کے ساتھ پے در پے امن معاہدوں اور ان کی ناکامی کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے رائے دی۔

وادی میں یہی نہیں کہ عدالتی نظام کرپٹ اور سست رو تھا بلکہ بہت سے لوگ شہری انتظامیہ کی خباثتوں سے بھی خاصے نالاں تھے۔ اسی بے اطمینانی کی بدولت لوگ کوئی دوسرا راستہ بشمول طالبان ڈھونڈنے لگے۔ والی کی اقتدار سے علیحدگی کے بعد، حکومت نے مقامی باشندوں کے لیے سماجی اور تعلیمی سہولتوں کی فراہمی میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ 1969ء میں یہاں دو لاکھ کی آبادی کے لیے پانچ ہائر سیکنڈری سکول تھے۔ اس کے بعد، ایک بھی سکول قائم نہیں کیا گیا جبکہ اب آبادی 20 لاکھ سے تجاوز کر چکی ہے۔ غیر معمولی بے روزگاری اور زمین کی زرخیزی میں کمی، لوگوں کی پریشانی کی بڑی وجہ تھیں۔ فضل اللہ کے اکثر مسلح حامی غریب اور جاہل نوجوان اور بے زمین کسان تھے۔ ان میں سے کچھ خانوں کے خدمت گزار تھے اور کچھ نوکریاں تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ خفیہ اداروں کی نالائقی، حکومتی بے حسی اور متحدہ مجلس عمل کی اس وقت صوبائی حکومت کے قیام نے سوات میں مقامی طالبان کو مزید تقویت بخشی۔ اہل سوات کے مسلسل احتجاج کے باوجود، شدت پسندوں کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ اور سرگرمیوں کو 2006ء سے پہلے تک نظر انداز کیا جاتا رہا۔

> حکومت نے بارہا تسلیم کیا کہ وادی کے لوگوں کی شکایات، بالخصوص عدالتی نظام، روزگار انتظامی خرابیوں اور شہری سہولتوں سے متعلق، انتہائی جائز ہیں۔
> سرحد کے وزیر اطلاعات میاں افتخار حسین نے جولائی 2009ء کے فوجی

آپریشنز کے دوران کہا: ''لوگوں کی تکالیف بجا تھیں لیکن انھیں حل کرنے کے لیے ہتھیار نہیں اٹھانے چاہئیں۔''

وادی سوات میں شدت پسندوں کے صفایا سے متعلق حکومتی یقین دہانیوں کے باوجود مولانا فضل اللہ اور اس کے اہم ساتھیوں کے بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کی جا سکتی۔ اور منگورہ میں حالیہ خود کش حملوں سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ آگ اب بھی سلگ رہی ہے وادی میں سکوت ہے لیکن امن نہیں۔

داؤد خاں خٹک پشتو اخبار نویس ہیں۔ آج کل ریڈیو مشعل کے لئے کام کر رہے ہیں۔ وہ کئی انگریزی اخباروں میں بھی کام کرتے رہے ہیں وہ امریکہ کے اخبار کرسچین سائنس مونیٹر اور برطانیہ کے سنڈے ٹائمز میں بھی لکھتے رہے ہیں۔

MashalBooks.org

عسکریت اوراورکزئی کا تنازعہ

راحیل خان۔ستمبر 2010ء

اورکزئی پاکستان کی سات قبائلی ایجنسیوں میں سے واحدایجنسی ہے جس کی افغانستان کے ساتھ سرحد نہیں لگتی۔یہ کبھی تحریک طالبان پاکستان کے سربراہ حکیم اللہ محسود کا علاقہ تھا جو افغانستان میں عسکری کارروائیوں کی قیادت کرنے کے علاوہ خیبراور پشاور کے علاقے میں 2008-2009 میں نیٹوسپلائی کے ٹرکوں کو نشانہ بناتا رہا تھا۔اورکزئی کا علاقہ کراغ گھر کی پہاڑیوں سے گھراہوا ہے جو پندرہ سومیٹر سے لیکر پچیس سومیٹر تک بلند ہیں۔ایجنسی کسی زمانے میں کوہاٹ کا حصہ تھی لیکن اورکزئی قبائل کے مسلسل مطالبات کے نتیجے میں نومبر 1973ء میں پاکستان کے صدر فضل الٰہی چودھری نے ایک اعلان کے تحت اسے ایک علیحدہ قبائلی ایجنسی بنادیا تھا۔

اورکزئی ایجنسی کا کل رقبہ پندرہ سو مربع کلومیٹر ہے اور یہ دو انتظامی علاقوں میں منقسم ہے جو بالائی اورکزئی اور زیریں اورکزئی کہلاتے ہیں جن کی کل آبادی سوا دو لاکھ کے لگ بھگ ہے۔بالائی اورکزئی مزید دوحصوں بالائی تحصیل اوراسماعیل زئی تحصیل میں منقسم ہے جبکہ زیریں اورکزئی کو زیریں تحصیل اور وسطی تحصیل میں تقسیم کیا گیا ہے۔ایجنسی کے مرکزی شہروں یا قصبوں میں ڈابوری، غلجو، کلایا، مشطی میلہ اورکوریز شامل ہیں۔اورکزئی کا انتظامی ہیڈکوارٹر ہنگو ڈسٹرکٹ میں کوہاٹ ٹل روڈ پرواقع ہے۔اورکزئی میں شرح خواندگی کم ہے اور یہاں پر رہنے والے زیادہ تر لوگ زراعت سے وابستہ ہیں۔پڑھے لکھے قبائلی افراد حکومت میں شامل ہوجاتے ہیں جبکہ بہت سے روزگار کے لیے بیرون ملک مشرقِ وسطیٰ وغیرہ چلے جاتے ہیں جہاں وہ زیادہ تعمیراتی مزدوری اورٹیکسی ڈرائیوری وغیرہ کرتے ہیں۔

اورکزئی میں عسکریت کا ڈھانچہ:

اس علاقے میں عسکریت کے جو تین اجزاء ہیں وہ بظاہر الگ الگ لیکن آپس میں مربوط ہیں۔ پہلا جز فرقہ ورانہ تنازعہ ہے کیونکہ ایجنسی میں دس فیصد آبادی شیعہ فرقے سے تعلق رکھتی ہے جبکہ اکثریت سنی مسلمانوں کی ہے۔ دوسرا جز مذہبی نوعیت کی تحریک ہے جو سوات میں اٹھنے والی تحریک نفاذ شریعت محمدی جیسی ہے جبکہ تیسرا جز تحریک طالبان پاکستان سے تحریک پاکر اٹھنے والی عسکریت ہے۔

اورکزئی میں فرقہ واریت:

ایجنسی میں اکثریت کے ساتھ موجود سنی مسلمانوں کی متشدد تقسیم اور پڑوسی کرم ایجنسی میں موجود چالیس فیصد شیعہ آبادی کی وجہ سے اس علاقے میں فرقہ واریت کو فروغ ملتا ہے۔ایجنسی کے اٹھارہ قبیلوں میں سے تین مکمل طور پر اور دو جزوی طور پر شیعہ مسلک سے تعلق رکھتے ہیں۔اورکزئی میں فرقہ ورانہ تنازعے کی بنیادی وجہ کلایہ میں واقع میر انور شاہ کی درگاہ کی ملکیت کا تنازعہ ہے۔یہ درگاہ تین سو سال پرانی ہے اور شیعہ مسلمانوں میں صاحب درگاہ کے حوالے سے بہت عقیدت پائی جاتی ہے۔اورکزئی کے شیعہ مسلمان طویل عرصے سے اس درگاہ اور اس کے آس پاس موجود پراپرٹی پر اپنا دعویٰ کرتے آرہے ہیں تاہم 1936ء میں انگریزوں نے اس کا کنٹرول سنیوں کو دے دیا تھا اور علاقے کو فرقہ واریت سے بچانے کے لیے سنی اور شیعہ مسلمانوں کو الگ الگ علاقے میں منقسم کردیا تھا۔اس کی وجہ سے اگلے کئی عشروں تک ، ماسوائے چھوٹے چھوٹے جھگڑوں کے، اس علاقے میں امن وامان رہا۔اگست 1988ء میں جب شیعہ فرقے سے تعلق رکھنے والے کچھ افراد نے سنیوں کے حامی جنرل ضیاء الحق کی موت پر جشن منایا تو ایک بار پھر علاقے میں لڑائی چھڑ گئی۔ایک ماہ بعد ان فرقوں اور اورکزئی انتظامیہ کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کے تحت شیعہ مسلمانوں کو درگاہ کی زیارت اور اس کی دیکھ بھال کی اجازت دے دی گئی۔بیس جون 1999ء میں درگاہ کی تزئین و آرائش کے کام کا افتتاح ہوا تو اس موقع پر ایک تقریب منعقد کی گئی جس میں دونوں فرقوں کے لوگوں نے شرکت کی لیکن چند روز بعد اورکزئی کے علاقے ڈابوری کے مقامی طالبان نے کلایہ پر حملہ کردیا اور تزئین و آرائش کے کام کو روک دیا۔علاقے کے بزرگوں کے مطابق اس سے علاقے کا پرامن ماحول برباد ہوگیا۔مقامی طالبان نے اس سلسلے میں 1988ء کے معاہدے کی مذمت کی اور درگاہ میں ہونے والی موسیقی کو خلاف اسلام قرار دینے کے علاوہ شیعوں کا دربار میں داخلہ بند کردیا۔شیعہ بزرگوں کا کہنا تھا کہ درگاہ کے اندر

MashalBooks.org

موسیقی وغیرہ شرک نہیں۔انہوں نے الزام لگایا کہ طالبان نے آس پاس کی پہاڑیوں پر قبضہ کر رکھا ہے جہاں سے وہ راکٹوں اور گرنیڈوں سے دیہاتوں پر بمباری کر رہے ہیں جس سے بڑی تعداد میں لوگ زخمی ہو رہے ہیں اور گھر تباہ ہو رہے ہیں۔طالبان نے علی خیل کے علاقے میں چالیس شیعہ خاندانوں پر جرمانے عائد کیے اور انہیں اپنے گھر چھوڑنے پر مجبور کیا۔اورکزئی سے تعلق رکھنے والے اسلم فاروقی گروپ جس کا تعلق سپاہ صحابہ پاکستان سے تھا اور ازبک اور عرب جنگجوؤں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس علاقے کا امن تباہ کرنے میں ان کا بنیادی کردار تھا ۔طالبان نے اس فرقہ وارانہ لڑائی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مقامی سنی گروپوں کا ساتھ دیا تا کہ وہ علاقے میں اپنی اسلامی ریاست قائم کر سکیں۔

فرقہ ورانہ جھڑپوں میں اموات کے بعد اکتوبر 2006ء میں اورکزئی کی پولیٹیکل انتظامیہ نے دونوں فرقوں کی درگاہ میں داخلے پر پابندی عائد کر دی۔ان جھڑپوں میں ایک شیعہ گروپ نے سنی مسلمانوں کے گھروں کو نذر آتش کر دیا اور درگاہ کے آس پاس کے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔درگاہ کو مسمار کر دیا گیا اور کلایہ میں فرقہ وارانہ جھڑپیں جاری رہیں۔1999ء سے لیکر 2009ء تک کے دس سال کے عرصے میں اورکزئی میں اورکزئی کے پڑوسی ضلع ہنگو میں بائیس ہزار سے زائد افراد فرقہ واریت کی بھینٹ چڑھ کر جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

اورکزئی میں جاری فرقہ وارانہ تنازعہ کے کچھ معاشی پہلو بھی تھے۔اورکزئی میں آباد شیعہ، سنی مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ خوشحال اور پڑھے لکھے ہیں۔ان میں سے اکثر کے پاس بڑی بڑی جائیدادیں، جنگلات اور پانی کے ذخائر ہیں۔اس کے علاوہ شیعہ قبائلی پاکستان کی پولیٹیکل انتظامیہ سے کوئلوں کی کانوں کے ٹھیکے بھی حاصل کرتے ہیں۔اس کے مقابلے میں سنی نسبتاً غریب اور کم پڑھے لکھے ہیں اور کم زرخیز علاقوں میں آباد ہیں۔

تحریک طلبہ موومنٹ (ٹی ٹی ایم):

جیسا کہ پہلے بتایا گیا کہ اورکزئی واحد قبائلی ایجنسی ہے جس کی افغانستان کے ساتھ سرحد نہیں ملتی لیکن سوویت یونین کے افغانستان پر حملے کے بعد اس کے نتیجے میں وہاں پر قائم ہونے والی طالبان کی حکومت کے اس پر زبردست اثرات ہیں۔1990ء کی دہائی کے اواخر میں محمد رحمان نامی ایک مقامی مولوی نے یہاں طالبان جیسی تحریک کا آغاز کیا جس کا نام تحریک طلبہ موومنٹ (ٹی ٹی ایم) تھا اور جو ایجنسی میں شریعت کے نفاذ کی حامی تھی۔ٹی ٹی ایم پر مالاکنڈ کی

MashalBooks.org

تحریک نفاذ شریعت محمدی کے گہرے اثرات تھے جس کا سربراہ صوفی محمد تھا۔افغانستان میں طالبان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے 1998ء میں اورکزئی کے طالبان نے ایک نوجوان کو سرعام سزا دینے کا حکم دیا جو اسے تحریک طلبہ موومنٹ کی جانب سے قائم کردہ مقامی علماء کی ایک عدالت نے سنائی تھی۔اس نوجوان کو دو ہزار افراد کے مجمع میں سزائے موت دی گئی جو اسے مقتول کے بھائی اور چچا نے اپنے ہاتھوں سے دی۔محمد رحمان نے اس عمل کی تعریف کی اور اسے نفاذ شریعت کی جانب ایک بڑا اقدم قرار دیا۔یہ ٹی ٹی ایم کے انصاف کی پہلی مثال تھی جس کی بعدازاں طالبان تحریک نے بھی پیروی کی۔اورکزئی کی ٹی ٹی ایم نے دیگر قبائلی علاقوں میں کیے جانے والے اپنے فیصلوں میں مقامی بزرگوں کو بھی شامل کیا اور یوں ایجنسی میں مکمل طور پر اسلامی نظام قائم کرنے کی کوشش کی۔ٹی ٹی ایم نے موسیقی، ٹی وی سیٹس، وی سی آر کو غیر قانونی قرار دے دیا اور خلاف ورزی کرنے والوں کو جرمانے اور ان کی جائیدادیں تباہ کرنے جیسی سزائیں دیں۔

گیارہ ستمبر 2001ء میں دہشت گردوں کے امریکہ پر حملے کے بعد امریکہ نے افغانستان پر حملہ کردیا جس پر مولوی رحمان نے ایک فتویٰ جاری کیا جس میں افغانستان پر حملہ آور دشمن کے خلاف جہاد کی حمایت کی گئی اور سینکڑوں جنگجوؤں بشمول تحریک نفاذ شریعت محمدی کے لڑاکوں کے ساتھ افغان طالبان کے شانہ بشانہ لڑائی کی قیادت کی۔مالاکنڈ میں ٹی این ایس ایم سے متاثر ہو کر مقامی مذہبی قبائلی بزرگوں نے پاکستان کے وفاقی قبائلی علاقے فاٹا میں ٹی این ایس یم اور دیگر عسکریت پسند گروپوں کے ساتھ اتحاد بنانے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں کئی اجلاس منعقد کیے گئے۔تاہم ٹی این ایس ایم اور صوفی محمد کی شکست کے نتیجے میں ان کی امیدیں خاک میں مل گئیں۔تحریک طلباء موومنٹ بھی منظر سے غائب ہوگئی۔کہا جاتا ہے کہ اس کے کچھ لڑاکے مارے گئے اور کچھ نے دیگر گروپوں میں شمولیت اختیار کر لی جبکہ مولوی رحمان کا کچھ پتہ نہ چلا۔

2004 کے بعد سے اورکزئی ایجنسی وزیرستان میں پاکستانی فوج کی کارروائی سے بچ نکلنے والے عسکریت پسندوں کا ٹھکانہ بنی ہوئی ہے جہاں سے نہ صرف وہ پاکستانی فوج بلکہ افغانستان کے اندر بھی حملے کرتے ہیں۔2005ء شروع ہوا تو اورکزئی سے ملحق خیبر ایجنسی میں منگل باغ کے لشکر اسلام نے بھی کارروائیاں شروع کردیں۔لشکر اسلام اور تحریک طلباء موومنٹ کے گروپ پاکستانی حکومت کے خلاف خیبر اور اورکزئی میں ایک دوسرے کی پشتی بانی کرنے لگے۔

تحریک طالبان پاکستان:

تحریک طالبان پاکستان نامی اس عسکریت پسند تنظیم کا قیام دسمبر 2007ء میں بیت اللہ محسود کی زیر قیادت عمل میں آیا۔اس کے قیام کے بعد طالبان لڑاکوں نے اورکزئی میں اپنی کارروائیاں تیز کردیں۔انہوں نے مقامی قبائل پر سخت گیر قسم کی شریعت کا نفاذ کردیا۔بااثر ملکوں یا مقامی سرداروں کو تاوان کے لیے اغوا یا قتل کیا جانے لگا تاکہ مقامی لوگ طالبان کی حکومت کو تسلیم کرلیں۔تحریک طالبان پاکستان کو زیادہ تر مدد و حمایت وزیرستان، خیبر اور کرم کے درمیان واقع آفریدیوں کی وادی تیراہ اور پاکستان کے شمال مغرب کے دیگر قبائلی علاقوں سے ملتی ہے۔اس طرح سپاہ صحابہ پاکستان اور کوہاٹ کے علاقے درہ آدم خیل سے لشکر جھنگوی کے لڑاکے بھی ان سے آملتے ہیں۔اورکزئی علی خیل اور ماموزئی کے ہمدرد عسکریت پسند گروپ بھی طالبان کی مدد کرتے ہیں۔

جنوری 2008ء میں کچھ مقامی قبائل نے طالبان کے جنگجوؤں کے خلاف متحد ہونے کی کوشش کی تاہم طالبان نے ان کے خلاف سخت مہم چلائی اور حکومت کی مدد نہ ملنے پر ان قبائل نے بھی گھٹنے ٹیک دیے۔2008ء کے اوائل میں اورکزئی میں سنی اکثریت کے علاقوں پر عملی طور پر طالبان کا کنٹرول تھا اور ان پر پاکستانی حکومت کا بہت کم اثر و رسوخ تھا۔عوام کا دل جیتنے کے لیے طالبان نے جرائم پیشہ عناصر کے خلاف کریک ڈاؤن شروع کیا۔اس علاقے کے لوگ نااہل اور کرپٹ مرکزی حکومت سے پہلے ہی طویل عرصے سے تنگ تھے۔اپریل 2008ء میں طالبان نے اورکزئی سے نو افراد کو گرفتار کیا اور ان کے خلاف مقدمے چلانے کے لیے انہیں وزیرستان لے گئے۔اپنی طاقت کو مزید منوانے کے لیے نومئی 2008ء کو مقامی علماء اور قبائلی رہنماؤں کی شرکت کے ساتھ منعقد کیے گئے جرگے میں ہونے والے فیصلے کے تحت اورکزئی میں لڑکیوں کی تعلیم اور این جی اوز کے کام کرنے پر پابندی عائد کردی۔مقامی طالبان نے اغوا کاروں اور ڈاکوؤں کو بھی خبردار کیا کہ وہ طالبان کی شوریٰ کے سامنے پیش ہوں اور اپنے جرائم سے توبہ کریں یا پھر شریعت کے مطابق سخت سزا کے لیے تیار رہیں۔سرکاری ملازمین کو بھی خبردار کیا گیا کہ وہ ٹھیک ہوجائیں یا سخت سزا کے لیے تیار رہیں۔

اورکزئی میں طالبان کی متوازی حکومت بھرپور طریقے سے کام کررہی تھی جہاں اس کی اپنی سیکورٹی فورسز علاقے میں گشت کرتی تھیں اور ان کی شرعی عدالتیں انصاف فراہم کرتی تھیں

۔طالبان کی سخت حکمرانی کی ایک مثال یہاں پر پیش کی جاتی ہے جب ان کی شرعی عدالتوں کی جانب سے سماج دشمن کارروائیوں پر چھ مبینہ اغواکاروں کو سرعام سزائیں سنائی گئیں ۔جولائی 2008ء میں اورکزئی کے دبوری نامی علاقے میں پاکستانی حکومت نے قبائلی عمائدین کے ساتھ ایک امن معاہدہ کیا۔معاہدے کے تحت طے پایا کہ ایجنسی میں دہشت گردوں، مجرموں اور پاکستانی حکومت کے خلاف کام کرنے والے دیگر عناصر کو پناہ نہیں دی جائے گی اور بدلے میں پاکستانی حکومت اس علاقے میں فوجی کارروائی نہیں کرے گی ۔تاہم جنوبی وزیرستان میں کیے جانے والے معاہدے کی طرح یہ امن معاہدہ بھی ناکام ہوگیا۔اکتوبر 2008ء میں علی خیل قبائل کی جانب سے طالبان عسکریت پسندوں کوعلاقے سے نکالنے کی حکمت عملی طے کرنے کے لیے لیے پانچ سوافراد پر مشتمل گرینڈ جرگہ ہورہا تھا کہ ایک خودکش بمبار نے جرگے میں داخل ہوکر خود کو اڑادیا جس سے 182 افراد ہلاک ہوگئے۔

حکیم اللہ محسود کا ابھرنا:

تحریک طالبان پاکستان کے سفاک سربراہ حکیم اللہ محسود کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ شمالی وزیرستان میں جنوری 2010ء میں امریکہ کی جانب سے کیے جانے والے ایک مشتبہ ڈرون حملے میں بچ نکلا تھا جبکہ اس کے بارے میں یقین کیا جارہا تھا کہ وہ مارا گیا ہے لیکن وہ دوبارہ منظرعام پر آگیا۔اس نے پشاور سے تعلق رکھنے والے صحافیوں کے ایک گروپ کواورکزئی میں واقع اپنے اڈے پر مدعوکیا اور اعلان کیا کہ اسے اس کے پیش رو بیت اللہ محسود کا جانشین سمجھا جائے ۔اس موقع پر حکیم اللہ محسود نے بتایا کہ بیت اللہ محسود نے اسے اورکزئی، کرم اور خیبر میں تحریک طالبان پاکستان کا سربراہ مقرر کیا ہے اور اس کے پاس آٹھ ہزار لڑاکوں کی فوج ہے۔

حکیم اللہ محسود جنوبی وزیرستان میں کوٹ کئی کے مقام پر 1980ء میں پیدا ہوا اور اس کا تعلق محسود قبائل کی اشانگی شاخ سے ہے۔اس نے ہنگو میں دیوبندی مدرسے سے تعلیم حاصل کی تاہم اس نے ملا کی حیثیت سے گریجویشن نہیں کی تھی۔ابتداء میں وہ بیت اللہ محسود کے محافظ اور ڈرائیور کے طور پر کام کرتا رہا تھا۔تاہم اپنی کرشماتی نوجوان شخصیت کے پیش نظر وہ جلد ہی تحریک طالبان پاکستان کی اوپری صفوں میں شامل ہوگیا۔پاکستانی سیکورٹی فورسز اور نیٹو کے سپلائی ٹرکوں پر حملوں کی وجہ سے وہ خاصا بدنام تھا۔اگست 2007ء میں حکیم اللہ محسود کے لشکر نے جنوبی وزیرستان سے تین سو پاکستانی فوجیوں کو اغوا کرلیا اور اس وقت تک رہا نہیں کیا جب تک اس وقت

کے پاکستانی صدر نے ان کے بدلے پچیس طالبان لڑاکوں کو رہا نہیں کر دیا۔

دسمبر 2008ء میں حکیم اللہ محسود کے لشکر نے بالائی اورکزئی اور زیریں اورکزئی میں شریعت نافذ کر دی اور نہ صرف عورتوں کے بازاروں میں داخلے پر پابندی عائد کر دی بلکہ ٹی وی اور سی ڈیز کو بھی غیر قانونی قرار دے دیا اور پوری ایجنسی میں شرعی عدالتیں قائم کر دیں۔ اورکزئی کو اپنی اسلامی امارات قرار دینے کے کئی ماہ بعد حکیم اللہ محسود نے لگ بھگ ایک سو سال سے آباد 63 سکھ خاندانوں پر جزیہ عائد کر دیا۔ اس سلسلے میں اسے 34 لاکھ کی رقم ادا کی گئی جبکہ جزیہ ادا کرنے میں ناکامی کی وجہ سے کئی سکھ خاندان علاقے سے فرار ہونے پر مجبور ہو گئے۔ تحریک طالبان پاکستان نے کوئلے کی کانوں کی تجارت کرنے والے تاجروں سے بھی بھاری مالیت میں کمیشن لیا۔

حکیم اللہ محسود، منگل باغ پر دباؤ ڈال کر آسانی کے ساتھ خیبر ایجنسی میں بھی داخل ہو گیا۔ منگل باغ لشکر اسلام نامی عسکری گروپ کا سربراہ تھا اور تحریک طالبان پاکستان یا ٹی ٹی پی کا مخالف تھا کیونکہ وہ علاقے میں آزادانہ اثر و رسوخ چاہتا تھا۔ اس نے منگل باغ کو خیبر پر کنٹرول رکھنے کی اجازت دیدی تاہم اس کے بدلے اس نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ ٹی ٹی پی کو نیٹو سپلائی ٹرکوں کو نشانہ بنانے کی اجازت دے جو طورخم کے راستے افغانستان میں نیٹو افواج کو سپلائی پہنچاتے تھے۔ حکیم اللہ محسود نے 2009-2008 کے دوران نیٹو کے چھ سو سے زائد ٹرکوں کو تباہ کرنے اور پشاور کے نواح میں ان کے گوداموں کو نشانہ بنانے کا دعویٰ کیا۔ ان حملوں کی وجہ سے 2008 میں پاکستان نے چھ مرتبہ خیبر میں واقع اس روٹ کو بند کیا جو نیٹو کی ٹریفک کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ پھر حکیم اللہ محسود نے خیبر اور درہ آدم خیل کی طرف سے پشاور شہر پر دباؤ بڑھا دیا اور حملوں کو تیز کرتے ہوئے 2009 میں شہر کا محاصرہ کر لیا۔ تحریک طالبان پاکستان ہنگو میں فرقہ وارانہ تشدد میں بھی ملوث رہی اور کرم ایجنسی کو باقی پاکستان سے کاٹ دیا۔ اورکزئی میں طالبانائزیشن کے عمل کے نتیجے میں علاقے میں فرقہ واریت کو اور بھی فروغ ملا کیونکہ انٹی شیعہ گروپ جیسے سپاہ صحابہ اور لشکر جھنگوی بھی تحریک طالبان پاکستان میں ضم ہو گئے۔

اورکزئی میں تحریک طالبان پاکستان کا سٹرکچر کسی حد تک غیر واضح ہے تاہم یقین کیا جاتا ہے کہ مولوی سعید خان اس کا مرکزی سربراہ اور حافظ سعید گروپ کا ترجمان ہے۔ مولوی سعید وزیرستان کے عسکری کمانڈروں میں خاصی عزت رکھتا ہے اور اسے خاصا صاحب علم اور ذہین سمجھا

MashalBooks.org

جاتا ہے۔مولوی نور جمال جسے مولوی طوفان بھی کہا جاتا ہے وہ بالائی اورکزئی کے علاقے ماموزئی سے ٹی ٹی پی کا لیڈر رہے۔وہ چالیس کے پیٹے میں بتایا جاتا ہے اوراس کی شہرت ایک ظالم اور بدمزاج انسان کی ہے جو کسی زمانے میں ہنگو کے ایک مدرسے میں استاد تھا۔اورکزئی ایجنسی کے علاقے فیروزخیل میں تحریک طالبان پاکستان کا کمانڈر اسلم فاروقی ہے۔اسلم فاروقی جس نے 1999ء میں طالبان لشکر تشکیل دیا،اس کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ سپاہ صحابہ سے منسلک ہے جو کہ ایک انٹی شیعہ گروپ ہے۔اسلم فاروقی گروپ افغانستان میں طالبان کی کامیابیوں سے متاثر تھا اور چھوٹی چھوٹی کارروائیاں کرتا تھا جو 2001ء تک متحرک رہا لیکن پھر گیارہ ستمبر کے حملوں کے بعد امریکہ کے افغانستان پر حملے کے بعد یہ اپنی رفتار کھو بیٹھا۔تحریک طالبان پاکستان کے زیادہ تر آپریشنل کمانڈروں کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ 2009ء کے اواخر میں پاکستانی فوج کے جنوبی وزیرستان میں آپریشن کے بعد انہوں نے اورکزئی میں ہی پناہ لی۔

بتایا جاتا ہے کہ اس علاقے میں جو دیگر گروپ آپریٹ کررہے ہیں ان میں ایک اور انٹی شیعہ گروپ لشکر جھنگوی،قاری حسین کی سربراہی میں کام کرنے والا فدائین اسلام (خودکش بمبار پیدا کرنے والا گروپ) اور ملکی وغیر ملکی جنگجوؤں پر مشتمل عبداللہ عظام بریگیڈ شامل ہیں۔

اورکزئی میں القاعدہ اور دیگر غیر ملکی جنگجو:

اورکزئی میں زیادہ تر جنگجو باہر سے آئے دکھائی دیتے ہیں اور ان میں بھی زیادہ تر وزیرستان اور درہ آدم خیل سے تعلق رکھتے ہیں تاہم ان میں چھوٹی سی تعداد مقامی جنگجوؤں کی بھی ہے جن کے پاس اس کے علاوہ کوئی آپشن نہیں کہ وہ عسکریت پسندوں کے ساتھ مل کر کام کریں۔طالبان کو ماموزئی،علی خیل اور فیروزخیل قبائل سے بھاری حمایت حاصل ہے۔ابتداء میں یہ مقامی قبائل عسکری اسلام میں اپنے یقین سے زیادہ محض فرقہ ورانہ بنیادوں پر طالبان کا ساتھ دے رہے تھے۔

القاعدہ اوران کے اتحادی غیر ملکی جنگجو بشمول عرب چیچن اورازبک اورکزئی کو،بالخصوص جنوبی وزیرستان میں پاکستانی فوج کے آپریشن کے بعد،اپنی پناہ گاہ اور پلاننگ گراؤنڈ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ان کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ تحریک طالبان پاکستان ساتھ وہ جنوبی وزیرستان کو چھوڑ کر اورکزئی اور شمالی وزیرستان آجائیں جہاں وہ علاقائی کنٹرول کے لیے بڑی شدت کے ساتھ لڑتے رہے ہیں۔

پاکستانی فوجی آپریشن:

2010 سے پہلے پاکستانی فوج نے اورکزئی میں طالبان کے ٹھکانوں کے خلاف محض دکھاوے کی کارروائیاں کیں جن میں زیادہ تر فضائی حملوں پر انحصار کیا گیا جبکہ بہت کم تعداد میں زمینی دستے استعمال کیے گئے۔ جولائی 2009ء میں گن شپ ہیلی کاپٹروں کے ذریعے اورکزئی کے علاقوں اوبلان اور طور چھپر میں بمباری کی گئی جس میں سات عسکریت پسند مارے گئے۔ نومبر 2009ء میں جنگی طیاروں کے ذریعے زیریں اورکزئی میں طالبان کے ٹھکانوں پر دوبارہ بمباری کی گئی جس میں بارہ عسکری ہلاک جبکہ ان کے زیرزمین اسلحہ کے ڈپو تباہ ہوگئے۔ دسمبر 2009ء میں پاکستانی وزیراعظم یوسف رضا گیلانی نے اعلان کیا کہ پاکستانی حکومت اورکزئی میں بھرپور فوجی آپریشن کی تیاری کررہی ہے تاکہ علاقے سے عسکریت پسندوں کا صفایا کیا جاسکے جو خود کو دوبارہ منظم کررہے ہیں اور پاکستان بھر میں خودکش حملے اور دیگر حملے کررہے ہیں۔ عسکریت پسندوں پر فضائی اور جزوی زمینی حملوں کے نتیجے میں اورکزئی سے چالیس ہزار سے زائد افراد اپنے گھروں سے بے گھر ہوگئے۔ عسکری کمانڈروں اسلم فاروقی اور درہ آدم خیل سے طارق آفریدی گروپ نے سکیورٹی فورسز اور مقامی قبائلی ملیشیاز کے خلاف حملے کیے۔ 30 دسمبر 2009ء میں ایک زمینی اور فضائی حملے میں سیکورٹی فورسز نے 37 عسکریت پسندوں کو ہلاک کرنے کا دعوی کیا جبکہ زیریں اورکزئی کے انجانی نامی علاقے میں لیوی کے چار سپاہی جاں بحق ہوگئے۔

جنوری 2010ء کے اوائل میں طالبان نے زیریں اورکزئی کے علاقے فیروزخیل میں ایک پورا گاؤں نذر آتش کردیا اور یہ ظالمانہ فعل حکومت کے خلاف طالبان کی حمایت نہ کرنے پر انہیں سزا دینے کے لیے کیا گیا۔ دسمبر 2009ء میں طالبان جنگجوؤں نے متعدد قبائلی عمائدین کو اغوا کرلیا تھا اور مقامی لوگوں کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے مبینہ جاسوسوں کو قتل کیا گیا۔

وسط جنوری میں جوابی ردعمل کے طور پر پاکستانی سیکورٹی فورسز نے اورکزئی کو جانے والا مرکزی راستہ بند کردیا گیا تاکہ علاقے میں ایک بڑی کارروائی کی تیاری کی جائے جس کے بعد فوج نے ایجنسی کے مختلف حصوں میں اٹھارہ چوکیاں قائم کردیں۔ پاکستانی حکومت کو یہ بھی پتہ چلا کہ ملک کے مختلف شہروں اور علاقوں میں خودکش حملوں کے لیے جو بمبار بھیجے جاتے ہیں ان میں نوے فیصد اورکزئی میں ہی تیار کیے جاتے ہیں جس کے نتیجے میں یہاں پر فوری طور پر ایکشن لینا پڑا۔ پاکستانی سیکورٹی فورسز کلایہ کا کنٹرول حاصل کرچکی ہیں جو نصف سے زائد زیریں ایجنسی کا

ہیڈکوارٹر ہے تاہم ہزاروں کی تعداد میں عسکریت پسند ہنگو، کرم، خیبر کی سرحدوں پر پوزیشنیں لے چکے ہیں تاکہ اپنے مضبوط ٹھکانے اورکزئی کا دفاع کر سکیں۔ 23 مارچ 2010ء سے ایف سی کے دستے زیریں اورکزئی کے انجانی ستوری خیل، لال بیل خیل، فیروز خیل اور اتمان خیل میں داخل ہو گئے جہاں انہوں نے اٹھائیس اپریل کو علاقے کو کلیر قرار دے دیا۔

اب تک سات سو خاندانوں کو علاقے میں واپس بھجوایا جا چکا ہے اور پاکستانی فورسز بالائی اورکزئی کے علاقے دبوری میں داخل ہونے کی کوشش کر رہی ہیں جو تا حال تحریک طالبان پاکستان کے کنٹرول میں ہے۔ پاکستانی فوج کا دعویٰ ہے کہ فوجی آپریشن میں اب تک ساڑھے پانچ سو طالبان جنگجو ہلاک ہو چکے ہیں تاہم طالبان ذرائع کا کہنا ہے کہ ان کے صرف سو افراد ہلاک ہوئے۔ کارروائی میں 37 پاکستانی فوجی بھی جاں بحق ہوئے۔ اکتیس مئی کو آرمی چیف اشفاق پرویز کیانی نے اورکزئی کا دورہ کیا اور فوج کی فتح کا اعلان کر دیا۔ تاہم ایجنسی سے دربدر ہونے والے دو لاکھ افراد کو تا حال وہاں پر واپس بھیجا نہیں جا سکا اور ایجنسی میں لڑائی جاری رہی۔ ستمبر کے اوائل میں پاکستانی فوج نے اورکزئی کو ایک بار پھر عسکریت پسندوں سے کلئیر قرار دے دیا اور دعویٰ کیا کہ آپریشن کے دوران چھ سو طالبان مارے گئے ہیں۔

اورکزئی کے لوگوں کی شکایت:

اورکزئی کے لوگوں کی شکایات فاٹا کی دیگر آبادی جیسی ہی ہیں جن میں سیاسی اور انتظامی کرپشن، انصاف میں تاخیر اور معاشی پسماندگی وغیرہ شامل ہیں۔ انتظامی سسٹم کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ اس سے قبائلی عمائدین اور سردار ہی فائدہ اٹھاتے ہیں جو سیاسی حمایت فراہم کرنے کے بدلے سرکاری حکام سے رشوت لیتے ہیں۔ مزید براں یہاں کے لوگ عسکریت پسندوں اور اس کے نتیجے میں پاکستان کے فوجی آپریشن کے حوالے سے بھی تشویش کا شکار ہیں۔ جو افراد 2010ء کے موسم بہار میں کیے جانے والے آپریشن کے نتیجے میں بے گھر ہوئے تھے وہ تا حال علاقے میں واپس آنے پر تیار نہیں۔

راحیل خان فری لانس صحافی ہیں اور پاکستان میں عسکریت پسند کے امور پر مہارت رکھتے ہیں۔ وہ مختلف ٹی وی چینلز پر اینکر پرسن اور فاٹا کے چار سرکاری ریڈیو سٹیشنوں کے لیے ڈائریکٹر ایڈیٹوریل کی حیثیت میں بھی کام کرتے رہے ہیں۔

MashalBooks.org

غیر ملکی جنگجو

ٹامس ہیگ ہیمر

MashalBooks.org

1980ء کے بعد اسلامی دنیا میں جاری مسلح تنازعات کی ایک خصوصیت ان میں غیر ملکی جنگجوؤں کا ملوث ہونا ہے جو بغیر معاوضے کے لڑنے والے سپاہی ہیں جن کا تنازعہ سے بظاہر اس کے سوا کوئی تعلق نہیں کہ وہ اپنے ہم مذہب مسلمانوں کی مدد کے لیے ایسا کرتے ہیں ۔1980ء سے کوئی دس ہزار سے تیس ہزار کے درمیان اس قسم کے جنگجو مغرب میں بوسنیا اور مشرق میں فلپائن تک کے علاقوں میں اپنے آپ کو لڑائیوں میں شامل کرتے رہے ہیں ۔غیر ملکی جنگجو اس لحاظ سے اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ وہ اس لڑائی کو متاثر کرتے ہیں جس میں وہ شریک ہوتے ہیں جیسا کہ انہوں نے 2003ء کے بعد عراق میں فرقہ وارانہ تشدد اور دیگر ہتھکنڈوں کے ذریعے کیا۔(1) شاید زیادہ اہم بات یہ ہے کہ غیر ملکی جنگجوؤں کی سرگرمی سے القاعدہ جیسے بین الاقوامی دہشت گرد گروہوں کو طاقت ملتی ہے کیونکہ جب کوئی شخص انفرادی طور پر جنگ میں شامل ہو جاتا ہے تو اس سے آگے چل کر عسکریت پسندی کی مزید انتہائی صورتیں سامنے آتی ہیں۔مثال کے طور پر جب مغرب میں آباد مسلمان بنیاد پرستی کی طرف جاتے ہیں تو وہ عام طور پر ایک دم اپنے ہی ملک میں دہشت گردی کی منصوبہ بندی نہیں کرتے بلکہ اس کے بجائے پہلے جنگ سے متاثر علاقوں جیسے افغانستان اور عراق جاتے ہیں۔حقیقت تو یہ ہے کہ القاعدہ کے لوگوں کی اکثریت نے اپنے عسکری کیریئر کا آغاز رضا کار جنگجوؤں کی حیثیت سے ہی کیا اور اس وقت زیادہ تر بین الاقوامی جہادی گروپ غیر ملکی جنگجوؤں کی سرگرمی کی ذیلی پیداوار ہی ہیں۔(2) چنانچہ بین الاقوامی اسلامی عسکریت پسندی کو سمجھنے کے لیے غیر ملکی جنگجو بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

غیر ملکی جنگجوؤں کا رجحان کیوں اور کب سامنے آیا ؟ آج کل غیر ملکی جنگجوؤں کی موجودگی کو اسلامی دنیا میں جاری لڑائیوں کی پیداوار سمجھ کر صرف نظر کر لیا جاتا ہے۔تاہم 1980ء سے پہلے طویل فاصلے کی غیر ملکی جنگجوؤں کی سرگرمی شاذ و نادر تھی۔(3)لیکن جب یہ دیکھا جائے کہ جدید اسلام ازم نے انیسویں صدی کے اواخر میں جنم لیا اور یہ کہ اسلامی گروپوں نے 1940ء کی

دہائی میں ہی تشدد کو استعمال کرنا شروع کر دیا تھا اور یہ کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان مسلح تنازعات بیسویں صدی کے پورے عرصے میں اٹھتے رہے ہیں تو یہ بات ایک پہیلی لگتی ہے کہ 1980ء سے پہلے طویل فاصلے کی غیر ملکی جنگجوؤں کی حرکت پذیری یا سرگرمی شاذ و نادر تھی۔ غیر ملکی جنگجوؤں کے ابھرنے کے معاملے کے حوالے سے موجودہ لٹریچر بہت کم سوالوں کے جواب دے پاتا ہے کیونکہ اس قسم کی حرکت پذیری یا فعالیت پسندی کے بارے میں بہت کم مطالعہ کیا گیا ہے۔ غیر ملکی جنگجوؤں کے انفرادی تنازعات میں ملوث ہونے کے حوالے سے مواد موجود ہے لیکن ان کی موجودگی کے حوالے سے وضاحت کرنے کے لیے کسی قسم کا کراس کیس تجزیہ یا نظری کوشش تقریباً وجود ہی نہیں رکھتی۔[4] ایک نایاب استثنیٰ ڈیوڈ میلٹ کی تحقیق کی صورت میں موجود ہے جو کہتے ہیں کہ اس رجحان کے لیے پولیٹیکل سائنس کے لٹریچر میں کوئی ٹھوس اصطلاح موجود ہی نہیں۔[5]

اس اصطلاح کی عدم موجودگی کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ غیر ملکی جنگجو درمیانے ایکٹرز کے ایک درجے میں آتے ہیں جو کہ ایک ایسا درجہ ہے جو ایک جانب تو مقامی باغیوں اور دوسری جانب بین الاقوامی دہشت گردوں میں مدغم ہو چکا ہے۔ ٹرانس نیشنل ازم کے حوالے سے خانہ جنگی کا ابھرتا ہوا لٹریچر جلاوطن باغیوں کے بارے میں ہے یا باغیوں کی مدد کرنے والی غیر ملکی ریاستوں کے بارے میں ہے، آزاد عالمی کارکنوں کے بارے میں نہیں۔[6] سوشل موومنٹ لٹریچر نے زیادہ توجہ موخر الذکر کی جانب دی تاہم اس نے اب تک غیر متشدد ورائٹی کی طرف توجہ نہیں دی۔[7] اس کا نتیجہ یہ ہے کہ غیر ملکی جنگجوؤں کی سٹڈی دہشت گردی کی جزوی شعبہ جاتی سٹڈی تک محدود ہو کر رہ گئی ہے جس کو زیادہ تر القاعدہ سے منسلک کر دیا جاتا ہے۔[8] (اگرچہ اکثر غیر ملکی جنگجو جہاز تباہ نہیں کرتے لیکن جنگ کے ایک محدود میدان میں نیم فوجی حربے استعمال کرتے ہیں)۔ وہ ہر لحاظ سے در انداز اور لڑاکے ہوتے ہیں۔[9]

اس مضمون کا مقصد سہ جہتی ہے: اول، غیر ملکی جنگجوؤں کو در اندازوں اور دہشت گردوں سے ایک مختلف درجے میں ثابت کرنا۔ دوئم، مسلم غیر ملکی جنگجوؤں کے بارے میں نئی معلومات فراہم کرنا، اور سوئم، اس صورت حال کے اصل کے بارے میں ایک قابل قبول مفروضہ پیش کرنا۔ اس تجزیے کی بنیاد غیر ملکی جنگجوؤں کی سرگرمی کے حوالے سے ایک نیا ڈیٹا سیٹ، عربی کے ان چھوٹے بنیادی اور ثانوی ذرائع کا ایک وسیع مجموعہ اور برطانیہ، اردن، پاکستان، فلسطین

اور سعودی عرب سے تعلق رکھنے والے سابق غیر ملکی جنگجوؤں سے کیے گئے انٹرویو پر ہے۔

مضمون کا سکوپ دو اہم محدودات کا حامل ہے۔اول،اس کا تصور جاتی فوکس غیر ملکی جنگجوؤں کی سرگرمی کے عمومی میکینزم پر نہیں بلکہ حرکیاتی تشکیل پر ہے۔ میں غیر ملکی جنگجوؤں کے حوالے سے ایک عالمی نظریے کو فارمولیٹ نہیں کرتا اور نہ ہی ان کی بھرتی کی شرح کے حوالے سے کوئی پیش گوئی یا انفرادی بھرتی کے حوالے سے کوئی وضاحت کرتا ہوں۔دوسرا فوکس مسلم دنیا پر ہے۔مسلم غیر ملکی جنگجوؤں کے حوالے سے سٹڈی ایک خاص اہمیت کی حامل ہے کیونکہ دوسرے مذاہب اور نظریات کے غیر ملکی جنگجوؤں کے مقابلے میں مسلمان غیر ملکی جنگجوؤں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور وہ دیگر مذاہب کے غیر ملکی جنگجوؤں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تنازعات کو متاثر کررہے ہیں۔ مزید یہ کہ ان کی دنیا کے بڑے بڑے تنازعات جیسے افغانستان اور عراق میں ملوث ہونے اور اس کے ساتھ القاعدہ کی بھرتی میں کردار ادا کرنے کے باعث یہ موجودہ دور کی عالمی سلامتی کے حوالے سے خاص طور پر چیلنج کا درجہ رکھتے ہیں۔

میں یہ بھی واضح کردوں کہ یہ مضمون عمومی طور پر اسلام ازم کے بارے میں نہیں بلکہ ایک مخصوص قسم کی اسلامی فعالیت پسندی کے بارے میں ہے۔اسلام ازم سیاسی طور پر اس معنی میں متنوع ہے کہ مختلف اسلامی عمل کار مختلف معیاراتی سیاسی سرگرمیوں میں تخصیصی صلاحیت رکھتے ہیں۔کچھ مقامی حکومتوں کی پرامن طریقے سے مخالفت کرتے ہیں اور کچھ دہشت گردی کے ذریعے ان کا تختہ الٹنا چاہتے ہیں اور دیگر ایسے ہیں جو غیر مسلم طاقتوں کے قبضے کے خلاف مزاحمت کرتے ہیں۔(10) تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف اقسام کی اسلامی فعالیت پسندی سر اٹھاتی رہی ہے،جس سے پتہ چلتا ہے کہ شاید ان کا کاز بھی کسی حد تک مختلف ہے۔یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنے تجزیے میں ایسے کئی فیکٹر کو نظر انداز کیا ہے جن پر کہ اسلامی ری احیا (Islamic resurgence) کے ابھرنے کے حوالے سے زور دیا جاتا ہے جیسے 1967ء کی جنگ میں عربوں کی شکست،عرب قوم پرستی کا زوال، یا ایرانی انقلاب وغیرہ۔ایسے کئی عوامل جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اسلامی تحریک کے لیے ایندھن بنے، وہ مسلم غیر ملکی جنگجوؤں کے کی صورت حال کی وضاحت کرنے کے لیے ناکافی دکھائی دیتے ہیں۔(11)

میرا نقطہ ءنظر یہ ہے کہ غیر ملکی جنگجوؤں کا کی صورت حال اسلام ازم کی مقبول عام شکل پان اسلام ازم کی ایک نئی زیریں لہر کا متشدد پھیلاؤ ہے جو 1970ء کی دہائی میں ابھرا جس کا سبب

حکمران اقلیتی اشرافیہ کی جانب غیر متشدد بین الاقوامی اسلامی تنظیموں میں اٹھائے جانے والے ان کے سٹریٹجک اقدامات تھے۔سیاسی طور پر متعلق ہونے اور زیادہ بجٹ کے ساتھ ان کے کارکنوں جن کی بنیادیں زیادہ تر سعودی عرب کے حجاز خطے میں تھیں انہوں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ مسلمان اقوام کو بیرونی خطرات لاحق ہو گئے ہیں۔انہوں نے خیراتی اداروں کا ایک بین الاقوامی نیٹ ورک قائم کیا تا کہ مسلمانوں کی مدد کی جاسکے۔حجاز کے پان اسلامسٹوں نے جو اصول اور نیٹ ورک وضع کیے تھے انہوں نے عرب کارکنوں کو اس قابل بنا دیا کہ وہ 1980ء کی دہائی کے افغانستان کے لیے مسلمانوں کی آپسی یک جہتی کے نام پر غیر ملکی جنگجوؤں کو بھرتی کر سکیں۔عرب افغان سرگرمی نے جواب میں غیر ملکی جنگجوؤں کی ایک ایسی تحریک تیار کی جو اس وقت بھی موجود ہے جو ایک ایسا رجحان ہے جو القاعدہ سے جزوی طور پر ممتاز ہے۔

حجازی پان اسلامسٹ کمیونٹی اپنے وجود کی وجہ 1960ء کی دہائی میں ہونے والی پیش رفتوں کو بتاتی ہے جن میں مصر، عراق اور شام میں اخوان المسلمون کے کارکنوں کو دباؤ کا نشانہ بنانا اور جلاوطن کرنا اور بین الاقوامی اسلامی اداروں کا قیام اور سعودی عرب میں متعدد نئی یونیورسٹیوں کا ظہور شامل ہے۔لوگوں کو جلاوطن کیے جانے کے باعث پڑھی لکھی افرادی قوت کی طلب پوری ہوگئی جس کے نتیجے میں مغربی سعودی عرب کے خطہ حجاز میں وسیع پیمانے پر بین الاقوامی کارکنوں کی کمیونٹی نے سر ابھارا۔مقامی سیاسی اثر ورسوخ کے محدود امکانات اور بین الاقوامی پیمانے پر کام کے مواقع کے نتیجے میں ان کارکنوں نے پوری لگن کے ساتھ بین الاقوامی فعالیت اور مقبول عام پان اسلام ازم کے لیے کام کیا۔1970ء کی دہائی میں تیل کی دولت، نئی ٹیکنالوجی اور حکومتی نگرانی نہ ہونے نے انہیں نظریاتی طور پر بہت بااثر بنا دیا۔اس وقت کی حکمران اشرافیہ نے انہیں چھوٹ دیدی اور کسی حد تک ان کی مدد بھی کی کیونکہ انہیں خوف تھا کہ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ان کے بارے میں سمجھا جائے گا کہ انہیں بیرونی دنیا کے پسے ہوئے مسلمانوں سے ہمدردی نہیں ہے۔قصہ مختصر یہ کہا جاسکتا ہے کہ جہاد کا بین الاقوامی شکل اختیار کرنا اشرافیہ کی مسابقت کا ایک عمل ہے۔

مضمون چار مراحل میں آگے بڑھتا ہے۔اول، میں ''غیر ملکی جنگجوؤں'' کی اصطلاح کی وضاحت کرتا ہوں جس کے لیے میں ان کی سرگرمی کے تاریخی ریکارڈ کو پیش کرتا ہوں اور غیر ملکی جنگجوؤں کی فعالیت کی پہیلی کو واضح کرتا ہوں۔پھر اگلے مرحلے میں میں اپنے معاملاتی انتخابات کے سلسلے میں پانچ وضاحتوں کا جائزہ پیش کروں گا جس میں میں تنازعاتی ڈھانچے، دراندازی کے

MashalBooks.org

خا کے، حکومتی رکاوٹوں، کمیونی کیشن ٹیکنالوجی اور اسلام ازم کے ارتقاء پر زور دوں گا۔ اس کے بعد میں غیر ملکی جنگجوؤں کے لشکروں کے درمیان ادارہ جاتی اور نظریاتی تعلق کا جائزہ لیتا ہوں جس سے پتہ چلتا ہے کہ زیادہ تر سرگرمیاں ایک نئی نظریاتی تحریک کا حصہ ہیں جو کہ 1980ء میں ابھری تھی۔ چہارم اور سب سے آخری مرحلے میں میں 1980ء کی دہائی میں افغانستان میں غیر ملکی جنگجوؤں کی تحریک کی تشکیل کا جائزہ لیتا ہوں۔

غیر ملکی جنگجوؤں کی صورت حال

تین حصوں پر مشتمل یہ حصہ غیر ملکی جنگجوؤں کے تصور کی وضاحت کرتا ہے اور ان کی سرگرمی کے اعداد و شمار پیش کرتے ہوئے اس پہیلی کو واضح کرتا ہے جو اس مضمون میں پیش کی گئی ہے۔

تعریف:

ڈیوڈ میلٹ غیر ملکی جنگجوؤں کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے۔ ''لڑائی میں شریک ریاستوں کے غیر شہری افراد جو کہ سول تنازعات کے دوران دراندازی میں شامل ہوتے ہیں۔(12)'' میں اس فارمولیشن کی بنیاد پر جنگجوؤں کی تعریف ان الفاظ میں کروں گا:

اول: ایسے افراد جو لڑائی میں شامل ہو جاتے ہیں اور خود کو ایک مخصوص حد کے اندر رکھتے ہیں۔

دوئم: جو لڑائی میں شریک ریاست کے شہری نہیں ہوتے اور نہ ہی ان کا لڑائی میں شریک گروہوں سے کوئی رشتہ داری تعلق ہوتا ہے۔

سوئم: ان کا سرکاری فوجی ادارے سے تعلق نہیں ہوتا۔

چہارم: انہیں کسی قسم کی تنخواہ نہیں دی جاتی۔

یہ چاروں چیزیں غیر ملکی جنگجوؤں کو دیگر اقسام کے متشدد گروہوں سے ممتاز کرتی ہیں جو کہ سرحد پار کر کے آتے ہیں۔ چوتھا نکتہ انہیں کرائے کے فوجیوں سے جدا کرتا ہے جنہیں تنخواہ دی جاتی ہے اور جو اسی کے ساتھ جاتے ہیں جو سب سے زیادہ پیسے دے۔ تیسرا نکتہ انہیں فوجیوں سے الگ کرتا ہے جنہیں تنخواہ دی جاتی ہے اور جو اپنے جرنیلوں کے حکم پر لڑائی میں جاتے ہیں۔ تیسرا نکتہ انہیں بیرون ملک میں مقیم شہریوں اور جلاوطن باغیوں سے الگ کرتا ہے جن کا ریاستوں کے درمیان لڑائی میں سٹیک ہوتا ہے۔ یہ فرق بہت اہمیت کا حامل ہے کیونکہ لڑائی سے کسی قسم کا نسلی یا رشتہ داری تعلق سرگرمی کو قابل ذکر حد تک بڑھاتا ہے۔(13) اب پہلا نکتہ ہے جو غیر ملکی جنگجوؤں کو

بین الاقوامی دہشت گردوں سے الگ کرتا ہے جو کہ آؤٹ آف ایریا جا کر ان افراد کو بھی نقصان پہنچانے میں مہارت رکھتے ہیں جو کہ لڑائی میں شریک نہیں ہوتے۔اس امتیاز کا بہت کم خیال رکھا جاتا ہے اور عسکری اسلام ازم پر اکثر تحقیقات میں بین الاقوامی متشدد اسلامسٹوں کو بیان کرنے کے لیے عام اصطلاح جیسے کہ جہادی یا سلفی جہادی استعمال کی جاتی ہے چاہے وہ کسی مغرب دارالحکومت میں خودکش حملہ ہو یا کسی جنگ زدہ علاقے میں مارٹر کا حملہ ہو۔(14) حقیقت میں اکثر غیر ملکی جنگجو آؤٹ آف ایریا کارروائیوں میں کبھی ملوث نہیں ہوتے اور صرف جنگ زدہ علاقے تک ہی محدود رہتے ہیں۔

غیر ملکی جنگجو ایک دوسرے سے دو طرح سے مختلف ہوتے ہیں جن میں ایک ان کے لیے ریاستی سپانسر شپ کی سطح اور دوسری بین الاقوامی بھرتی میں ان کی رسائی ہوتا ہے۔اگرچہ غیر ملکی جنگجو فوجی نہیں ہوتے تاہم انہیں کسی نہ کسی شکل میں ریاست کی مدد حاصل ہوتی ہے۔بہت سی تاریخی رضا کار فورسز موثر قسم کی بے قاعدہ فوجیں ہوتی ہیں جنہیں ریاستوں کی جانب سے ہی تخلیق کیا جاتا ہے تا کہ ان کے ذریعے کارروائیوں میں لچک حاصل کی جاسکے یا ان سے انکار کا بہانہ بھی حاصل رہے۔مثال کے طور پر 1948ء کی عرب اسرائیل جنگ میں شریک پانچ ہزار ارکان پر مشتمل آرمی آف سالویشن جسے عرب لیگ نے تیار کیا تھا اور وہی اس کو پیسہ دیتی تھی اور جسے تربیت اور قیادت عراقی اور شامی فوجی افسران فراہم کرتے تھے اور اس کو جزوی طور پر تنخواہوں کی ادائیگی کی جاتی تھی۔(15)

اسی طرح ہسپانوی خانہ جنگی میں شریک انٹرنیشنل بریگیڈ شاید رضا کار فورسز تھیں تاہم انہیں کسی نہ کسی طور پر براہ راست سوویت یونین کی مدد حاصل تھی۔(16) اگرچہ ریاستی پشت پناہی کا تعلق اس کے درجے سے ہے تاہم نجی اور ریاستی امداد کی سرگرمی کے درمیان امتیاز آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔میں ایک ایسی سرگرمی کو ریاستی امداد کی حامل قرار دوں گا جس میں کسی حکومتی ادارے کی جانب سے غیر ملکی جنگجوؤں کو مادی امداد دی جارہی ہو۔

مزید برآں کچھ غیر ملکی جنگجو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ غیر ملکی ہوتے ہیں۔کسی تنازعے میں کتنی اقوام کے لوگ شریک ہیں اور اس کے لوگ کہاں کہاں سے کتنا فاصلہ طے کر کے آئے ہیں اس میں خاصا فرق ہوتا ہے۔کچھ تنازعات میں دنیا بھر سے لوگ شریک ہوجاتے ہیں جبکہ دیگر تنازعات میں آس پاس کی ریاستوں کے ہی کچھ لوگ شریک ہوتے ہیں۔1948ء کی

عرب اسرائیل جنگ میں یہودی رضا کاروں کی شرکت بین الاقوامی لشکر کی ایک مثال ہے جس میں شریک یہودیوں کا تعلق چار براعظموں سے تھا۔(17) اس کے برعکس شمالی افریقہ میں 1950ء کی دہائی کی سامراج مخالف جنگ میں صرف آس پاس کے اسلامی ملکوں کے لوگ شریک ہوتے تھے۔اس طرح جغرافیائی رسائی کا تعلق بھی اس کے درجے سے ہے تاہم اس میں سادگی پیدا کرنے کے لیے میں ان کے درمیان بین الاقوامی اور علاقائی غیر ملکی جنگجوؤں کی سرگرمی کا امتیاز قائم کروں گا۔ علاقائی غیر ملکی جنگجو میرے مطابق وہ ہوں گے جو کہ جنگ زدہ علاقے سے ملحق ممالک سے تعلق رکھتے ہوں گے۔ یہ مضمون بین الاقوامی اور نجی غیر ملکی جنگجوؤں کی حرکت پذیری پر فوکس کرتا ہے کیونکہ یہ اپنے آپ کو زیادہ محدود رکھتے ہیں اور یوں اپنی صورت حال کے اعتبار سے زیادہ بڑی پہیلی کا درجہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ میں ان معاملات کے حوالے سے زیادہ تشویش کا شکار ہوں جن میں مختلف ملکوں سے تعلق رکھنے والے مسلمان براہ راست ریاستی امداد کے بغیر طویل فاصلہ طے کر کے دیگر مسلمانوں کے شانہ بشانہ جنگ میں شریک ہوتے ہیں۔

اعداد و شمار

غیر ملکی جنگجوؤں کی صورت حال کے سکیل اور پھیلاؤ کا جائزہ لینے کے لیے میں نے مسلم دنیا میں 1945 سے 2009ء کے درمیان رہ چکی بڑی بڑی اندرونی دراندازیوں اور بین الریاستی جنگوں کی فہرست کو جمع کیا اور ان میں غیر ملکی جنگجوؤں کی شرکت کے بارے میں متعلقہ ثانوی اور بنیادی ذرائع سے معلومات حاصل کیں۔(18) بڑے بڑے تنازعات کے بارے میں مکمل فہرست کو جیمز فیئر ون اور ڈیوڈ لائیٹن کی فہرست کو ضم کر کے تیار کیا گیا۔(19) اوپر پیش کیا گیا ڈیٹا سیٹ بالترتیب 2003 اور 1996ء میں ختم ہوتا ہے جبکہ بعد کے سالوں کے لیے میں نے ایسے تنازعات کو شامل کیا ہے جن کی خصوصیات جیسا کہ میڈیا میں ان کے بارے میں رپورٹ ہوا، انہی شرائط سے ملتے تھے جو کہ دو تشکیل شدہ سیٹوں میں تھے۔ حتمی فہرست میں 1945ء کے بعد مسلم دنیا کے تمام تنازعات کو شامل نہیں کیا گیا لیکن یہ میری جانب سے غیر ملکی جنگجوؤں کی تعریف سے مطابقت رکھتے ہیں کہ جنہوں نے بڑی بڑی دراندازیوں میں شرکت کی۔(20) عالمی سطح پر غیر ملکی جنگجوؤں کی حرکت پذیری کے حوالے سے بہت کم مشہور کیسز ہوں گے جو کہ اس فہرست میں شامل نہیں۔(21)

1945ء کے بعد سے مسلم دنیا میں 70 مسلح تنازعات میں سے اٹھارہ تنازعات ایسے

تھے جن میں عالمی سطح پر غیر ملکی جنگجوؤں کے لشکروں نے شرکت کی۔ جغرافیائی طور پر یہ واقعات تین براعظموں میں پیش آئے اور زیادہ تر مسلم دنیا کی حدود میں وقوع پذیر ہوئے۔ سولہ لشکر 1980ء کے بعد حرکت میں آئے جن میں ایک 1980ء کی دہائی میں، دس 1990ء کی دہائی میں اور پانچ 2000ء کی دہائی میں حرکت میں آئے۔ اس کے برعکس صرف دو لشکر 1980ء سے پہلے حرکت میں آئے جبکہ 1960ء سے پہلے کوئی بھی حرکت میں نہیں آیا۔ ان لشکروں میں شامل ہونے والوں کے بارے میں کوئی قابل بھروسہ اعداد وشمار موجود نہیں تاہم اندازوں کی تقسیم کاری دو مثالی ہے جن میں پانچ واقعات میں ایک ہزار لڑاکوں جبکہ تیرہ واقعات میں تین سو سے بھی کم لڑاکوں نے شرکت کی۔ دو واقعات میں چار ہزار جنگجوؤں نے شرکت کی جو کہ افغانستان اور عراق کے میدان جنگ میں گئے۔ (22) تمام واقعات میں ایک چیز مشترک ہے کہ ان میں جنگجوؤں کی ٹوٹل تعداد میں غیر ملکی جنگجوؤں کا تناسب بہت کم تھا۔ جس لڑائی میں سب سے زیادہ غیر ملکی جنگجوؤں نے شرکت کی وہ غالباً عراق کی لڑائی تھی جہاں پانچ فیصد جنگجو غیر ملکی تھے۔ (23) عرب دنیا خصوصی طور پر اور سعودی عرب عمومی طور پر ان ملکوں میں شامل تھا جن کے جنگجو غالب ترین تعداد میں تھے ماسوائے 1980ء کی افغانستان کی لڑائی کے جس میں بڑی تعداد میں ایشیائیوں نے بھی شرکت کی۔ عرب ذرائع سے رپورٹ کی جانے والی رپورٹوں میں ممکنہ طور پر جانبداری ہوسکتی ہے لیکن مسلم غیر ملکی جنگجوؤں کی صورت حال کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ یہ غالب حد تک عرب ہے۔ (24)

ٹیبل ون میں دو نکات کے بارے میں مزید وضاحت کی ضرورت ہے کیونکہ یہ روایتی دانش سے متضاد ہیں۔ اول، میں نہیں سمجھتا کہ 1948ء کی عرب اسرائیل جنگ کے سلسلے میں عرب حرکت پذیری عالمی یا نجی تھی کیونکہ زیادہ تر جنگجو ریاستی حمایت یافتہ آرمی آف سالویشن کے تنخواہ دار ممبر تھے جبکہ جو ممبر نہیں تھے جیسے مصری اخوان المسلمون، ان کا تعلق واحد ہمسایہ ملک سے تھا۔ دوئم 1980ء کی افغان لڑائی کی حرکت پذیری کو میں نجی سمجھتا ہوں۔ غیر ملکی جنگجوؤں کو فعال ریاستی حمایت کی بجائے خفیہ حمایت حاصل تھی۔ یہ امتیاز زبردست اہمیت کا حامل تھا کیونکہ موخر الذکر کیس حرکت پذیری کے لیے کافی جواز رکھتا تھا جبکہ اول الذکر کیس میں بھی کسی حد تک حرکت پذیری ضروری تھی۔ 1980ء کی دہائی میں عربوں افغانوں کی فعال ریاستی پشت پناہی کا تصور وسیع پیمانے پر غلط فہمی پر مبنی تھا جس نے مقبول عام ''بلو بیک تھیوری'' کو ابھارا تھا جس کے مطابق عرب افغان

حرکت پذیری (اور بعد میں القاعدہ کی شکل میں اس کی توسیع) امریکہ اور سعودی عرب کی تخلیق تھی جو بعدازاں اپنے آقاؤں پر ہی پل پڑی۔ (25) یہ غلط فہمی ایک جانب افغان مجاہدین اور دوسری جانب غیر ملکی جنگجوؤں کی اصطلاح سے پھوٹی تھی اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ چونکہ ریاست افغانوں کو مسلح کر رہی تھی اس لیے وہ عربوں کو بھی مسلح کر رہی تھی۔ (26) امریکہ اور سعودی عرب نے افغان مجاہدین کو قابل ذکر حد تک مالی، لاجسٹک اور فوجی امداد فراہم کی تھی۔ (27) اس بات کے کسی قسم کے شواہد موجود نہیں کہ عرب افغانوں کو منظم اور براہ راست ریاستی مدد حاصل تھی۔ (28) خلیجی ریاستوں اور مغربی حکومتوں نے اگرچہ غیر ملکی جنگجوؤں کی بھرتی پر چپ سادھے رکھی لیکن انہوں نے نہ تو ان کو منظم کیا اور نہ ہی ان کے لیے کوئی پیسہ دیا۔ غیر ملکی جنگجوؤں کو نجی عطیات دہندگان اور غیر حکومتی اسلامی عطیاتی اداروں کی طرف سے پیسہ دیا گیا۔ سب سے فعال ریاستی امداد سعودی عرب کی جانب سے اس شکل میں دیکھنے میں آئی کہ ریاست کی جانب سے سعودی عرب سے پاکستان کی طرف سفر کے لیے فضائی ٹکٹ میں سب سڈی دی گئی لیکن ایسا صرف 1980ء کی دہائی کے اواخر میں کیا گیا جس کا فائدہ امدادی کارکنوں اور ساتھ ہی رضا کار جنگجوؤں کو بھی ہوا۔ (29) اس کے علاوہ یہ بات بھی خلاف عقل دکھائی دیتی ہے کہ کہا جائے کہ کسی تیسری ریاست نے بین الاقوامی بے قاعدہ جنگجو فورس تشکیل دی کیونکہ افغان مجاہدین سوائے افرادی قوت کے ہر چیز میں کمزور تھے جبکہ زیادہ عرب جنگجو بھی غیر تجربہ کار جنگجو تھے۔

معمہ

مسلم غیر ملکی جنگجوؤں کا معاملہ دو معمے پیش کرتا ہے۔ انفرادی شرکت اور تاریخ وار تنوع ۔ میں اول الذکر کے بارے میں مختصر بات کرتے ہوئے موخر الذکر پر توجہ مرکوز کروں گا۔

یہ مضمون بھرتی کی سپلائی سائیڈ کی طرف فوکس نہیں کرتا لیکن انفرادی شرکت کی اصطلاح کے بارے میں مختصر جائزہ غیر ملکی جنگجوؤں کی فعالیت کی خصوصیت کو سراہنے کے لیے ضروری ہے۔ کوئی کسی دوسرے کی جنگ لڑنا کیوں چاہے گا؟ کوئی کہہ سکتا ہے کہ جنگ میں شرکت کا نقصان اس قدر زیادہ نہیں جتنا سمجھا جاتا ہے۔ 1980ء کی دہائی کی افغان جنگ میں غیر ملکی جنگجوؤں کی اموات کی شرح بہت کم (دو سے چھ فیصد کے درمیان) تھی (30) اور اوسطاً ایک دورہ اس قدر مختصر ہوتا تھا کہ جہاد کے رضا کاروں کو ''سیاح'' قرار دیا جاتا تھا۔ (31) اس کے بعد کی بعض لڑائیوں میں اموات

کی شرح زیادہ تھی۔ مثال کے طور پر 1990ء کے اواخر میں لڑائی کے لیے چیچنیا جانے والوں میں سے بہت کم زندہ واپس آسکے۔ (32) جنگ زدہ تمام علاقوں میں زخمی ہونا بھی عام تھا۔

ان تنازعات کے سیاسی یا مادی نتائج سے متعلقہ معروضی شکایات اس رویے کے حوالے سے ایک غیر ممکنہ وضاحت ہے۔ زیادہ تر غیر ملکی جنگجو جن ملکوں میں لڑائی کے لیے جاتے تھے وہاں کے واقعات سے وہ زیادہ متاثر نہیں ہوتے اور مقامی دراندازوں کو عوامی طور پر جو سہولیات دی جاتی تھیں وہ غیر ملکیوں کے لیے نہیں ہوتی تھیں۔ علاقائی حرکت پذیریوں (پاکستانیوں کا افغانستان جانا) میں معروضی شکایات کا کوئی کردار ہو لیکن عالمی حرکت پذیری میں نہیں (سعودی عرب کے لوگوں کا چیچنیا جانا)۔ رنگروٹوں کے اپنے ممالک میں پائی جانے والی شکایات بھی ایک غیر ممکنہ وضاحت ہے کیونکہ رنگروٹ مختلف ممالک سے آئے اور انہوں نے مختلف اوقات میں جنگ میں شرکت کی۔ غیر ملکی جنگجوؤں کے حوالے سے تحقیقات بھرتیوں کے حوالے سے معاشی عوامل کو شناخت کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ (33)

مادی چنیدہ مراعات بھی کوئی ایسی قابل اطمینان صورت حال پیش نہیں کرتیں۔ اس بات کے کسی قسم کے شواہد موجود نہیں کہ رضا کاروں کو ان کی خدمات کا کوئی معاوضہ دیا جاتا ہے۔ (34) مال غنیمت ہاتھ آنے کے امکانات بھی بہت کم ہوتے ہیں کیونکہ زیادہ تر جنگیں غریب ملکوں میں ہوتی ہیں جہاں غیر ملکی جنگجوؤں کے مقابلے میں مقامی جنگجوؤں بھاری تعداد میں ہوتے ہیں۔ فتح کی صورت میں غیر ملکیوں کو اقتدار میں حصہ ملنے کی بھی کوئی امید نہیں ہوتی۔ عرب ملکوں سے تعلق رکھنے والے بہت تھوڑی تعداد میں جنگجوؤں کو تحفظ کی سہولت دستیاب ہوتی ہے، اکثریت کو نہیں، جو اس سے پہلے غیر متحرک تھے اور پرامن ملکوں سے آئے تھے۔ مہم جوئی کا شوق بھی ممکنہ طور پر ایک فیکٹر ہوسکتا ہے لیکن یہ بات غیر واضح ہے کہ اس قسم کی سرگرمی میں ہی مہم جوئی کا شوق کیونکر پورا کیا جاسکتا تھا۔

مسلم غیر ملکی جنگجوؤں کے معاملے کو سمجھنے کے لیے کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ قومیت کے وسیع تر تصور کے حوالے سے کوئی عنصر یا غیر مادی مراعات کا کوئی عنصر ہوسکتا ہے (جیسے سماجی رتبہ یا آخرت میں انعام) یا یہ دونوں بھی ہوسکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کوئی اعتقاد یا کوئی نظریہ۔ (35) نظریاتی حوالے سے بات کی جائے تو اس میں ایک دوسرا معمہ سر اٹھاتا ہے جو کہ ایک مرکزی مسئلہ ہے۔ اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ غیر ملکی جنگجوؤں کی فعالیت کا تعلق مسلمانوں کے درمیان

یکجہتی کے حوالے سے کسی قسم کے اعتقاد یا عقیدے سے تعلق رکھتا ہے تو اس سوال کا جواب کون دے گا کہ 1980ء کی دہائی سے پہلے طویل فاصلے کی مسلم غیر ملکی جنگجوؤں کی فعالیت لگ بھگ وجود کیوں نہیں رکھتی تھی؟ حیرت ہے کہ کسی سکالر نے اس سوال پر اس سے پہلے گہرائی کے ساتھ غور نہیں کیا۔ بہت سی تحقیقات اور مطالعات میں مسلم غیر ملکی جنگجوؤں کے معاملے کو 1980ء کی دہائی کی افغان جنگ کی پیداوار سمجھا جاتا ہے اور یہ سوال کوئی نہیں پوچھتا تھا کہ آخر یہ لوگ سیدھے افغانستان ہی کیوں جاتے تھے۔

غیر ملکی جنگجوؤں کے حوالے سے میلٹ کی تھیوری جو کہ اب تک سامنے آنے والی واحد تھیوری ہے، اس میں اس معمے کا کوئی جواب نہیں۔ میلٹ کا کہنا ہے کہ جنگجوؤں کی بین الاقوامی بھرتی اس وقت عمل میں آتی ہے جب مقامی جنگجو جنگ کے دائرے کو وسیع کرنا چاہتے ہیں تا کہ وسائل میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی فتح کے امکانات کو بھی بڑھا سکیں۔ (36) تاہم وہ اس بات کی وضاحت نہیں کرتا کہ کچھ مقامی جنگجو غیر ملکیوں کی توجہ حاصل کرنے میں کس طرح کامیاب ہو جاتے ہیں اور کچھ کیوں اس میں کامیاب نہیں ہوتے۔ مزید یہ کہ اس کا بنیادی مفروضہ کہ مقامی جنگجو حرکت پذیری کو شروع کرتے ہیں، مسلم غیر ملکی جنگجوؤں کی حرکت پذیری کے حوالے سے شواہد کے ساتھ اس کو پیش نہیں کرتا جن میں زیادہ تر مقامی بغاوت یا لڑائی سے غیر متعلق ہوتے ہیں کیونکہ غیر ملکی جنگجوؤں کی بھرتی اور ان کا انتظام بھی دیگر غیر ملکیوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے، مقامیوں کے ہاتھ میں نہیں۔ در اندازا کثر بین الاقوامی مسلم برادری سے مالی اور سیاسی امداد کی اپیل کرتے ہیں اور بہت کم ہی جنگجوؤں کا مطالبہ کرتے ہیں۔ (37) غیر ملکی جنگجو لگ بھگ مدعو کیے بغیر ہی جنگ کے میدانوں میں جاتے ہیں۔

توجیہات

اس حصے میں، میں کیسز کی تاریخ وار تقسیم کاری کے لیے پانچ وضاحتوں پر غور کروں گا۔ پہلی چار میں برداشت میں تبدیلیوں پر فوکس کیا جائے گا۔ پانچویں میں محرکات میں ایک تبدیلی پر فوکس ہوگا۔ اکثر کیسوں میں زیادہ وضاحت کے ساتھ بات کرنے کے لیے اعداد و شمار دستیاب نہیں۔

تنازعاتی ڈھانچہ

پہلا مفروضہ یہ ہے کہ غیر ملکی جنگجو صرف کچھ اقسام کی لڑائیوں میں شریک ہوتے ہیں

مثال کے طور پر بین المذاہبی لڑائیاں، بہت زیادہ خونریز لڑائیاں اور کھلی غیر ملکی جارحیت والے واقعات۔۔۔۔اور اس قسم کی جنگیں 1980ء کے بعد سے زیادہ عام ہو چکی ہیں۔

مشہور واقعات اور ان میں شریک رضا کاروں کے نعروں پر ایک مختصر نگاہ ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ لڑنے والے فریقین میں مذہبی اختلاف بہت زیادہ اہم ہے۔اسی طرح کی ایک مختصر نگاہ اگر 1945ء کے بعد مسلم دنیا پر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ 1980ء سے پہلے مذہبی اختلاف پر مبنی بہت سی لڑائیاں موجود تھیں بالخصوص انڈونیشیا، فلسطین، کشمیر، ملائشیا، تیونس، مراکش، الجزائر، فلپائن، اوگادن، سوڈان اور قبرص وغیرہ۔مزید براں چند ایسے مواقع بھی تھے جب مذہبی اختلاف کے باوجود غیر ملکی جنگجوؤں نے تنازعات میں شرکت کی جیسے تاجکستان، الجزائر اور 1990ء کے بعد افغانستان میں دیکھا جا سکتا ہے۔مذہبی فرق غیر ملکی جنگجوؤں کی حرکت پذیری کے امکانات اور اس کی شدت پر ممکنہ طور پر بہت اثر انداز ہوتا ہے تاہم یہ غیر ملکی جنگجوؤں کی حرکت پذیری کی نہ تو ضروری اور نہ ہی کافی وجہ ہے۔

اس مفروضے کی ایک دوسری قسم کے مطابق تنازعے کی شدت بھی اہمیت کی حامل ہے۔تاہم اس کی تصدیق مشکل ہے۔جنگوں میں اموات کے اعداد و شمار بہت پیچیدہ اور بدنامی کی حد تک متنازعہ ہوتے ہیں اور جنگ کی اموات سے شہریوں کی تکلیف کی عکاسی بھی نہیں ہوتی۔دستیاب اعداد و شمار سے جنگی اموات اور غیر ملکی جنگجوؤں کی شرکت کے درمیان واضح باہمی تعلق کا پتہ نہیں چلتا۔[38] الجزائر کی جنگ آزادی (جس میں غیر ملکی جنگجوؤں کی حرکت پذیری نہیں تھی) ان تنازعات سے کہیں زیادہ خونریز تھی جو 1990ء اور 2000ء کی دہائی کے بعد ہوئے اور جن میں غیر ملکی جنگجوؤں نے شرکت کی۔1980ء کی دہائی کی افغان جنگ بھی پہلے کے کئی تنازعات سے زیادہ خونریز تھی تاہم ایران عراق جنگ سے کم مہلک تھی جس میں کسی قسم کی غیر ملکی جنگجوؤں کی سرگرمی نہیں ہوئی تھی۔کوئی بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ افغانستان، ایران عراق اور لبنان کے تنازعات میں کل جو اموات ہوئیں وہ غیر ملکی جنگجوؤں کی حرکت پذیری کی وجہ بنیں کیونکہ اندازوں کے مطابق 1980ء کی دہائی میں ہونے والے ان تنازعات میں کل جتنی اموات ہوئیں (صرف 1982ء میں 165000) وہ گذشتہ عشروں میں ہونے والی لڑائیوں سے زیادہ تھیں۔یہ خاصی حد تک غیر ملکی جنگجوؤں کی صورت حال کی ایک بڑی وجہ ہے۔

تنازعاتی ڈھانچے کے اس مفروضے کی تیسری قسم اس علاقے کا سیاسی مرتبہ ہے جہاں

لڑائی جنم لیتی ہے۔ 1950 اور 1960ء کی دہائی میں مسلم دنیا میں ہونے والے زیادہ تر تنازعات غیر ملکی سامراج سے آزادی کی جنگ تھے جبکہ اس کے بعد جو کئی تنازعات ہوئے وہ ان ملکوں میں ہوئے جو پہلے ہی آزاد تھے۔ ہوسکتا ہے کہ آزاد ملکوں کی جانب سے آزاد ملکوں کے خلاف جارحیت کو وسیع تر مسلمان برادری نے جارحیت کے زیادہ ڈرامائی انداز میں دیکھا ہو اور غیر ملکی جنگجوؤں نے اس میں زیادہ کشش محسوس کی ہو۔ اس نکتے کے حوالے سے ایک اور بات کی جاسکتی ہے کہ چونکہ 1980ء کی دہائی کا افغانستان پہلا مسلمان ملک تھا جسے غیر مسلم ملک کی جانب سے جارحیت کا نشانہ بنایا گیا تھا اور یہ کہ اس کے بعد دو مزید بڑے ملکوں یعنی 2001ء میں افغانستان اور 2003ء میں عراق پر قبضے کے بعد بالترتیب چوتھی اور دوسری سب سے بڑی غیر ملکی جنگجوؤں کی حرکت پذیری کو جواز بخشا۔ 1990 اور 2000ء کے بعد حرکت پذیریوں کی اکثریت ایسی جنگوں کے حوالے سے تھی جن کو کسی ملک کا قبضہ نہیں کہا جاسکتا۔ اس کے برعکس بوسنیا، تاجکستان، چیچنیا اور کوسوو کے تنازعات کو ڈھانچہ جاتی طور پر دیکھا جائے تو وہ افغانستان اور عراق کے مقابلے میں سامراج کے خلاف جنگ سے زیادہ مطابقت رکھتے تھے۔ آخر میں یہ کہ یہ بات بھی واضح نہیں کہ سامراج مخالف جدوجہد میں غیر ملکی جنگجوؤں نے کشش کیوں محسوس نہیں کی تھی جبکہ دیکھا جائے تو یہ جدوجہد بھی بنیادی طور پر کسی مسلم ملک کے علاقے کو آزادی دلانے کی جدوجہد ہی تھی ماسوائے اس بات کہ ابتدائی قبضہ اس وقت سے بہت پہلے کیا گیا تھا۔ اس کے برعکس یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ 1950ء کی دہائی کے بعد آزاد مسلمان ملکوں کی تعداد میں اضافے کے نتیجے میں بین الاقوامی فعالیت کے مقابلے میں مقامی قوم پرستی کی تحریکوں میں زیادہ اضافہ ہوا۔

جنگجوؤں کا خاکہ

دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ غیر ملکی جنگجو صرف ان تنازعات میں شریک ہوتے ہیں جہاں مقامی جنگجو مخصوص خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں (جیسے اسلامی نظریہ) یا ان کے پاس موجود وسائل (دیگر ممالک سے پہلے سے موجود تعلقات)۔ اسلام سے تعلق رکھنے والے بہت سے تنازعات کو دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے انہوں نے غیر ملکی جنگجوؤں میں کشش پیدا کی اور یہ قیاس کرنا مناسب ہوگا کہ خانہ جنگیوں میں مذہب کا بڑھتا ہوا کردار یا قوم پرست جدوجہد کی اسلامائزیشن نے بھی غیر ملکی جنگجوؤں کے فنامنا میں اضافہ کیا۔[39] تاہم بہت سے واقعات (اواخر 1960ء کی دہائی میں فلسطین، اواخر 1970ء کی دہائی میں لبنان، 1990ء کی دہائی میں صومالیہ، بوسنیا، چیچنیا

اور کوسووو) غیر ملکی جنگجو بہت سی لڑائیوں میں شرکت کرتے رہے ہیں جو خالص اسلامی نوعیت کی نہیں تھیں ۔ مزید اہم یہ ہے کہ یہ سوچ لینا بھی غیر مناسب نہیں کہ بعض لڑائیوں نے ایک ایسا اسلامی لبادہ اوڑھ لیا تاکہ غیر ملکی مسلم دنیا کی حمایت حاصل کی جاسکے۔ (40) آخر میں یہ کہ تنازعات کی اسلامائزیشن اور غیر ملکی جنگجوؤں کے ابھرنے دونوں کے پیچھے ایک گڈمڈ کردینے والی صورت حال بھی ہوسکتی ہے۔

جنگجوؤں کے خاکے کے حوالے سے ایک اور متاثر کردینے والا مفروضہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جنگجوؤں کے عرب دنیا میں اسلامی برادری سے پہلے سے موجود تعلقات بھی غیر ملکی جنگجوؤں کی شرکت کی بڑی وجہ ہوسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر اکثر افغان مجاہدین لیڈر 1960ء کی دہائی میں مصر کی اسلامی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرچکے تھے جس سے ممکنہ طور پر افغانستان میں عربوں کے ملوث ہونے کی بنیاد پڑی۔ (41) اعداد و شمار کی قلت کے باعث اس مفروضے کو ٹیسٹ کرنا بہت مشکل دکھائی دیتا ہے تاہم بہت سی واقعاتی شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ 1980ء کی دہائی کے کئی مشہور تنازعات جیسے مورو لبریشن فرنٹ وغیرہ میں جنگجوؤں کے عرب دنیا میں پہلے سے ہی بڑے پیمانے پر تعلقات موجود تھے جبکہ بہت سے واقعات جیسے صومالیہ، تاجکستان، چیچنیا، اریٹیریا اور کوسووو میں اس قسم کے تعلقات موجود نہیں تھے۔ (42)

حکومتی رکاوٹیں

ایک تیسرا مفروضہ یہ کہتا ہے کہ لوگ غیر ملکی تنازعوں میں اس وقت ہی شریک ہوتے ہیں جب حکومتیں انہیں اس کی اجازت دیتی ہیں۔ 1980ء کی دہائی غیر ملکی جنگجوؤں کی فعالیت کے حوالے سے اس صورت حال کو دیکھ چکی ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا کہ عرب افغان گروہ کو حکومت کی طرف سے فعال طریقے سے حمایت نہیں دی جارہی تھی تاہم انہیں خلیجی اور مغربی ممالک میں کسی رکاوٹ کے بغیر بھرتی پروگرام کی اجازت دی گئی تھی۔ بلاشبہ حکومتیں غیر ملکی جنگجوؤں کی حرکت پذیری پر اثر انداز ہوسکتی ہیں۔ اس حوالے سے بھی کوئی سوال نہیں کہ اگر اسرائیل اور اس کے ہمسایہ ممالک شدید قسم کی رکاوٹیں اور مشکلات پیدا نہ کرتے تو فلسطین میں 1990 اور 2000 کی دہائی میں بہت بڑی تعداد میں غیر ملکی جنگجوؤں کی شرکت ہوتی۔ حکومتوں کے لئے چھوٹے درجے کی حرکت پذیری کو روکنا ممکن نہیں ہوتا تاہم اگر ارادے مضبوط ہوں تو یہ کام مشکل نہیں ہے۔ زیادہ تر عرب حکومتوں کی جانب سے کھلی بھرتی کا سلسلہ 1990ء کی دہائی میں ختم ہوگیا تاہم

یہ رجحان پھر بھی پھلتا پھولتا رہا اور بڑی تعداد میں سعودی باشندے فلسطین جانے میں کامیاب ہوگئے۔ اگر افغانستان میں 1980ء کی دہائی کے افغان جہاد کو دیکھا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ غیر ملکی جنگجوؤں کے حوالے سے یہ ایک ایسا موقع تھا جو اہمیت کا حامل ہے۔ وقت کے حوالے سے وضاحت کرنے کے لیے اگر کوئی بات کرتا ہے تو یہ ثابت کرنا ہوگا کہ 1980ء سے پہلے حکومتی رکاوٹیں واقعی بہت زیادہ تھیں مگر فلسطین کے سوا دوسری اطراف میں حکومتی رکاوٹوں کے حوالے سے شواہد کی کمی کی وجہ سے ایسا کرنا بہت مشکل ہوگا۔ دلائل کو متوازن کرنے کے لیے کہا جاسکتا ہے کہ ممکنہ طور پر یہ دکھائی دیتا ہے کہ 1980ء کے بعد غیر ملکی جنگجوؤں کے پھیلاؤ کے حوالے سے عرب افغانوں کو ریاستی امداد کو ایک ضروری وجہ قرار دیا جاسکتا ہے تاہم یہ کافی نہیں۔

اطلاعاتی ٹیکنالوجی

ایک چوتھا امکان یہ ہوسکتا ہے کہ غیر ملکی جنگجوؤں کے حوالے سے عالمی حرکت پذیری کے لیے اطلاعاتی ٹیکنالوجی کی ضرورت ہے جو کہ 1980ء سے پہلے دستیاب نہیں تھی یا بہت مہنگی تھی۔ اس مفروضے کے ایک پہلو میں زرائع آمدورفت پر زور دیا گیا ہے۔ یہ ایک پرکشش آئیڈیا ہے کیونکہ سفری اخراجات کسی فرد کے لیے کسی دور دراز کی جنگ میں شریک ہونے کی براہ راست صلاحیت کو متاثر کرتے ہیں۔ بحری نقل وحمل، فضائی اخراجات اور ٹیلی فون کالز کے اخراجات 1940 اور 1980 کے درمیان بہت کم ہوگئے ہیں۔(43) سکالروں کے مطابق یہی ایک وجہ ہے کہ اس عرصے کے دوران حج کے لیے مکہ مکرمہ جانے والے افراد کی سالانہ تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے۔(44) یہ چیز بہت امکانی دکھائی دیتی ہے کہ سستے زرائع آمدورفت سے بھی عالمی غیر ملکی جنگجوؤں کی حرکت پذیری میں اضافہ ہوا البتہ یہ بات واضح نہیں ہوسکی کہ اس کی کون سی قیمت ادا کی گئی یا وہ کون سی مخصوص ٹیکنالوجی تھی جس سے یہ حرکت پذیری ممکن ہوئی۔ خالصتاً واقعاتی اعتبار سے بات کی جائے تو کوئی شاید یہ کہہ دے کہ طویل فاصلے کی غیر ملکی جنگجوؤں کی سرگرمی دسویں صدی عیسوی میں شروع ہوچکی تھی جب بازنطینی جارحیت کے خلاف عباسی خلافت کی مدد کے لیے جنگجو موجودہ ایران سے جنوبی ترکی کی طرف سفر کرتے تھے۔(45)

ٹیکنالوجی کے مفروضے کے حوالے سے دوسری قسم جس پر زور دیا جاتا ہے وہ نیا میڈیا ہے۔ اطلاعاتی اور اشاعتی ٹیکنالوجی بھرتی کے حوالے سے پروپیگنڈا کی رسائی، رفتار اور اثرات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس عرصے کے دوران عرب دنیا میں ٹیلی وژن اور دیگر نیوز میڈیا تک

عوامی رسائی میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے جس سے بیرونی اسلامی دنیا میں رونما ہونے والے واقعات کے حوالے سے لوگوں کی آگاہی میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے۔[46] غیر ملکی جنگجوؤں کی سرگرمی کے حوالے سے یوں میڈیا کا کردار بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اگر میڈیا کو ہی کافی سمجھا جائے تو پھر یہ امید کی جانی چاہیے کہ اس سے غیر مسلموں میں بھی کثیر القومی جنگجو کی تعداد اور فعالیت پسندی کے رجحانات میں بھی اضافہ ہوگا تاہم ایسا نہیں ہے۔ میلٹ نے اس عرصے کے دوران غیر مسلموں میں بھی غیر ملکی جنگجو حرکت پذیری کے چند واقعات کا پتہ چلایا ہے اور سماجی تحریکوں کے حوالے سے سکالرز 1990ء کی دہائی میں کثیر القومی فعالیت پسندی کے قابل ذکر اضافے کا پتہ چلاتے ہیں۔[47]

اسلام کا ارتقاء

پانچویں وضاحت کے سلسلے میں جس چیز پر فوکس کیا جاتا ہے وہ اسلامی تحریکوں کے ارتقاء کے محرکات اور غیر ملکی جنگجوؤں کے اس سے تعلق کے بارے میں ہے۔ غیر ملکی جنگجوؤں کے رجحان میں اضافہ اس لیے ہوا کہ اسلامی تحریکوں میں تیزی دیکھنے میں آئی۔ یہاں پر مشکل دوہری نوعیت کی ہے۔ اول اسلام ازم کے ابھرنے اور عالمی غیر ملکی جنگجوؤں کے ابھرنے کے درمیان تاریخ وار عدم تعلق ہے۔ نظریے کے طور پر اسلام ازم انیسویں صدی کے اواخر میں ابھرا اور ایک منظم سیاسی رجحان کے طور پر یہ 1920ء کی دہائی کے اواخر میں سامنے آیا۔[48] 1940ء کی دہائی کے اواخر میں مصر میں اخوان المسلمون کے کارکنوں کی تعداد کئی ہزار تک پہنچ چکی تھی۔[49] اس کے بعد کے عشروں میں افغان جہاد کے آغاز تک دیگر مسلمانوں کی جنگوں میں شرکت کرنے والے اسلام پسندوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ دوسرے یہ کہ اس عرصے کے دوران 1980ء سے پہلے کے اسلام پسندوں کے سیاسی منصوبوں اور غیر ملکی جنگجوؤں کی سرگرمیوں کے درمیان قابل ذکر حد تک عدم تعلق پیدا ہو گیا تھا۔[50] 1980ء سے پہلے کے بہت سے اسلام پسند گروپ اپنی ہی حکومتوں کے خلاف لڑ رہے تھے 1980ء سے پہلے اس بات کی بہت کم پیش گوئی کی جاتی تھی کہ غیر ملکی جنگجوؤں کی کوئی سرگرمی دیکھنے میں آئے گی۔ 1979ء کے ایرانی انقلاب کے حوالے سے یہی مسئلہ دیکھنے میں آیا تھا۔ امام خمینی کے انقلاب کا بنیادی جز یہ تھا کہ دیگر مسلم مقبوضہ علاقوں کے آزاد کرانے کے بجائے صرف اپنے ملک میں انقلاب لایا جائے۔ ان کے انقلاب کی کامیابی سے دوسرے انقلابیوں کو خود بخود تحریک ملے گی اور کسی حد تک مصر اور شام کے حوالے سے یہ بات

درست ثابت ہوئی۔تاہم دوسری جانب مسئلہ یہ تھا کہ چونکہ ایرانی انقلاب شعیہ انقلاب تھا اس لیے اس سے سنی عقیدے سے تعلق رکھنے والے غیر ملکی جنگجوؤں کی تحریک کو زیادہ فائدہ ہونے کا کوئی سوال نہیں تھا۔

کچھ نامور دانشور دعویٰ کرتے ہیں غیر ملکی جنگجوؤں کی صورت حال اس لیے ابھری کیونکہ اسلام ازم زوال پذیر تھا۔(51) اس تناظر میں دیکھا جائے تو 1980 اور 1990 ء کی دہائیوں میں اسلام ازم کی کثیر القومیت مرکزی دھارے کی اسلامی پارٹیوں کی کمزوری یا اعتدال پسندی یا دونوں کا ردعمل تھا۔تاہم یہ وضاحت بھی تسلی بخش نہیں۔وہ سلسلہ جس کے ذریعے مرکزی دھارے کی اعتدال پسندی بنیاد پرستی کی وجہ بنتی ہے قابل قبول اور جانی مانی چیز ہے جیسا کہ یورپ میں 1960ء کی بائیں بازو کی تحریکوں کے ساتھ ہوا۔(52) تاہم یہ بات بہت ہی کم واضح ہے کہ مرکزی دھارے کی اعتدال پسندی کے نتیجے میں بین الاقوامیت کس طرح پیدا ہو جاتی ہے۔مصری اور شامی انقلابیوں کی افغانستان کو ہجرت،افغانستان کی طرف عربوں کی حرکت پذیری کا ایک نتیجہ ہے سبب نہیں کیونکہ یہ لوگ ان افراد میں شامل نہیں تھے جو پہلے وہاں آئے اور یہ لوگ بین الاقوامی بھرتی میں اس قدر متحرک نہیں تھے (مرکزی انٹر پرینیور اخوان المسلمون جیسے عبداللہ عزام وغیرہ تھے)۔اس کے علاوہ افغانستان میں انقلابی اس قدر بڑی تعداد میں نہیں تھے۔1980ء کی دہائی میں افغانستان میں غیر ملکی جنگجوؤں کی اکثریت غیر متحرک تھی۔(53) جیسا کہ میں نے پہلے دکھایا کہ مقامی اسلام پسندوں کو دبانے کے عمل نے غیر ملکی جنگجوؤں کے ابھرنے کی صورت حال کے وقت میں کردار ادا کیا اور یہ اس سے زیادہ دائروی راستہ تھا جتنا پہلے سمجھا جاتا تھا۔

یوں دکھائی دیتا ہے کہ پانچوں وضاحتوں،جن پر اب تک نظر ثانی کی گئی،ان میں سے کسی کو بھی انفرادی طور پر غیر ملکی جنگجوؤں کی حرکت پذیری میں تاریخ وار تنوع کے سلسلے میں ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔حتمی امکان یہ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے دو یا اس سے زیادہ کا مجموعہ اس سلسلے میں ایک بھرپور سبب بنتا ہے۔یہاں پر مسئلہ یہ ہے کہ ایک سے زیادہ متغیرات کے درمیان باہمی تعلق کے اثرات کا تجزیہ کرنے،جس میں کئی قدریں موجود نہیں،میں مشکل کے علاوہ عوامل کا کوئی ایک بھی مجموعہ ایک خاص نوعیت کی قابل قبول وضاحت تشکیل نہیں دے پاتا۔مثال کے طور پر اطلاعاتی ٹیکنالوجی کی بہتر شدہ شکل اور اس کے ساتھ مضبوط اسلامی تحریکوں کے ذریعے جنگی رضا کار پیدا نہیں ہوتے اور اس سے محض زیادہ متحرک انقلابی ہی جنم لے سکتے ہیں جن کو

بڑے بڑے بین الاقوامی سپورٹ نیٹ ورکس کی مدد حاصل ہو۔اسی طرح کسی خاص ملک کے قبضے (جیسے افغانستان پر سوویت قبضہ)اور جنگی رضا کاروں کے حوالے سے حکومت کی جانب سے برداشت کا عارضی رویہ بھی بمشکل اس بات کی وضاحت کر پاتا ہے کہ لوگ کیوں عشروں کے بعد خود کو اس قسم کے تنازعات میں شامل کرتے ہیں جو حکومتوں کی سخت بندشوں میں ہوتے ہیں۔اوپر بیان کیے گئے کئی اسباب اس قسم کے حالات کو تشکیل دیتے ہیں جس میں حرکت پذیری پیدا ہونے کے امکانات جنم لیتے ہیں یا حرکت پذیری اپنی آخری حد تک پہنچ جاتی ہے۔اسلامی باغیوں کی موجودگی اور سفر کے کم ہو چکے اخراجات بھی حرکت پذیری میں اضافہ کرتے ہیں جبکہ تنازعے کی قسم ،حکومتی پابندیاں اور سفری اخراجات شدت کو بھی متاثر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔تاہم یہ اسباب چاہے اکٹھے ہوں یا مجموعے کی شکل میں، 1980ء کے بعد ابھرنے والی غیر ملکی جنگجوؤں کی حرکت پذیری کے لیے تسلی بخش اسباب پیش نہیں کرتے۔

نئی نظریاتی تحریکیں

یہ حصہ غیر ملکی جنگجوؤں کے حوالے سے ایک چھٹی وضاحت پیش کرتا ہے۔یہ ایک مختلف قسم کی محرکاتی تبدیلی کے بارے میں بتاتا ہے جو نئی نظریاتی تحریکوں کا ابھرنا یا اسلام ازم کی زیریں لہر ہے جو کہ 1980ء سے پہلے موجود نہیں تھی۔(54) مفروضے کے مطابق اس تحریک کے نمائندوں نے ہر قسم کی پابندیوں سے قطع نظر ان تنازعات میں شمولیت اختیار کی جن میں مسلمان شریک تھے۔دو قابل تجربہ پیش گوئیاں ابھرتی ہیں۔اول یہ کہ 1980ء کے بعد غیر ملکی جنگجوؤں کے درمیان نظریاتی ،سماجی اور تنظیمی تعلقات کو دیکھا جائے گا۔دوسرے یہ کہ غیر ملکی جنگجوؤں کے نظریات اور اسلامی نظریات کے درمیان اختلاف کو دیکھا جائے گا۔

پہلی پیش گوئی کی تصدیق کرنا مشکل نہیں کیونکہ 1980ء کے بعد غیر ملکی جنگجوؤں کے لشکروں میں لاتعداد قسم کے تعلق ہیں۔پہلے کے تنازعات کے بھرتی میں استعمال ہو چکے لٹریچر کو بعد کے تنازعات میں استعمال کیا جاتا ہے اور نئے پروپیگنڈا میں پرانے تنازعے کے بارے میں بھرپور طریقے سے حوالے موجود ہوتے ہیں۔یہاں پر افراد کا غلبہ تھا اور 1980ء کی افغان جنگ میں شریک تجربہ کار عربوں نے اس کے بعد کے لگ بھگ آٹھ جنگی واقعات میں لوگوں کو حرکت میں لانے والے اولین لوگوں کا کردار ادا کیا۔(55) بڑی تعداد میں لوگوں نے ایک سے زیادہ جنگی تنازعات میں شرکت کی جبکہ بہت سے لوگ ایسے تھے جنہوں نے پانچ پانچ چھ چھ جنگوں میں

شرکت کی۔ (56)

آخر کار اسی قسم کے لاجسٹک سلسلوں اور فنڈنگ کے ذرائع ، بالخصوص اسلامی خیراتی ادارے، نے کئی مختلف حرکت پذیریوں میں کردار ادا کیا۔ (57)

دوسری پیش گوئی کی تصدیق کرنا زیادہ مشکل ہے۔اس بات کو جاننے کے لیے کہ آیا 1980ء کے بعد ایک مخصوص نوعیت کے غیر ملکی جنگجوؤں کے نظریات ابھرے، اس کے لیے میں نے 1980ء کی دہائی کے افغانستان ، بوسنیا اور عراق کے بھرتی پروپیگنڈا کا جائزہ لیا اور اس کا موازنہ 1880ء سے پہلے اسی قسم کے اسلامی گروہوں اور 1980ء کے بعد دیگر اقسام کی متشدد فعالیت پسندی میں ملوث گروپوں کے پروپیگنڈا سے کیا۔ میں نے افغانستان ، بوسنیا اور عراق کا انتخاب اس لیے کیا کیونکہ یہ سب سے بڑی حرکت پذیری کی نمائندگی کرتے تھے اور دوسرا یہ کہ ان کا تاریخ وار تسلسل بہت اچھے طریقے سے منقسم ہے کیونکہ یہ تینوں واقعات مختلف عشروں کے درمیان پیش آئے۔

جان ولسن کی پیروی کرتے ہوئے میں نے بھرتی کے پیغامات کے حوالے سے اس کے تین پہلوؤں پر فوکس کیا: تشخیص (کیا خرابی ہے)'علاج (کیا کرنے کی ضرورت ہے) اور منطق (یہ کام کس کو کرنا چاہیے اور کیوں) (58) بڑی تعداد میں موجود دستاویزات کو دیکھتے ہوئے میں نے صرف ایسے مواد پر انحصار کیا جسے مبصرین اور شرکاء کی جانب سے حرکت پذیری کے زمانے میں بہت اہم اور بااثر قرار دیا جاتا تھا۔ 1980ء کی دہائی کے حوالے سے بات کی جائے تو عبداللہ عزام اور ان رسائل جنہیں پشاور میں موجود عرب تیار کرتے تھے سے پتہ چلتا ہے کہ عزام اس وقت افغانستان میں عربوں کے ملوث ہونے کے سب سے بڑے اور بااثر حامی تھے اور پشاور افغانوں عربوں کا اڈہ تھا۔ (59) بوسنیا کے حوالے سے میں نے ابو عبدالرحمان الدعاسری (بربروس) کی بیانات ور بھرتی کی ترغیب کے لیے 1992-95 کی ویڈیوز کا جائزہ لیا۔ الدعاسری اگرچہ اتنا مقبول اور بااثر نہیں تھا جتنا 1980ء کی دہائی کا عزام تھا تاہم بوسنیا میں عربوں کے ملوث ہونے کے حوالے سے وہ اولین محرک اور اہم ترین ترجمان تھا۔ (60) عراق کے لیے میں نے ابو عمر السیف اور بھرتی کی ترغیب کے لیے 2003-2004ء کی انٹرنیٹ ویڈیوز کا جائزہ لیا۔ چیچنیا میں مقیم السیف ذاتی طور پر عراق میں ملوث نہیں تھا لیکن عراق میں غیر ملکی جنگجوؤں کے جنگ میں حصہ لینے کا سب سے بااثر حمایتی تھا۔ (61)

غیرملکی جنگجوؤں کے نظریات کے مندرجات

تمام تین نمونوں میں تشخیص یہ کی گئی تھی کہ مسلم قوم یعنی امہ کو بیرونی جانب سے خطرات درپیش ہیں۔ یہ کہ مسلمانوں کی زمین پر قبضہ کر کے انکا قتل عام کیا جارہا ہے جس سے انہیں نکالنے کے لیے جہادیوں کی انتہائی شدید ضرورت ہے۔ان دستاویزات میں میدان جنگ میں مبینہ طور پر ڈھائے جانے والے مظالم کی تصویر کشی کی جاتی کہ مسلمانوں کی سرزمین پر قبضہ کیا جاچکا ہے ،ان کی عورتوں سے زیادتی کی جارہی ہے۔ بچوں اور بوڑھوں کو قتل کیا جارہا ہے۔ مسجدوں کو شہید کیا جارہا ہے اور مسلمانوں کے وسائل لوٹے جارہے ہیں۔دستاویزات میں دنیا بھر میں غیر مسلموں کے ہاتھوں پر مسلمانوں پر ظلم وتشدد کے دیگر واقعات کے بارے میں بھی بتایا جاتا ہے۔

اس کا علاج یہ تجویز کیا جاتا ہے کہ مسلمان بھی فوجی طریقے سے اس کی مزاحمت کریں۔اس کے لیے دوقسم کی مناطق بیان کی جاتی ہیں۔ان میں سب سے اہم یہ کہ اسلامی قانون اس کی اجازت دیتا ہے۔اس سلسلے میں مقدس آیات اور کلاسیکی ماہرین فقہ کی تحریروں کو پیش کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ جہاد کی شرائط لاگو ہو چکی ہیں۔دوسری تواتر سے پیش کی جانے والی منطق عملی نوعیت کی ہوتی ہے کہ حالات اس قدر خراب ہیں اور دشمن اس قدر شاطر ہے کہ کوئی سفارتی طریقہ کارگر نہیں ہوسکتا۔

عقلی دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ چونکہ اسلامی قانون اس کی ضرورت ظاہر کرتا ہے اس لیے دنیا بھر سے مسلمان جنگ کے لیے آئیں۔ مسلمانوں کے جن علاقوں پر قبضہ کیا گیا ان کا دفاع صرف ان علاقوں کے مسلمانوں پر نہیں بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں پر فرض ہو چکا ہے۔اس بلاوے کی حمایت میں دوقسم کے دلائل پیش کیے جاتے ہیں۔ پہلے میں مسلمانوں کی یک جہتی پر زور دیا جاتا ہے۔متاثرین کو باقاعدہ طریقے سے ''ہمارے بھائی، بہنیں، مائیں اور بچے'' کہا جاتا ہے جیسے جن افراد کو جنگ کے لیے بلایا جارہا ہے وہ ان کے خون کے رشتہ دار ہیں۔دوسری دلیل میں اسلامی قانون کا استعمال کیا جاتا ہے کہ جہاد تمام مسلمانوں کے لیے مذہبی فریضہ ہے۔

دستیاب تمام دستاویزات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عبداللہ عزام غیرملکی جنگجوؤں کے حوالے سے اب تک کا سب سے بااثر نظریہ ساز ہے۔ہم عصر مصنفین تعریفی انداز میں اس کا ذکر کرتے ہیں اور اس کے بعد کی ویڈیوز میں اس کی تقریروں کی ریکارڈنگ پیش کی جاتی ہے۔اس کے الفاظ غیرملکی جنگجوؤں کے نظریات کے لیے بنیادی حیثیت کے حامل ہیں اور اس طرح غیرملکی

MashalBooks.org

جنگجوؤں کے نظریات اور دیگر جہادی نظریات کے درمیان تقابل کے لیے بنیاد فراہم کرتے ہیں۔

غیر ملکی جنگجوؤں کے نظریات کی منفرد خصوصیات

1980ء میں اس کے تعارف کے وقت غیر ملکی جنگجوؤں کا نظریہ موجود جہادی نظریات سے دو معنوں میں مختلف تھا۔ اول یہ ایک مکالمے کی پیش کش کرتا تھا جس میں بیرونی دشمن پر فوکس کیا جاتا تھا جبکہ اسلامی انقلابیوں کے نظریات میں اندرونی دشمن پر فوکس کیا جاتا تھا۔ 1980ء سے پہلے عملی طور پر تمام عسکری اسلامی گروہ اپنے اپنے ملکوں میں اپنی حکومتوں کی تبدیلی کے لیے لڑتے تھے۔ (62) سید قطب اور محمد فراج جیسے اسلامی انقلابیوں کے مطابق جہاد کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ بدعنوان حکمرانوں کا خاتمہ کیا جائے اور سیکولر قوانین کو کالعدم کیا جائے۔ غیر ملکی جارحیت سے لڑائی اس میں شامل نہیں تھی۔ (63)

دوسرے، عزام کی ڈاکٹران یا نظریہ جہاد کے حوالے سے قدامت پسند اسلامی نظریات سے مختلف تھا جس میں نجی جنگ کے لیے منطق اور دلیل کی پیش کش کی گئی تھی مثال کے طور پر حکومت کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ افراد کو جنگ کے لئے بیرون ملک جانے سے روک سکتی ہے۔ (64) بیسویں صدی کے مرکزی دھارے کے اکثر اسلامی علماء کے نزدیک جہاد کا اعلان اسی صورت میں کیا جاسکتا ہے جب کوئی غیر مسلم طاقت کسی مسلمان ملک کے خلاف کھلی جارحیت کا ارتکاب کرے اور اس میں بھی اس بات پر زور دیا جاتا تھا کہ اس جارحیت کے خلاف جہاد صرف مقامی آبادی کرے۔ غیر ملکیوں کے لیے اس جنگ میں شرکت کو اجتماعی فرض (فرض کفایہ) کہا جاتا ہے اور ایسا صرف اس وقت ہوسکتا ہے جب پوری برادری اس میں شرکت کرے، افراد نہیں۔ غیر ملکیوں کو جنگ میں شرکت کی اجازت تب دی جاتی ہے جب ان کے والدین، ان کے سرپرست اور سیاسی مقتدرہ اس کی اجازت دے۔ (65) اس میں آخری نکتے سے پتہ چلتا ہے کہ 1980ء سے پہلے کیوں بہت محدود تعداد میں غیر ملکی جنگجوؤں کی حرکت پذیری کے واقعات پیش آتے تھے۔ پان اسلامی یک جہتی کا رواج عزام سے بہت پہلے بھی موجود تھا لیکن نجی طور پر جنگ میں شرکت کو مذہبی قواعد کی رو سے مختلف شرائط سے منسلک کیا جاچکا تھا۔

اس امر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ عبداللہ عزام کا نظریہ القاعدہ کے حالیہ عالمی جہاد کے نظریے سے مختلف تھا جس میں ایک مختلف حل پیش کیا جاتا ہے۔ عبداللہ عزام کے نظریے میں روایتی جنگی اقدامات کو میدان جنگ تک محدود رکھنے کی بات کی جاتی ہے جبکہ اسامہ بن لادن

کے 1998ء کے مشہور نظریے میں ہر مقام پر ہر ہتھکنڈے کی اجازت دی جاتی ہے۔ (66)

ایک اچھا اشارہ جس کی غیر ملکی جنگجوؤں کا نظریہ نمائندگی کرتا تھا وہ 1980ء کی دہائی میں قابل ذکر حد تک نئی چیز تھا جو اس کے تعارف کے موقع پر اٹھنے والا تنازعہ تھا۔ جیسا کہ عزام نے بعد میں خود کہا تھا: ''کچھ لوگ ناراض تھے، کچھ خوش تھے اور کچھ سرزنش کرتے تھے۔ ہمارے بھائی ہم سے حقارت کا مظاہرہ کرتے تھے اور ہمارے منہ پر کہتے تھے کہ ہم نوجوانوں کو ان کے خلاف بغاوت پر اکسا رہے ہیں۔ (67)'' متعدد ممتاز اسلامی سکالرز جیسے سلمان الاودا، سفر الحوالی اور یوسف القراضوی عزام کی طرف سے انفرادی فرض کے تصور سے اتفاق نہیں کرتے تھے اور کہتے تھے کہ غیر افغانوں کو افغانستان میں لڑنے کے لیے کہا جاتے بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کی جائے لیکن انہیں ایسا کرنے پر مجبور نہ کیا جائے۔ (68) اسی طرح 1980 اور 1990 کی دہائی میں بھی انقلابیوں اور غیر ملکی جنگجوؤں کے درمیان نظریاتی اختلاف دیکھنے میں آیا جو اس بات پر تھا کہ آیا کہ مسلمان حکومتوں سے جنگ کی جائے یا غیر ملکی قابضین سے لڑا جائے۔ (69) 1990ء کی دہائی کے اواخر اور 2000ء کے اوائل میں غیر ملکی جنگجوؤں کی القاعدہ کے ساتھ اس بات پر بحث ہوئی کہ آیا کہ امریکہ کے خلاف عالمی دہشت گردی کا آغاز کیا جائے یا چیچنیا اور عراق میں روایتی طریقے سے جنگ کی جائے۔ (70)

عزام کے پیغام کی گونج اس زمانے میں جزوی طور پر سنائی دے رہی تھی کیونکہ سیاست کے تمام اسلامی اظہاریے 1980ء کی دہائی میں ابھرتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ 1967ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد عرب قوم پرستی زوال پذیر تھی جبکہ 1979ء کے ایرانی انقلاب سے پتہ چلا تھا کہ اسلامی انقلاب یوٹوپیا سے بڑھ کر ہے۔ مزید یہ کہ اسلامی نظریاتی مارکیٹ میں غیر ملکی جنگجوؤں کے نظریے کو یہ فائدہ حاصل تھا کہ یہ جہاد کے بارے میں دیگر عسکری اسلامی نظریات کے مقابلے میں اسلام کی قانونی قدامت پرستی کے زیادہ قریب تھا۔ حقیقت میں عبداللہ عزام کا یہ فتویٰ کہ بیرونی جارحیت کے خلاف جہاد ایک انفرادی فرض ہے وہ بیسویں صدی کے قدامت پرست نظریات کے مقابلے میں زمانہ وسطیٰ کے کلاسیکل جہادی تصور سے ملتا تھا جو ایک قومی ریاست کے سوال پر ویٹو پاور کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس طرح عزام کا نظریہ سید قطب کے انقلابی اسلام ازم سے کم متنازعہ تھا کیونکہ عزام جس جدوجہد کے لیے کہتا تھا وہ غیر ملکی جارحیت کے خلاف مسلم علاقے کے دفاع کے بارے میں تھی جو کہ وہی تھی جو جہاد کے قدامت پرست نظریے

میں ہے۔ (71) اس کے برعکس انقلابی اسلام پرست مسلم حکمرانوں کے قتل کی بات کرتے تھے جو کہ نظریاتی طور پر ایک زیادہ مشکلات سے بھرا منصوبہ تھا۔ علاوہ ازیں غیر ملکی جنگجوؤں کی جانب سے جن گوریلا ہتھکنڈوں کی بات کی جاتی تھی اس کی دہشت گردی کے حمایتی دیگر اسلامی گروپوں کے منصوبوں کے مقابلے میں جہاد کے کلاسیکل اسلامی نظریات کے ساتھ آسانی سے مطابقت پیدا کی جاسکتی تھی۔ (72)

پھر آخر عزام کا نظریہ زیادہ لوگوں کو حرکت میں کیوں نہیں لایا؟ اسکی ایک بظاہر وجہ یہ ہے کہ اس کا دیگر نظریات اور شناخت کی دیگر اشکال کے ساتھ بھی موازنہ قائم کرنا پڑتا تھا۔ مقامی، قومی اور علاقائی سیاسی تحفظات آج بھی اکثر عام لوگوں کے لیے، بہت اہم ہوتے ہیں۔ مزید یہ کہ اس مسئلے کہ آیا غیر ملکی اسلامی جنگوں میں شرکت ہر مسلمان کے لیے انفرادی فریضہ ہے یا نہیں، پر عزام کے نظریے کو ایک بہت با اثر مذہبی تصور کے ساتھ بھی مقابلہ درپیش تھا۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا کہ اسلامی علماء کی بڑی اکثریت دوسرے مسلمانوں کی جنگ میں شرکت کو ایک اجتماعی فریضہ سمجھتی ہے جس میں شرکت کرنے والوں کو اپنی حکومت، والدین اور سرپرستوں کی اجازت بھی درکار ہوتی ہے۔ اس نکتہ نظر سے دیکھا جائے تو بغیر اجازت کے جہاد پر جانا گناہ ہے۔ اگرچہ نظریات کے رکاوٹی اختیارات کے حوالے سے شکوک وشبہات میں گرفتار ہونے کی کئی وجوہات ہیں، اس نظریاتی نکتہ کے بھرتی پر بہت سے اثرات مرتب ہوتے ہیں جس کا پاکستان میں لڑائی کے لیے والدین کی اجازت کے حوالے سے حالیہ مطالعے کی صورت میں دستاویزی ریکارڈ موجود ہے۔ (73) اجتماعی فریضے کی بات تحریک پیدا کرنے میں ایک رکاوٹ پیش کرتی ہے اور تحریک پیدا نہ کرنے کے لیے ایک اہم جواز فراہم کرتی ہے۔ اجتماعی فریضے کی بات اس سے بھی غالب ہوجاتی ہے کیونکہ اسے حکومتوں اور مذہبی مقتدرہ کی جانب سے فروغ کیا جاتا ہے جو اپنے حکومتی اور مذہبی اختیارات سے محروم نہیں ہونا چاہتے۔ لہذا عزام کا نظریہ غیر متنازعہ نہیں تاہم یہ بطور غیر ملکی جنگجو حرکت میں آنے والوں کے لیے ایک عقلی جواز پیش کرتا ہے۔

اوپر پیش کیے گئے مواد کی بنیاد پر میں نتیجہ اخذ کرتا ہوں کہ غیر ملکی جنگجوؤں کے حوالے سے ایک منفرد نظریہ موجود ہے جو خاص طور پر صرف 1980ء کی دہائی میں تیار کیا گیا۔ 1980ء کی دہائی کے بعد غیر ملکی جنگجوؤں کے پھیلاؤ کی وجہ ممکنہ طور پر سماجی تحریکوں کا ابھرنا ہے جنہوں نے اولین حرکت انداز اور اس کے بعد مزید حرکت پذیری کے لیے نظریات فراہم کیے۔ تاہم اولین

غیر ملکی جنگجوؤں کی تحریک کا ماخذ

اولین حرکت انداز اوران کی ترجیحات کا ماخذ ایک ایسا سوال ہے جسے خانہ جنگی پر کام کرنے والے سکالرز نے عام طور پر نظرانداز کیا۔ (74) زیادہ تر مطالعات میں اولین حرکت اندازوں کے بجائے ان کے بعد آنے والوں پر فوکس کیا گیا۔ اول، نظریات کے ماخذ پر تحقیق کرنے میں آئیڈیا کی ایک دنیا شامل ہے جس میں قابل مشاہدہ اعداد وشمار کی کمی ہے اور اینڈو جینیاتی تحفظات بہت زیادہ ہیں جس ان دلائل کی تصدیق کرنا بہت مشکل ہوجاتا ہے۔ دوئم، وسیع پیمانے کے تنازعات کی وضاحت کرنے کے لیے بعد میں آنے والوں کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ سوئم، اکثر خانہ جنگیوں میں ایک ہی قسم کے نظریاتی محرکات ابھرتے رہتے ہیں جس سے اولین حرکت اندازوں کے لیے تحریک مقابلتاً غیر دلچسپ ہوجاتی ہے۔ تاہم غیر ملکی جنگجوؤں کے لیے اولین حرکت اندازوں کا کرداراوران کے نظریات اس قدر بڑے ہوتے ہیں کہ انہیں تحقیق کے بغیر نہیں چھوڑا جاسکتا۔ نقصان کا اندازہ لگانے میں مشکلات کی وجہ سے ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ سکالرحضرات بہترین مفروضے پیش کرنے سے خود کوروک دیں۔

اس حصے میں، میں اولین حرکت اندازوں اوران کے تصورات کے ماخذ کے بارے میں وضاحت کروں گا۔ اگرچہ یہ مکمل طور پر نظریاتی نہیں تاہم میری وضاحت میں سماجی تحریکوں اور قوم پرستی کے لٹریچر کے ذریعے مدد لی گئی ہے جو کہ دومرکزی علمی روایات ہیں جو کہ کسی تحریک کی تشکیل کے حوالے سے معلومات فراہم کرتی ہیں۔ میں اپنے مفروضات کو کئی دیگر سماجی تحریکی سکالرز کے ساتھ شریک کرتا ہوں کہ تحریک کے آغاز کے لیے سیاسی مواقع، ڈھانچے کی تنظیم اور ثقافتی خاکوں کے ایک مجموعے کی ضرورت ہوتی ہے۔ (75) تاہم میرا بنیادی مسئلہ آرگنائزنگ سٹرکچر اور ثقافتی خاکوں کے مخصوص ماخذ کے بارے میں ہے جو کہ ایسے موضوعات ہیں جن پر سماجی تحریکوں کے لٹریچر میں تفصیل کے ساتھ کام نہیں کیا گیا۔ (76) اولین حرکت اندازوں کی تحریک اوران کے مخصوص نظریاتی مکالمے کے چناؤ کی وضاحت کرنے کے لیے میں قوم پرستی کے لٹریچر کی طرف توجہ کرتا ہوں۔ (77)

اس امر کو دیکھنا اہم ہے کہ اس حصے کا مقصد صرف افغانستان میں غیر ملکی جنگجوؤں کے وقوع کی وضاحت کرنا نہیں بلکہ اس تحریک کے ابھرنے کو دیکھنا ہے جو اس قدر بڑی ہے کہ جنگ کو

بھی پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔ میں حرکت پذیری کے تمام مراحل کی وضاحت کرنے کا ارادہ بھی نہیں رکھتا۔ میری اصل دلچسپی ابتدائی تشکیل (جو 1985-1979 کے درمیان ہوئی) کے حوالے سے ہے۔ پشاور میں جب غیر ملکیوں کا اجتماع وجود میں آ گیا اور بھرتی کے حوالے سے مکالمہ تیار کر لیا گیا تو اس کے بعد حجازی تحریک کے علاوہ کئی اور اسباب بھی تھے جنھوں نے حرکت پذیری کے نمونے اور حجم کو تشکیل دیا۔

مفروضہ

میرے مفروضے کی بنیاد تین مشاہدات پر ہے۔ اول، میں غیر ملکی جنگجوؤں کے نظریات اور ان سے پہلے کے اسلاف کے نظریات، جیسے قطب ازم اور وہاب ازم کے درمیان عدم تعلق کو دیکھتا ہوں۔ مصری نظریہ ساز سید قطب (66-1906) مسلم ریاستوں کے اندر انقلاب کی حمایت کرتا ہے۔ وہ سوائے فلسطین کے دیگر غیر مسلموں کے ساتھ تنازعے کی شاذ و نادر بات کرتا ہے او ر نہ ہی کسی موقع پر مسلمانوں کو دوسرے مسلمانوں کی آزادی کی جنگ میں شرکت کے لیے کہتا ہے۔(78) اسی طرح محمد ابن عبدالوہاب (92-1703) اور بیسویں صدی میں اس کے پیروکار جو کہ سعودی حکومت کی مذہبی اسٹیبلشمنٹ کا حصہ تھے وہ بھی بین الاقوامی سیاست کے بجائے پہلے مسلمانوں میں نظریاتی اور اخلاقی پاکیزگی کی بات کرتی ہے۔(79) 1950ء تک تو یہ صورت حال تھی کہ وہابی ملا غیر وہابیوں کو مسلمان ہی نہیں سمجھتے تھے، ان کو بھائی سمجھنا تو بہت دور کی بات ہے۔(80) وسیع پیمانے پر پائے جانے والے تاثر کے برعکس سرکاری سعودی ملاؤں نے کبھی بھی 1980ء کی افغان جنگ یا اس کے بعد کے کسی تنازعے میں شرکت کو انفرادی فریضہ قرار نہیں دیا۔
دوئم، میں 1970ء اور 1980ء کے اوائل میں ایسی تحریروں کے مجموعے کو دیکھتا ہوں جن کا مواد غیر ملکی جنگجوؤں کے مکالمے یا مواد سے ملتا ہے۔ اس عرصے کے دوران ایسا لٹریچر بڑے پیمانے پر شائع ہوا جس میں دنیا بھر میں مسلمانوں کی حالت زار کی طرف دوسرے مسلمانوں کی توجہ مرکوز کرائی گئی۔ ان رسائل اور جرائد میں مالی امداد کے لیے بھی اسی طرح درخواست کی گئی جس طرح کہ غیر ملکی جنگجوؤں کے لٹریچر میں جہادیوں کی بھرتی کے لیے کی جاتی تھی۔

سوئم، یہی لوگ جو اس قسم کے رسائل اور جرائد چھاپ رہے تھے، انہوں نے دنیا بھر میں جنگ اور دیگر سانحات سے تباہ ہونے والے مسلمانوں کی بھرپور طریقے سے مدد کی۔ غیر ملکی جنگجوؤں کے بڑی تعداد میں آنے سے بہت پہلے مسلم ورلڈ لیگ کے نمائندوں اور ان سے منسلک

خیراتی اداروں نے 1980ء میں افغانستان پر حملے کے بعد در بدر ہو کر پاکستان آنے والے افغان پناہ گزینوں کی ہر طریقے سے مدد کی۔ اس کے برعکس اس دور میں وہابی مذہبی اسٹیبلشمنٹ سے تعلق رکھنے والے نمائندوں کا 1980ء کی دہائی کے آخر تک افغانستان یا پاکستان میں کوئی نشان نہیں تھا۔ چنانچہ اب میں پان اسلامی تحریک کا ذکر کروں گا جو کہ 1970ء کی دہائی میں معتدل انداز میں ابھر چکی تھی اور 1980ء کی دہائی میں اس نے متشدد آف شوٹ پیدا کر لیے تھے۔(81) میں واقعات کے تسلسل کا سادہ ترین انداز میں مفروضہ پیش کروں گا جس کے نتیجے میں عرب افغان اتحاد اور ان کے نظریے نے جنم لیا۔ ذیل میں واقعات کے اس تسلسل کی وضاحت کروں گا اور اس میکنزم کے بارے میں بتاؤں گا جو اس سلسلے کی ہر کڑی میں موجود ہے۔

پان اسلامی تحریک کا ابھرنا

یہ تصور کے تمام مسلمان ایک ہیں، اتنا ہی پرانا ہے جتنا کے اسلام، اور انیسویں صدی سے سیاسی کارکنوں نے مختلف مقاصد کے لیے امہ کے تصور کی آبیاری کی۔(82) یہاں پر جس پان اسلامی تحریک کو بیان کیا گیا ہے وہ اس سے پہلے کی پان اسلامی تحریک سے مختلف ہے جو کہ بیسویں صدی کے اوائل میں ظاہر ہوئی تھی جس کے ذریعے اسلام پسندوں نے خلافت کو اور سعودی عرب کے شاہ فیصل کے خارجہ پالیسی ڈاکٹرائن کو بحال کرنے کی کوشش کی تھی۔ خلافت کے ذریعے تمام اسلامی ملکوں کی ایک یونین قائم کی جاتی تھی جبکہ شاہ فیصل کی خارجہ پالیسی کا مقصد مسلم حکومتوں کے درمیان کوآرڈی نیشن قائم کرنا تھا۔ 1970ء کی پان اسلامی تحریکوں کا ان میں سے کوئی مقصد نہیں تھا۔ اس کا مقصد دنیا میں مسلمانوں کے مقام کے بارے میں مقبول عام آگاہی پیدا کرنا اور عالمی سطح پر مسلمانوں کے درمیان تعاون کو فروغ دینا تھا۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ شاہ فیصل کی خارجہ پالیسی کا نظریہ اور حجازی پان اسلامی نظریات کا آپس میں اس قدر تعلق کا تھا کہ اول الذکر نے موخر الذکر کی ادارہ جاتی نوعیت کی بنیاد ڈالی تھی۔

یہ تحریک 1960ء کی دہائی کے اواخر میں مذہبی اداروں کے ایک مجموعے کی صورت میں ابھری تھی جس کی بنیاد سعودی عرب کے مغربی حجازی خطے میں تھی۔ یہ ادارے 1960ء کی دہائی میں مختلف وجوہات کے باعث قائم ہوئے تھے۔ مسلم ورلڈ لیگ کا قیام 1962ء میں مکہ مکرمہ میں عمل میں آیا تھا اور اس کے پیچھے خلافت تحریک کی باقیات تھیں۔(83) 1969ء میں شاہ فیصل کی ناصری مخالف سفارتی کوششوں کے نتیجے میں تنظیم اسلامی کانفرنس کی بنیاد ڈالی گئی جس کا صدر دفتر

جدہ میں تھا۔ (84) اسی اثناء میں سعودی عرب میں تیزی سے وسعت اختیار کرتے تعلیمی شعبے کی کوششوں سے خطے میں بڑی یونیورسٹیاں قائم کی گئیں جس میں انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی مدینہ قابل ذکر ہے جو 1961ء میں قائم کی گئی۔ 1967ء میں جدہ میں شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا اور پھر مکہ میں کالج آف شریعت قائم کیا گیا جو میں بعدازاں ام القرا یونیورسٹی بن گیا۔ 1970ء تک مکہ مدینہ اور جدہ پر مشتمل تکون اسلامی مذہبی اداروں کا دنیا میں سب سے بڑا گڑھ بن گئی۔ ان کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ ان کے لیے سعودی عرب میں افرادی قوت کم پڑ گئی۔

سعودی عرب کی خوش قسمتی سے حجازی مذہبی شعبے کی توسیع کے کچھ عرصے بعد ہی عرب ملکوں میں اخوان المسلمون کو کچل دیا گیا جس کے نتیجے میں ہزاروں کی تعداد میں اسلام پسندوں کو سعودی عرب میں پناہ مل گئی۔ (85) مہاجرین کی پہلی لہر اواخر 1950ء کی دہائی اور اوائل 1960ء کی دہائی میں دیکھنے میں آئی جس کے بعد مصر، عراق اور شام میں اخوان المسلمون کے کارکنوں کے خلاف کریک ڈاؤن ہونے لگا۔ 1960ء کی دہائی تک مہاجرین کی آمد جاری رہی حتیٰ کہ 1970ء کی دہائی میں مصری مہاجرین کی دوسری بڑی لہر سعودی عرب میں پہنچی حالانکہ مصر کے نئے صدر انور السادات نے اسلام پسندوں کو جیل سے رہا کرنا شروع کر دیا تھا۔ مصر کے ان تعلیم یافتہ مہاجرین نے سعودی عرب میں سکولوں اور یونیورسٹیوں میں ملازمت اختیار کی اور سعودی عرب میں شعبہ تعلیم کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت اختیار کر لی۔ اخوان المسلمون کے جلاوطن لوگ شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی جدہ اور مکہ کے اہم عہدوں پر متمکن ہو گئے جبکہ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی مدینہ میں بھی ان کی قابل ذکر تعداد اہم عہدوں پر تھی۔ (86) دیگر بین الاقوامی اسلامی اداروں میں بھی ان کی کثیر تعداد تھی۔ حجاز کا خطہ سالانہ حج اور بحری تجارت کے نتیجے میں پہلے ہی ایک کاسموپولیٹن شہر بن چکا تھا جس کی وجہ سے یہ علاقہ عالمی اسلام پسندوں کے ابلتے ہوئے برتن کی شکل اختیار کر گیا۔

اعلیٰ تعلیم یافتہ ان جلاوطن کارکنوں کے لیے سعودی عرب کی مقامی سیاست میں اثر و رسوخ پیدا کرنے کے امکانات بہت محدود تھے۔ ان جلاوطن لوگوں کو ان کے اپنے ملک میں بھی خوش آمدید نہیں کہا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ وہ سعودی باشندے جو بین الاقوامی اسلامی اداروں اور حجاز کی یونیورسٹیوں میں کام کرتے تھے وہ بھی کسی حد تک ایک ایسے نظام کے حق میں نہیں تھے جس کے

MashalBooks.org

نتیجے میں اہم فیصلوں کے اختیارات سعودی شاہی خاندان کے ہاتھ سے نکل جائیں جہاں پر اعلیٰ ترین مذہبی اختیارات وہابی اشرافیہ کے ہاتھ میں تھے جس کا مرکز نجد کا خطہ تھا۔ چنانچہ حجاز سے تعلق رکھنے والے اسلام پسند ایک مارجنلا ئزڈ قسم کی اشرافیہ کا درجہ رکھتے تھے۔ تاہم انہیں بین الاقوامی سطح پر کام کرنے کے موقع حاصل تھا۔ عالمی اسلامی ادارے نظریات اور افراد کی برآمد کے لیے انہیں پلیٹ فارم مہیا کرتے تھے جبکہ سعودی حکومت کی جانب سے ملنے والی چھوٹ کی وجہ سے وہ بیرون ملک سے آنے والے افراد کو بھی خوش آمدید کہہ سکتے تھے۔

اس قسم کے دوہرے مواقع کے نتیجے میں پان اسلامی سماجی تحریک سامنے آئی جو دو قسم کے ادارہ جاتی اجزاء پر مشتمل تھی۔ عالمی اسلامی ادارے اور مسلم ورلڈ لیگ اور اس کے لاتعداد ذیلی ادارے ان میں سب سے اہم اور ادارہ جاتی حیثیت رکھتے تھے۔ مسلم ورلڈ لیگ کا بنیادی نصب العین عالمی سطح پر مسلم یک جہتی کا فروغ تھا اور اس مقصد کے حصول کے لئے بہت بڑی رقم بھی مختص کی گئی، خاص طور پر 1973 کے تیل کے بحران کے بعد۔ (87) دوسرا سٹرکچر اخوان المسلمون کا نام نہاد انٹرنیشنل آرگنائزیشن (التنظیم الدوتی) کے نام سے قائم کیا گیا ادارہ تھا جس کی شکل صورت 1970ء کے اواخر میں حجاز میں واضح ہوئی تھی اور 1982ء میں اس کا باقاعدہ قیام عمل میں آیا تھا۔ (88) اور اس کا مقصد اخوان المسلمون کی مختلف شاخوں کے درمیان تعلق قائم کرنا اور اس کے عالمی اثر ورسوخ میں اضافہ کرنا تھا۔

رین ہارڈ شلز کے علاوہ چند ہی سکالرز نے حجازی پان اسلامی گروہوں پر توجہ دی اور اس سے بھی کم سکالرز نے اسے سعودی حکومت یا وہابی مذہبی اسٹیبلشمنٹ سے جدا کر کے دیکھا۔ (89)

عملی طور پر ہم جو بھی مواد پڑھتے ہیں اس میں افغان جہاد کے لیے ایک ہی اصطلاح ''سعودی امداد'' استعمال کی گئی جیسے افغانستان میں جہاد کے لیے جتنا پیسہ اور لوگ بھیجے جاتے تھے وہ سعودی حکومت یا وہابی انتظامیہ کی طرف سے بھیجے جاتے تھے اور اس غلط فہمی کی وجہ شاید یہ ہوسکتی ہے کہ 2002ء تک غیر ملکی سماجی سائنسدانوں کو سعودی عرب تک رسائی حاصل نہیں تھی۔ اس کے بعد فیلڈ ریسرچ سے پتہ چلا کہ سعودی عرب کا مذہبی سیکٹر قابل ذکر حد تک اس سے زیادہ ڈی سنٹرلائزڈ اور حکومتی بیوروکریسی اس سے زیادہ منقسم ہے جتنا پہلے سمجھا جاتا تھا۔ (90) اگرچہ عالمی اسلامی ادارے سعودی عرب میں تھے اور انہیں سعودی عرب سے ہی فنڈ ملتے تھے لیکن وہ بڑی حد تک خود مختار تھے تاوقتیکہ ان کی کارگذاری بین الاقوامی رہے۔ درمیانی اور نچلی سطح کے ملازمین کے لیے تو

یہ بات بہت حد تک سچ ہے لیکن کم از کم بیرون ملک میں نہیں۔اوائل 1980ء کی دہائی کے پشاور میں مسلم ورلڈ لیگ کے بارے میں لکھے گئے مواد کے مطابق افغانستان کے ماہر جائلز ڈورونسورو کہتے ہیں کہ اہم ترین ڈونرز میں شامل سعودی عرب اپنی طرف سے فراہم کردہ فنڈز کے استعمال کو قریبی طور پر کنٹرول نہیں کرتا اور مقامی ملازمین کو عام طور پر اخوان المسلمون کے کارکنوں کے طور پر شناخت کیا جاتا ہے۔مزید براں،سعودی ریڈ کراس کی فنڈنگ براہ راست سعودی حکومت کی جانب سے ہوتی ہے لیکن یہاں بھی کارکنوں کے رجحانات اخوان المسلمون سے تعلق رکھتے ہیں۔(91)

حجازی کارکن عالمی اسلامی معاملات کے حوالے سے آگاہی بڑھانے میں بے حد دلچسپی رکھتے ہیں۔عوام اور مقتدر اشرافیہ کی جانب سے پان اسلامی معاملات کی اہمیت کو جتنا بڑھا چڑھا کر بیان کیا جائے گا، عالمی اسلامی اداروں کے لیے بجٹ اور سیاسی کردار میں اتنا ہی اضافہ ہوگا۔اس کے علاوہ اخوان المسلمون کے کارکن پان اسلامی لہر کے ذریعے کچھ ممالک میں سیاسی مفادات حاصل کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں کیونکہ موجود حکومتوں کی پالیسیاں سیاسی حالات کی وجہ سے محدود ہوتی ہیں۔تاہم کم از کم مصر میں یہ معاملہ نہیں تھا جہاں سادات کی حکومت نے 1978ء میں اسرائیل کے ساتھ ایک غیر مقبول امن معاہدہ شروع کیا تھا۔

مسلمانوں کے عالمی معاملات کے حوالے سے آگاہی پیدا کرنے کے لیے یہ کارکن پان اسلامی شناخت پر مبنی ایک مکالمہ کھڑا کرتے ہیں جس میں مسلم یکجہتی پر زور دیا جاتا ہے اور بیرونی خطرات کو اجاگر کیا جاتا ہے۔(92) شناخت یا تشخص کے حوالے سے دیگر مکالموں کی طرح یہ بھی اس قسم کے ہوتے ہیں جس میں کسی خطرے کے حوالے سے گھنٹی بجائی جاتی ہے خود کو مظلوم بنا کر پیش کیا جاتا ہے اور اپنے خلاف سازشوں اور خطرات کی بات کی جاتی ہے۔اس میں خود کو مظلوم بتاتے ہوئے دنیا بھر میں مسلمانوں کی حالت زار کا رونا رویا جاتا ہے اور ایسی چیزوں کی طرف توجہ دی جاتی ہے جسے سیموئیل ہنٹنگٹن ''فالٹ لائن کونفلکٹس'' قرار دیتا ہے۔(93) پان اسلامی نظریات اور اسلام کو درپیش خطرات کی باتیں کرنے والے اکثر لوگوں کی تقریروں میں سابق پان اسلامی تحریکوں اور سامراج کے خلاف جدوجہد کے حوالے ہوتے ہیں تاہم حجازی پان اسلامک مکالمہ اور شور زیادہ الارمسٹ اور زیادہ عالمی ہوتا ہے۔مسلم ورلڈ لیگ کے سیکریٹری محمد علی حراکن کی 1980ء کی ایک تقریر کے اقتباس سے اس کی عکاسی ہوتی ہے:

''جہاد مسلمانوں کی کامیابی کی کنجی ہے۔خاص طور پر ایک ایسے وقت میں جب فلسطین میں ان کا مقدس ترین قبلہ اول یہودیوں کے قبضے میں ہے۔جب لاکھوں مسلمان پوری دنیا میں ظلم وتشدد اور جبر کا شکار ہیں۔انہیں برما، فلپائن، پٹانی، روس، کمبوڈیا، ویت نام، قبرص، افغانستان اور دیگر مقامات پر ناانصافی ظلم اور تشدد کا نشانہ بنایا جارہا ہے حتیٰ کہ انہیں موت اور نسل کشی کا سامنا ہے۔ ہماری ذمہ داری اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہودیوں، کمیونسٹوں، فری میسنوں، قادیانیوں، بہائیوں اور عیسائیوں کی جانب سے اسلام اور مسلمان کے خلاف مذموم مہم چلائی جارہی ہے۔''(94)

اس قسم کے پیغامات کو وسیع پیمانے پر پروپیگنڈے کے ذریعے پھیلایا جاتا ہے اور رسائل وجرائد میں شائع کر کے دنیا بھر میں بھیجا جاتا ہے۔ان میں اہم ترین رسائل میں مسلم ورلڈ لیگ کا ہفت روزہ نیوز آف دی مسلم ورلڈ اور ماہنامہ جرنل آف دی مسلم ورلڈ لیگ شامل ہیں جو عربی اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔اس کے علاوہ دیگر عالمی اسلامی اداروں کے اپنے اپنے رسالے ہیں۔بجٹ میں اضافے اور نئی ٹیکنالوجی کے آنے کے بعد ان رسائل وجرائد کا معیار اور ڈسٹری بیوشن بہت بہتر ہو چکی ہیں۔1980ء کی دہائی میں ایسے رسائل مہنگے کاغذ پر شائع کیے جارہے تھے جن کے صفحات پر زخمی مسلمان عورتوں اور بچوں کی کلوز اپ میں تصویریں شائع ہوتی تھیں کیونکہ اس طرح ان کا تاثر بڑھ جاتا ہے۔ ہر میگزین میں عطیات اور خیرات کی اپیل کی جاتی تا کہ مسلمانوں کی مدد کی جاسکے۔1970ء کی دہائی میں اخوان المسلمون نے اپنا رسالہ المجتمع کے نام سے نکال لیا تھا جو 1969ء کویت سے شائع ہوتا تھا جبکہ الدعویٰ نامی رسالہ 1976ء سے مصر میں چھپتا تھا۔ فالٹ لائن جنگیں اور مسلم یکجہتی کی اپیلوں کو اس دور کے رسالوں میں بڑے پیمانے پر شائع کیا جاتا تھا تاہم عالمی اسلامی اداروں کے برعکس ان اشاعتوں بالخصوص المجتمع جیسے کم سنسر والے رسائل میں مسلمانوں کی اندرونی سیاست کو بھی جگہ دی جاتی تھی۔

حکومتوں کی جانب سے اس قسم کے پان اسلامی پروپیگنڈے کو برداشت کیا جاتا تھا کیونکہ ان میں مسلم حکومتوں کے بجائے صرف غیر اسلامی طاقتوں کو دشمن بنا کر پیش کیا جاتا تھا۔مسلم سیاست دانوں کے لیے مقبول عام پان اسلامی پروپیگنڈے کی مخالفت میں فائدہ کم اور نقصان زیادہ تھا۔اس کے بجائے اگر وہ اس کی حمایت کرتے تو اس سے ملک کے اندرونی مسائل

سے لوگوں کی توجہ ہٹانے میں کامیابی ملتی تھی۔ اس کا نتیجہ ہے کہ مختلف حکومتیں بالخصوص سعودی عرب کی حکومت پان اسلامی اداروں کے ساتھ مسلم قوموں کی فلاح و بہبود کے بہانے کھیل میں مصروف رہتی تھی۔ (95)

اس بات کو تسلیم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ 1970 اور 1980ء میں ہونے والی بین الاقوامی سیاسی پیش رفتوں نے پان اسلامی پیغام کو ساکھ بخشی اور یوں اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ اس عرصے کے دوران لبنان اور افغانستان کے واقعات پیش آئے جس کے دوران مسلمانوں کی اموات کو معروضی طور پر مسلمانوں کی تکلیف سمجھا گیا۔ اسی عرصے کے دوران عربوں اور اسرائیل کے درمیان کشیدگی میں اضافہ ہوا جب 1978 اور 1982ء میں اسرائیل کی جانب سے لبنان پر حملے کیے گئے۔ اگرچہ اس بارے میں پختہ اشاریے ملنا بہت مشکل ہے تاہم اس امر کو کافی حد مانا جا سکتا ہے کہ اس عرصے کے دوران اوپر بیان کیے گئے پروپیگنڈے کی وجہ سے عرب اور دیگر مسلم دنیا میں پان اسلامی جذبات کو بڑھانے میں بہت مدد ملی۔ مثال کے طور پر صرف سعودی عرب میں غیر ملکی مسلمانوں کی امداد میں ڈرامائی طور اضافہ دیکھنے میں آیا جو اکثر اوقات جی ڈی پی سے بھی بڑھ گیا۔ (96)

پان اسلام ازم کے علم برداروں نے دنیا بھر میں مسلمانوں کی امداد کے ذریعے بھی پان اسلامی یک جہتی قائم کرنے کی کوشش کی۔ 1970 اور 1980ء کے عشروں کے دوران اسلامی خیراتی اداروں کے نیٹ ورک میں اضافہ ہوا جن میں سے زیادہ تر کو عالمی اسلامی اداروں کی جانب سے چلایا گیا۔ (97) خاصی حد تک غیر مذہبی مغربی خیراتی اداروں کی طرح یہ اسلامی ادارے دنیا بھر میں مسلمانوں پر نظر رکھتے اور جہاں بھی ان کو مدد چاہیے ہوتی فوری طور پر ان کی مدد کے لیے تیا رہوتے۔ اسی قسم کا بحران جس میں مسلمانوں کی مدد کی فوری ضرورت پیش آئی وہ 1978ء میں افغانستان میں کمیونسٹ بغاوت اور اس کے بعد 1979ء میں سوویت یونین کی طرف سے افغانستان پر حملہ تھا۔

پہلی عرب افغان حرکت پذیری

1980ء میں افغانستان میں عربوں کے ملوث ہونے کے حوالے سے جو مقبول عام بیان دیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ سوویت یونین کی کھلی جارحیت کے نتیجے میں پوری دنیا میں امت مسلمہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ (98) تاہم تاریخی شواہد کچھ اور کہانی سناتے ہیں۔ غیر ملکی جنگجوؤں کی

حرکت پذیری 1980ء کی دہائی کے دوسرے نصف میں دیکھنے میں آئی جبکہ پہلے نصف میں بہت تھوڑی تعداد میں عرب لڑنے کے لیے افغانستان آئے۔ (99)

اولین عرب افغان جنگجو نہیں بلکہ انسانی بنیادوں پر کام کرنے والے کارکن تھے جنہیں حجاز سے تعلق رکھنے والے خیراتی اداروں کی جانب سے بھیجا گیا تھا۔ 1980 سے 1984 کے درمیان افغان مہاجرین کی مدد کے لیے چند سو عرب لوگ پشاور پہنچے۔ مسلم ورلڈ لیگ کے کچھ وفود اور انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی مدینہ کے کچھ گروپ بھی صورتحال میں مدد دینے کے آئے۔ (100) دیگر کچھ ملکوں کے ادارے بھی اس عمل میں شریک تھے تاہم پہلے چار سال کے د وران آنے والے کارکنوں میں سے اکثریت کا تعلق حجاز کی پان اسلامی برادری سے تھا۔ (101) اس طرح 1987ء سے پہلے جتنے سعودی جنگجو افغانستان گئے ان میں سے اکثریت کو حجازیوں کی طرف سے بھیجا گیا۔ (102)

بنیادی طور پر غیر ملکی جنگجوؤں کی حرکت پذیری کے اولین محرک ہرصورت میں پہلے بیان کیے گئے عبداللہ عزام سے تعلق رکھتے تھے۔ (103) فلسطینی مبلغین جو 1981ء میں پاکستان آئے وہ اولین عرب نہیں تھے جنہوں نے افغان جہاد کے فوجی پہلو میں شرکت کی تھی تاہم اس عمل کے ابتدائی عرصے کے سب سے موثر ترین انٹر پرینیور کی حیثیت رکھتے تھے۔ (104) اسلامی برادری میں عبداللہ عزام کو عرب افغان حرکت پذیریوں کا روحانی باپ قرار دیا جاتا ہے اور اس وقت کی تاریخی شہادتوں سے اس کو بھرپور حمایت ملتی تھی۔ وہ 1981ء میں پاکستان آیا اور اس کے بعد 1982ء کے بعد سے بھرتی کی ترغیب کے لیے لٹریچر شائع کرتا رہا اور اس کے بعد افغانوں کے معاملے کو عربوں میں زیر بحث لایا اور 1984ء میں اس نے پشاور میں غیر ملکی جنگجوؤں کے لیے لاجسٹک آفس قائم کیے جن کا نام سروسز بیورو تھا۔ اس قسم کے اقدامات کو اہمیت اس لیے ملتی ہے کہ اس بات کے شواہد ملتے ہیں کہ 1986ء سے پہلے جتنے بھی غیر ملکی جنگجو افغانستان آئے ان میں زیادہ تر عزام کی تحریروں سے متاثر تھے جبکہ طبعی مدد انہیں سروسز بیورو کی طرف سے حاصل ہوئی۔ (105)

اگرچہ غیر ملکی جنگجوؤں کی حرکت پذیری کے لیے کچھ دیگر گروپوں کی جانب سے بھی کوشش کی گئی لیکن طویل فاصلے کی حرکت پذیری کے سلسلے میں جو کامیابی عزام کے نیٹ ورک کے ذریعے ملی وہ 1985 سے پہلے اور کسی کے حصے میں نہیں آئی۔ (106) عزام کے اثر ورسوخ میں دو

اسباب کی وجہ سے اضافہ ہوا۔اول یہ کہ وہ ایک مذہبی عالم تھااور دوئم یہ کہ اسکے پان اسلامی برادری سے تعلقات تھے۔اس کے پہلے مقام کی وجہ سے اس کی تحریروں کی اہمیت بڑھ گئی جبکہ دوسرے مقام کی وجہ سے وسائل اور بھرتی کے سلسلے میں اس کی اہمیت میں اضافہ ہوتا تھا۔

عزام کی افغان کاز میں اپنی شراکت سے ابتدائی حرکت پذیری میں اخوان المسلمون اور مسلم ورلڈ لیگ کے کردار کی عکاسی ہوتی تھی۔عبداللہ عزام کا تعلق فلسطین کے مغربی کنارے کے علاقے سے تھا جو 1967ء کی جنگ کے دوران فرار ہوکر اردن چلا گیا تھا۔اگرچہ عزام نے 1970ء کے عشرے کا زیادہ تر حصہ عمان میں گذارا لیکن اس کے پان اسلامی کارکنوں کے ساتھ گہرے تعلقات تھے۔اس نے 1968ء میں سعودی عرب میں استاد کے طور پر بھی مختصر وقت گذارا۔ 72-1970ء میں قاہرہ میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران اس نے مصری اخوان المسلمون کے ساتھ گہرے روابط قائم کر لیے۔[107] اور 1970ء کے عشرے کے اواخر میں عالمی اخوان المسلمون کے اجلاسوں میں بھی شرکت کرتا رہا۔ 1981 کے اوائل میں اسے اردن یونیورسٹی سے مستعفی ہونے پر مجبور کردیا گیا اور اس کی سیاسی فعالیت پر اسے اردن سے بھی نکلنے کے لیے کہا گیا۔وہ سعودی عرب ہجرت کر گیا جہاں اخوان المسلمون کے ساتھ اس کے تعلقات کے نتیجے میں اسے شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی جدہ میں ملازمت مل گئی۔عزام کے بقول پاکستان جانے کے لیے اسے تحریک مصری اخوان المسلمون کے سینئر رہنما کمال السنانری کے ساتھ 1981ء میں مکہ میں ہونے والی ملاقات کے بعد ملی جو اخوان المسلمون کے زیر اہتمام پاکستان کے ایک دورے سے حالیہ دنوں میں واپس لوٹا تھا۔[108] السنانری چند ماہ بعد پاکستان میں منتقل ہونے کا ارادہ رکھتا تھا اور اس نے عزام جس سے اس کی اخوان المسلمون کے اجلاسوں میں ملاقات ہوتی رہی تھی، کو قائل کیا کہ وہ بھی پاکستان چلے۔السنانری پاکستان نہ جاسکا کیونکہ مصری پولیس کی جانب سے اسے اس وقت گرفتار اور ہلاک کردیا گیا جب وہ قاہرہ میں اپنے خاندان کو لینے جارہا تھا۔[109] عزام نے اب پاکستان جانے کا پکا ارادہ کرلیا جہاں اسے نو قیام شدہ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں ملازمت مل گئی جس کی غیر ملکی فیکلٹی کو براہ راست مسلم ورلڈ لیگ کی جانب سے تنخواہیں دی جاتی تھیں۔[110] چنانچہ 1981ء میں اس کی اسلام آباد آمد سے لے کر 1986ء میں اس کی مستقل پشاور منتقلی تک اسے مسلم ورلڈ لیگ کی جانب سے تنخواہ ادا کی جاتی رہی۔

MashalBooks.org

تاہم یہ بات ابھی تک غیر واضح ہے کہ اسے کس چیز نے قائل کیا کہ وہ افغانستان کی مالی امداد کے بجائے غیر ملکی جنگجوؤں کے جہاد میں شریک ہونے کا مطالبہ کرے۔ شاید وہ یہ یقین رکھتا تھا کہ جہاد کے حوالے سے بیسویں صدی کا اسلامی قانون یا نظریہ غلط تھا جو کہ قومی ریاستوں کو یہ اختیار دیتا تھا کہ وہ اپنے شہریوں کو غیر ملکی جنگ میں شرکت کرنے کی اجازت دیں یا نہ دیں۔ دوسری جانب جہاد کے حوالے سے کلاسیکی روایات میں قومی ریاستوں کا کوئی ذکر نہیں۔ مزید براں یہ کہ ایک غیر ریاستی باشندے کے طور جو دو مرتبہ دربدر ہوا اور جو خود ایک مقبوضہ ملک کا باشندہ تھا جسے اس کے ہمسایہ ممالک آزاد کرانے میں ناکام رہے تھے اس کے پاس قومی ریاست پر اعتماد کے لیے جواز بہت کم تھے۔ اس کے علاوہ غیر ملکی جنگجوؤں کے حوالے سے اس کے اور بھی کئی مقاصد تھے مثال کے طور پر غیر ملکی جنگجوؤں کی سمندر پار لڑائیوں کی حوصلہ افزائی کرنا تا کہ آئندہ کسی بھی مقبوضہ اسلامی ملک کی مدد کی راہ کھل سکے جیسے کہ خود اس کا وطن فلسطین تھا۔ عزام نے 1969ء میں اردن اسرائیل بارڈر پر فلسطینی فدائیوں کے درمیان ایک سال گذارا اور وہ اسرائیل کے خلاف مسلح جدوجہد کے لیے بہت پرعزم تھا۔ (111) حقیقت میں وہ فلسطین کو افغانستان سے زیادہ اہم میدان جنگ تصور کرتا تھا۔ (112)

1980ء کی دہائی میں عزام کی جانب سے مجاہدین کی بھرتی پیغام اس لیے بھی گونجتا ہوا سنائی دے رہا تھا کیونکہ اس سے سافٹ پان اسلام ازم کا مکالمہ بھی جنم لے رہا تھا جس سے کہ لوگو ں کی بڑی تعداد کو عشروں سے واسطہ پڑ رہا تھا۔ جب کوئی یہ سمجھتا تھا کہ مسلمان خطرے میں ہیں اور ان کی مدد کی جانی چاہیے تو اس میں سب سے پہلے ان کی فوجی مدد کی طرف ہی خیال جاتا تھا۔ اور یہ ایک ایسا کام تھا جو مسلم ممالک افغانی مجاہدوں کو اربوں ڈالر کے ہتھیاروں کی فراہمی کی صورت میں کر رہے تھے۔

عزام اور حجازی پان اسلامسٹوں کی اہمیت کا جائزہ لینے کے لیے ایک فرضی منظر نامے کے بارے میں غور کیا جائے جس میں وہ غیر موجود ہوں۔ (113) افغانستان کی ریاستی حمایت اتنی ہی رہی ہوگی لیکن غیر ملکی جنگجوؤں کی حمایت بہت کم ہوگی اور غیر ملکی جنگجوؤں کا نظریہ بہت کم بااثر ہوگا۔ مصری اور شامی انقلابی محفوظ جنت کی تلاش میں آتے ہوں گے لیکن ان کی ریاستیں انہیں سفر سے روکنے کے علاوہ ان کی طرف سے بین الاقوامی خیراتی رقوم اکٹھا کروانے سے بھی روک با دیتی ہوں گی جیسا کہ عزام کرتا تھا۔ کوئی عظام جیسا نظریہ بھی تیار کر لیتا ہے تاہم یہ کوئی عام شخص

ہوتا ہے جسے محدود مذہبی اختیار حاصل ہوتا ہے (عزام واحد عرب ملاّ تھا جو فعال طریقے سے افغانستان کے جہادیوں کی بھرتی کر رہا تھا۔) قصہ مختصر غیر ملکی جنگجوؤں کی کمیونٹی بنیادی طور پر حرکت پذیری سے پہلے کے انقلابیوں اور چند مہم جوئی کے شوقین افراد پر مشتمل ہوتی۔ غیر ملکی جنگجوؤں میں سے بہت کم جنگ کے بعد زندہ بچتے لیکن زیادہ امکان یہ ہوگا کہ ان کی تحریک اس قدر وسیع نہیں ہوتی جتنی کہ آج ہے۔

غیر ملکی جنگجوؤں کی تحریک کا ابھرنا کیسے ناگزیر تھا؟ ایک جانب تو غیر ملکی جنگجوؤں کا نظریہ پان اسلام ازم کی فطری توسیع تھا جس کے ابھرنے کی مختلف وجوہات کے ایک بڑے مجموعے پر تھی جن میں سے کئی سٹرکچرل تھے۔ پان اسلام ازم کے پھیلاؤ کو حقیقی طور پر جس بیرونی واقعے نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ 1973ء کا تیل کا بحران تھا جس کے نتیجے میں حجازی عالمی اسلامی اداروں کو مالی وسائل پر وسیع پیمانے پر رسائی حاصل ہوئی۔ دوسری جانب دیکھا جائے تو افغانستان پر سوویت حملے کے بغیر اور عبداللہ عزام کی غیر موجودگی کی صورت میں غیر ملکی جنگجوؤں کی تحریک وہ شکل شاید نہ اختیار کرتی جو اس نے کی۔ قصہ مختصر یہ کہ غیر ملکی جنگجوؤں کے فنامنا کے ابھرنے پر تو بہت زیادہ زور دیا گیا لیکن اس کی سطح پر نہیں۔

حاصل مطالعہ

یہ مضمون بین الاقوامی جہاد کے نظریے کے بارے میں ایک رسمی داستان کو دہراتا ہے۔ ماضی کے مطالعات میں جہاد کے حوالے سے سید قطب، وہابی ازم اور افغان جہاد کے لیے ریاستی معاونت پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے تاہم اس سلسلے میں وضاحتیں جیسا کہ میں آپ کو دکھا چکا ہوں، ناکافی ہیں۔ اسکے بجائے میں غیر ملکی جنگجوؤں کی کی صورت حال کے حوالے سے اس کے ماخذ کا سراغ پان اسلامی تشخص کی تحریک تک لے جاتا ہوں جو 1970ء کی دہائی میں ایک تدریجی عمل کے ذریعے حجاز کے علاقے میں ابھری۔

میرے نتائج بلاشبہ بین الاقوامی اسلامی عسکریت پسندی کے بارے میں سکالر کی جو سمجھ بوجھ ہے اس کو متاثر کرتی ہے۔ یہ ہمیں قابل ذکر حد تک اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ ہم جہاد کو ایندھن فراہم کرنے کے حوالے سے مذہب اور سیاست کی اہمیت کی بحث سے اوپر جا کر سوچیں جو کہ ایک ایسی بحث ہے جو ان لوگوں کی مخالفت کرتی ہے جو القاعدہ کو ایک ایسی تنظیم سمجھتے ہیں جو تشدد کا فرقہ بن چکی ہے اور جو اس کو اسلامی دنیا کے بارے میں مغرب کی پالیسیوں کے ردعمل کے

طور پر دیکھتے ہیں۔ بین الاقوامی اسلامی عسکریت کے پیچھے بلاشبہ ایک نظریہ ہے لیکن اس وقت ہم جس نظریے کی بات کر رہے ہیں یعنی انتہا پسند پان اسلام ازم وہ ایک مذہبی خیالی تعمیرات سے زیادہ قوم پرستی سے زیادہ تعلق رکھتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ 1990 سے 2000ء کی دہائی کے دوران مغرب کی پالیسیوں نے بین الاقوامی عسکریت کو ایندھن فراہم کیا لیکن اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ان پالیسیوں کے حوالے سے بہت شدید نوعیت کی حساسیت پہلے ہی موجود تھی۔ اس کے علاوہ غیر مغربی اور غیر مسلم ممالک کے افعال جیسے روس کی افغانستان اور چیچنیا کے خلاف جارحیت، اسرائیل کا فلسطین پر حملہ اور سربیا کی بوسنیا پر جارحیت وغیرہ، بھی پان اسلامی مظلومیت کے بیانیے کو اتنی ہی طاقت دے چکے ہیں جتنی کہ امریکی خارجہ پالیسی دیتی ہے۔

غیر ملکی جنگجوؤں اور بین الاقوامی دہشت گردوں کے درمیان جو فرق ہے وہ سکالروں کو اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ وہ یہ دکھائیں کہ اگرچہ غیر ملکی جنگجو اور القاعدہ ایک ہی پان اسلامی تحریک سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان کی سیاسی ترجیحات بالکل ایک جیسی نہیں ہیں۔ اہم ترین بات یہ ہے کہ یہ دونوں حلقے وسائل کے حصول کے لیے ایک دوسرے سے مسابقت کرتے ہیں۔ (114) یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ غیر ملکی جنگجوؤں کو مسلم دنیا میں مسلسل بہت اونچے درجے کی عوامی مقبولیت حاصل رہی ہے اور ان کے لیے فنڈ جمع کرنا اور بھرتی کرنا القاعدہ سے زیادہ آسان ہے۔ (115) ان دونوں کے درمیان افراد کے تعلق اور تحریک کی موجودگی سے تجزیاتی فرق کی قدر میں کمی نہیں ہوتی اور اگر کوئی ہے تو اس سلسلے میں دونوں کے درمیان تعلق کی صورت کے بارے میں مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

ان نتائج سے کم سے کم دو اہم پالیسی مضمرات سامنے آتے ہیں۔ اول یہ کہ جو لوگ غیر ملکی جنگجوؤں کی بھرتی کو روکنا چاہتے ہیں ان کو یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ بھرتی کے پیغامات کا انحصار نہ صرف پیچیدہ الہیاتی دلائل پر ہوتا ہے بلکہ سادہ طریقے سے اس بات پر بھی ہوتا ہے کہ لوگوں میں یک جہتی کے احساس کے لیے ایک اپیل پیدا کی جائے۔ چنانچہ مغربی حکومتوں کو شدید نوعیت کے سلفی نظریوں کے پھیلاؤ سے کم فکرمند ہونا چاہیے، بمقابلہ اس مقبول عام مغرب مخالف رپورٹنگ کے جو کہ الجزیرہ جیسے ٹی وی چینل کرتے ہیں اور اس پروپیگنڈے کے پھیلاؤ سے جو انٹرنیٹ پر بڑھ رہا ہے۔ مزید براں غیر ملکی جنگجوؤں کی بھرتی پر قابو پانے کے لیے ایک طویل المیعاد پالیسی میں وہ حکمت عملیاں بھی شامل ہونی چاہئیں جس سے پان اسلام ازم کو کمزور کیا جا

MashalBooks.org

سکے جیسے کہ اس بارے میں آگاہی پیدا کی جائے کہ پان اسلام ازم کے علم بردار جس قسم کا پروپیگنڈا کرتے ہیں اس میں حقائق کس قدر غلط ہوتے ہیں اور یہ کہ ریاستی قوم پرستی اور شناخت کی دیگر مقامی صورتوں کو فروغ دیا جائے۔ دوئم یہ کہ مغربی پالیسی سازوں کو اس بارے میں اچھے طریقے سے مشاورت دی جانی چاہیے کہ وہ اس حقیقت کے بارے میں اپنی عوامی سفارت کاری میں شامل کریں کہ مسلمانوں کی اکثریت غیر ملکی جنگجوؤں اور بین الاقوامی دہشت گردوں کو مختلف انداز سے دیکھتی ہے۔ مغرب میں ان دونوں کو آپس میں ملانے کا رجحان گیارہ ستمبر کے حملوں کے بعد مغرب اور مسلمانوں کے درمیان رابطے حوالے ایک بڑے مسئلے کا منبع ہے۔ عین اسی وقت مغرب اور اسلامی حکومتوں دونوں کو غیر ملکی جنگجوؤں کی فعالیت پسندی کی روک تھام کی کوششوں کو جاری رکھنا چاہیے کیونکہ القاعدہ کے ارکان کی اکثریت اپنے کیریئر کا آغاز جنگی رضا کاروں کے طور پر ہی کرتی ہے۔

بڑے پیمانے پر غیر ملکی جنگجوؤں کی عالمی تحریک کے ابھرنے کے ضمن میں دو نکات بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ اول، ایک ایسا نظریہ جو ایک تصوراتی بین الاقوامی حلقوں کے درمیان یک جہتی پر زور دیتا ہے۔ دوئم، بین الاقوامی کارکنوں کے درمیان ایک طاقتور کیڈر۔ ان میں پہلا جز یا نکتہ مقابلتاً عام ہے جبکہ دوسرا عام نہیں ہے کیونکہ ریاست اس قسم کے کیڈر کی تشکیل کی عام طور پر اجازت نہیں دیتی۔ بیسویں صدی میں بڑے پیمانے پر غیر مسلم غیر ملکی جنگجوؤں اور نجی غیر ملکی جنگجوؤں کی حرکت پذیری کے صرف دو واقعات موجود ہیں۔ اس میں ایک ہسپانوی خانہ جنگی 1930ء کے زمانے میں کام کرنے والا انٹرنیشنل بریگیڈ اور دوسرا عرب اسرائیل جنگ 1948ء میں تشکیل پانے والا یہودی رضا کاروں کا واقعہ تھا۔ ان دونوں واقعات میں حرکت پذیری بین الاقوامی کارکنوں کے طاقتور کیڈر کی جانب سے ہوئی جو کہ بالترتیب کومنٹرن اور جیوش ایجنسی کی صورت میں تھی۔ حجازی پان اسلام پسندوں کی طرح ان تنظیموں کو ریاستوں کی جانب سے جزوی خودمختاری حاصل تھی جبکہ انہیں ریاستوں جیسے وسائل اور مراعات حاصل تھیں۔ یہ تینوں کیڈر غیر معمولی حالات میں سامنے آئے۔ کومنٹرن روسی انقلاب کے فوری بعد 1919ء میں بنی جبکہ نازیوں کی جانب سے امتیازی سلوک کے نتیجے میں 1930ء میں جیوش ایجنسی سامنے آئی جبکہ حجازی پان اسلامی تحریک 1970ء کی دہائی میں ایک نوخیز اور تیزی سے پھیلتی ہوئی سعودی ریاست میں بنائی گئی۔ دیگر جن بین الاقوامی شناختوں کی جانب سے مستقبل میں غیر ملکی جنگجوؤں کی نئی تحریکوں کا جنم ہوسکتا ہے ان کو اسی طرح

MashalBooks.org

اچھی طرح منظّم، فنڈز سے مالا مال اور خود مختار کیڈرز کی ضرورت ہوگی۔

اسی اثناء میں غیر ملکی جنگجوؤں کی مسلم تحریکوں کو ملے جلے امکانات کا سامنا ہے۔ ایک جانب سے تو حکومتوں کی جانب سے بڑھتا ہوا دباؤ جس کی وجہ سے بڑے پیمانے پر مستقبل میں کسی تحریک کے ابھرنے کا امکان بہت کم ہوگا۔ دوسری جانب انٹرنیٹ کی وجہ سے غیر ملکی جنگجوؤں کے حوالے سے پروپیگنڈا بڑے پیمانے پر دستیاب ہوگا اور سفری اخراجات بھی کم ہوں گے۔ چنانچہ اگر مسلم دنیا میں کوئی بڑا تنازعہ سامنے آیا تو امید ہے کہ غیر ملکی جنگجو دوبارہ ابھریں گے۔

☆☆☆☆☆

حواشی

(1) انتھونی ایچ کارڈز مین ''Iraq's Evolving Insurgency'' ورکنگ ڈرافٹ (واشنگٹن ڈی سی سینٹر فار سٹرٹیجک اینڈ انٹرنیشنل سٹڈیز، دسمبر 2005) صفحہ نمبر 129

(2) دیکھیے مثال، محمد ایم حافظ

"Jihad After Iraq: Lessons from the Arab Afghans"

سٹڈیز ان کانفلکٹ اینڈ ٹیررازم، والیوم 32 نمبر 2 (فروری 2009)

(3) 1948ء کی عرب اسرائیل جنگ میں مسلم غیر ملکی جنگجو شریک تھے تاہم ان میں سے زیادہ تر عرب لیگ کی سپانسرڈ آرمی آف سالویشن کے تنخواہ دار تھے اور یوں اس طرح پرائیویٹ نہیں تھے جس طرح بعد میں سامنے آئے۔

(4) افغانستان کے بارے میں دیکھیے انتھونی ڈیوس کی کتاب

""Foreign Combatants in Afghanistan

(5) ڈیوڈ میلیٹ کی کتاب

"Foreign Fighters: Transnational Identity in Civil "Conflicts

(6) جلاوطن باغیوں کے حوالے سے دیکھیے نوین اے بیات کی کتاب

"The Internationalization of Terrorist Campaigns"

(7) دیکھیے، مثال کے طور پر ڈوناٹیلا ڈیلاپورٹا اور سڈنی ٹارو کے ایڈیٹوریل
Transnational Protest and Global Campaign: People, "
Power, and Passions"

(8) دیکھیے شنڈلر کی ''Unholy Terror''

(9) انسرجنسی کی تعریف کے لیے دیکھیے جیمز ڈی فیرون اور ڈیوڈ ڈی لائٹن کی
''Ethnicity, Insurgency, and Civil War''

(10) دیکھیے، تھامس ہیگ ہیمر کی
"Jihadi Salafis or Revolutionaries? On Religion and
Politics in the Study of Militant Islamism "

(11) عمومی اسلامی ریوائیول کے لیے دیکھیے وون حداد، جان او وول اور جون ایل ایسپوسیٹو کی
"The Contemporary Islamic Revival: A Critical Survey
and Bibliography"

(12) میلٹ، Foreign Fighters، صفحہ نمبر نو

(13) ادیان صالحیان
"Rebels without Borders: Transnational Insurgencies in
"World Politics

(14) دیکھیے تھامس ہیگ ہیمر کی'' Classical and Global Jihadism in
''Saudi Arabia

(15) لیون برگ، '' The Military Preparations of the Arab
Community in Palestine'' صفحہ نمبر 190

(16) دیکھیے، آرڈین رچرڈسن
"Comintern Army: The International Brigades and the
Spanish Civil War"

MashalBooks.org

(17) اے جوزف ہیکل مین

American Volunteers and Israel's War of Independence"
"

(18) میں اسلامی دنیا کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہوں: ''ایسے تمام ممالک اور ایسے تمام نیم قومی صوبے جہاں مسلمانوں کی آبادی کم ازکم پچاس فیصد ہو۔''

(19) فیرون اینڈ لائٹین کی'' Ethnicity, Insurgency, and Civil War''

(20) ریکارڈ کے لیے میں غیر ملکی جنگجوؤں کی بھرتی کے ان واقعات کو شامل نہیں کرتا جو بڑی بڑی مقامی بغاوتوں میں شریک نہیں تھے جیسے القاعدہ کی طرف سے سوڈان اور یمن میں برپا کی گئیں۔

(21) اس میں ایک ممکنہ استثنیٰ اوائل 1970ء کی اومان کی ضوفر بغاوت ہوسکتی ہے جس میں خلیج کے بائیں بازو کے لوگوں نے شرکت کی تھی اگرچہ زیادہ تر یمن کے بارڈر پر قیام کیا تھا اور لڑائی میں شریک نہیں ہوئے تھے۔

(22) اعداد و شمار میرے ہیں جن کی بنیاد وہ دستیاب ابتدائی اور ثانوی ذرائع ہے جن کو میں نے پڑھا۔

(23) کارڈز مین'' Iraq's Evolving Insurgency'' صفحہ نمبر 129 اور حافظ کی ''Suicide Bombers in Iraq'' صفحہ نمبر 71

(24) ریوون پاز'' Middle East Islamism in the European Arean''، مڈل ایسٹ ریویو آف انٹرنیشنل افیئرز، صفحہ نمبر 70

(25) مثال کے لیے دیکھیے، جان کے کولی کی

"Unholy Wars: Afghanistan, America, and International Terrorism"

(26) مثال کے طور پر دیکھیے، ڈیل ایف ایکل مین "Trans-State Islam and Security" اسکے علاوہ سوسن رڈولف اور جیمز پسکاٹوری کے ایڈیٹوریل

(27) سٹیو کول، "Ghost Wars: The Secret History of the CIA, Afghanistan, and Bin Laden, from the Soviet Invasion to September 10, 2001"

(28) پیٹر ایل برگن، "The Osama bin Laden I know: An Oral History of al Qaeda's Leader"

(29) مارک ہوبانڈ، "Warriors of the Prophet: The Struggle for Islam" صفحہ نمبر تین

(30) احمد زیدان کے اعداد وشمار کے مطابق وسط 1989 تک 242 عرب ہلاک ہوئے۔ دیکھیے جوناتھن رینڈل کی "Osama: The Making of a Terrorist"

(31) مثال کے لیے دیکھیے، مصطفیٰ حامد "Cracks in the Foundation: Leadership Schisms in al-Qa'ida, 1989-2006"

(32) قابل بھروسہ اعداد وشمار کا کوئی وجود نہیں لیکن پال ٹملٹی کے مطابق چیچنیا کی جنگ میں شریک عرب گرفتاری یا ہلاکت کا آسان شکار تھے اور چیچنیا میں لڑنے والے بہت کم عرب اس مصنف کے ذرائع میں ظاہر کیے گئے۔

(33) مثال کے لیے دیکھیے، فیلٹر اینڈ فش مین، "Al-Qaeda's Foreign Fighters in Iraq" اور تھامس ہیگر مین، "Jihad in Saudi Arabia"

(34) القاعدہ پاکستان ،سوڈان، اور افغانستان میں اپنے کچھ عرب ساتھیوں کو دو سو سے اڑھائی سو ڈالر معاوضہ دیتی تھی۔ یہ لوگ غیر ملکی جنگ جو نہیں تھے کیونکہ وہ لڑائی میں شریک نہیں تھے۔ 1990ء کے اواخر میں افغانستان میں معاوضہ ان کو دیا جارہا تھا جو القاعدہ کی تنظیموں کو چلارہے تھے، ان عرب لڑاکوں کو نہیں جو طالبان کے ساتھ مل کر شمالی اتحاد سے نبرد آزما تھے۔

(35) دیکھیے سیلنگر مارٹن کی "Ideology and Politics"

(36) دیکھیے، میلٹ، Foreign Fighters

(37) استثنیٰ میں چیچنیا اور تاجکستان شامل ہیں جہاں مقامی لوگ غیر ملکی جنگجوؤں کو مدد کے لیے بلاتے تھے۔ دیکھیے، پال ٹملٹی کی "The Rise and Fall of Arab Fighters in Chechnya"

MashalBooks.org

(38) بٹھانی لاسینا اور نائلز پیٹر گلیڈک کی" Monitoring Trends in Global Combat: A New Dataset of Battle Deaths"

(39) خانہ جنگی میں مذہب کے بڑھتے ہوئے کردار کے بارے میں دیکھیے، جوناتھن فوکس: The Rise of Religious Nationalism and Conflict: Ethnic Conflict and Revolutionary Wars، جرنل آف پیس ریسرچ، والیم اکتالیس، نمبر چھ

(40) دیکھیے، ویلہم سن "When Seperatists Become Islamists"

(41) اولیور روئے، "Islam and Resistance in Afghanistan"

(42) مورو نیشنل لبریشن فرنٹ کے عرب دنیا سے تعلقات کے بارے میں دیکھیے، تھامس ایم مکینا کی، "Muslim Rulers and Rebels:Everyday Politics and Armed Seperatism in the Southern Philippines"

(43) فرانسس کیرن کراس کے مطابق 50-1940 کے درمیان کمیونی کیشن کے اخراجات میں بڑے پیمانے پر کمی ہوئی۔ اسکے بعد 1980-1950 کے درمیان مزید کمی ہوئی جس کے بعد اخراجات مستحکم ہو گئے۔

(44) رابرٹ آر بیانچی کے مطابق کسی بھی دس سالہ عرصے کے دوران جس عرصے میں حاجیوں کی تعداد میں سب سے زیادہ اضافہ ہوا وہ 75-1965 کے درمیان تھا جب حاجیوں کی تعداد اڑھائی لاکھ سے بڑھ کر نو لاکھ تک پہنچ گئی جبکہ فضائی ذریعے سے آنے والوں کی تعداد بیس فیصد سے بڑھ کر ساٹھ فیصد ہو گئی۔

(45) مائیکل بونر، Jihad in Islamic History: Doctrines and Practice

(46) مثال کے طور پر سعودی عرب میں اخبارات کی اشاعت 1975 میں دس فی ہزار سے 1984ء میں 47 فی ہزار ہو گئی۔ اس طرح ٹی وی دیکھنے والوں کی تعداد میں بھی بڑے پیمانے پر اضافہ دیکھنے میں آیا۔

(47) ڈیوڈ میلٹ، Foreign Fighters Observation Set Data

(48) علی رحمان، Pioneers of Islamic Revival

(49) رچرڈ پی مچل The Society of the Muslim Brothers

MashalBooks.org

(50) اسلام ازم کی تعریف کے جائزے کے لیے دیکھیے، مہدی مظفری
"What Is Islamism? History and Definition of a Concept"

(51) اولیور روئے، "The Failure of Political Islam"

(52) مثال کے لیے دیکھیے، ڈونا ٹیلا پورٹا، Social Movements, Political Violence, and the State: A Comparative Analysis of Italy and Germany

(53) ان کی ایک بڑی تعداد سعودی عرب سے تعلق رکھتی ہے اور ان میں سے کوئی انقلاب پسند سنّی نہیں تھا۔ دیکھیے ھیگھیمر کی "Jihad in Saudi Arabia"۔

(54) دیکھیے کیپل کی "جہاد" (صفحہ نمبر 222-219) اور روجیئر کی "Jihad in Afghanistan and the emergence of Salafi jihadism"

(55) دیکھیے ھیگھیمر کی کتاب "Jihad in Saudi Arabia"

(56) اوپر والی کتاب دیکھیے

(57) دیکھیے ایون ایف کولمین کی کتاب "The Role of Islamic Charities in International Terrorist Recruitment and Financing"

(58) دیکھیے جان ولسن کی کتاب "Introduction to Social Movements"

(59) دیکھیے احمد موافق کی کتاب "The Afghan Arab Media at Jihad"

(60) دیکھیے کولمین کی کتاب "Al-Qaeda's Jihad in Europe"

(61) دیکھیے عمر السیف کی کتاب "Objectives and Types of Jihad"

(62) دیکھیے فواز اے گرجیر کی کتاب "The Far Enemy: Why Jihad Went Global"

(63) دیکھیے جوہانس جانسن کی کتاب "The Neglected Duty: The Creed of Sadat's Assassins and Islamic Resurgence in the Middle East"

(64) میں راسخ العتقادی کی تعریف اس طرح کرتا ہوں'' بیسویں صدی کے تربیت یافتہ اسلامی سکالروں کی اکثریتی رائے۔''

(65) ریچل سکاٹ کی رپورٹ '' An Official Islamic Response to the Egyptian al-Jihad Movement'' جرنل آف پولیٹیکل آئیڈیوجیز'' (فروری 2003)

(66) دیکھئے بروس لارنس کی'' Messages to the World: The Statements of Osama bin Laden''

(67) دیکھئے الانصار العرب فی افغانستان'' صفحہ نمبر 89

(68) دیکھئے ھیگھیمر کی'' Jihad in Saudi Arabia''

(69) اردن سے تعلق رکھنے والے مشہور انقلاب پسند محمد المقدیسی نے اپنے پیروکاروں کو بوسنیا اور چیچنیا جانے سے روک دیا تھا اور کہا تھا کہ ایسا کرنے سے ان کے محاذ خالی ہو جائیں گے۔

(70) دیکھئے الشرق العوسات کی کتاب'' The Story of 'Arab Afghans' from their entry into Afghanistan to their departure with the Taliban''

(71) ڈیوڈ کوک کی کتاب'' Understanding Jihad'' دیکھئے۔

(72) دیکھئے جان کیلسے کی کتاب'' Arguing the Just War in Islam''

(73) دیکھئے وکڑ اسل، کریسٹن فیئر اور سٹیفن شیلمین کی رپورٹ'' Consenting to a Child's Decision to Join a Jihad: Insights from a Survey of Militant Families in Pakistan''۔ سٹڈیز ان کونفلکٹ اینڈ ٹررازم (نومبر 2008)

(74) دیکھئے ڈیوڈ ڈی لائٹن کی'' National Revivals and Violence''

(75) دیکھئے ڈوگ مک ایڈمز۔ جان ڈی مک کارتھی اور میئر این زالڈ کی'' Comparative Perspectives on Social Movements: Political Opportunities, Mobilizing Structures, and Cultural Framings''

MashalBooks.org

(76) سماجی تحریک کا بہت زیادہ لٹریچر تحریکوں کے ابھرنے کی وضاحت پیش کرتا ہے نہ کہ ان تحریکوں کے جنم لینے کی۔ دیکھئے ڈوگ مک ایڈمز کی ”Initiator and 'Spin-off' Movements: Diffusion Processes in Protest Cycles“

(77) دیکھئے پال آر براس کی کتاب ”Language, Religion, and Politics in North India“ اور جیک سائنڈر کی کتاب ”From Voting to Violence: Democratization and Nationalist Conflict“

(78) دیکھئے برجسن کی ”The Syed Qutb Reader“ اور سید خاطب کی ”The Power of Sovereiginty: The Political and Ideological Philosophy of Sayyid Qutb“

(79) ڈیوڈ کامنز کی کتاب ”The Wahabi Mission and Saudi Arabia“

(80) دیکھئے امین ہارڈ شولز کی کتاب ”Islamic internationalism in the 20th century“

(81) دیکھئے سائمن لینگ لوئنس کی ”Identity Movements“

(82) دیکھئے قرآن کی سورۃ 3 میں آیت نمبر 110 اور کیولر ینگ کی ”Pan-Islamism in the Modern World: Solidarity and Conflict among Muslim Countries“

(83) دیکھئے شولز کی ”Islamic internationalism in the 20th century

(84) دیکھئے نوید ایس شیخ کی کتاب ”The New Politics of Islam: Pan-Islamic Foreign Policy in a World of States“

(85) دیکھئے سٹیفن لاکروئنکس کی کتاب ”Fields of discord: A political sociology of Islamism in Saudi Arabia“

(86) دیکھئے اوپر والی کتاب۔

(87) دیکھئے کیپل کی کتاب ”Jihad“

(88) دیکھئے حسام تمام کی کتاب ”The Brotherhood's International Organization...the promise, the course, and the result“

(89) دیکھئے شولز کی کتاب'' Islamic Internationalism in 20th Century ''

(90) دیکھئے لاکروئکس کی کتاب'' :Princes, Brokers, and Bureaucrats Oil and the State in Saudi Arabia ''

(91) گائلز ڈورونسورو کی کتاب

" Revolution Unending: Afghanistan, 1979 to the Present"

(92) دیکھئے ولیم آشنوالڈ کی کتاب'' Saudi Arabia and the Islamic Revival ''

(93) دیکھئے سیموئل ہنٹنگن کی کتاب'' The Clash of Civilizations and the Remaking of World Order ''

(94) دیکھئے محمد علی حراکن کی'' Duty of Implementing the Resolutions '' جرنل آف مسلم ورلڈ لیگ (نمبر6) 1980۔

(95) دیکھئے ھیگھیمر کی'' Jihad in Saudi Arabia ''

(96) دیکھئے عبدالرحیم محمود جیمس کی'' The popular committees for the support of Palestine's mujahideen in the Kingdom of Saudi Arabia ''

(97) دیکھئے عبدالرحمٰن گھندور کی'' Humantarian jihad: Inquiry into the Islamic ONG ''

(98) مصنف نے سعودی عرب میں ریاض میں انٹرویو لیے۔

(99) عبداللہ عزام کی'' Signs of the Merciful in the Afghan jihad ''

(100) مثال کے طور پر دیکھئے محمد المجدب کی'' The Birth of Afghan Arab ''

(101) دیکھئے عامر رانا اور مبشر بخاری کی'' Arabs in Afghan Jihad ''

(102) دیکھئے ھیگھیمر کی'' Jihad in Saudi Arabia ''

(103) دیکھئے جان سی ایم کالورٹ کی'' The Striving Sheykh: Abdullah Azzam and the Revival of Jihad ''

(104) دیکھئے واحد براؤں کی ''Abdul Walid Al-Masri: A Biographical Sketch''

(105) دیکھئے محمد کی ''الانصار العرب فی افغانستان''۔

(106) دیکھئے ریسا کی ''Seeds of Terror: An Eyewitness Account of Al-Qaeda's Newest Center of Operations in Southeast Asia''

(107) دیکھئے ابورومن اور سعید کی ''Al-Alim wal-mujahid wal-shahid al-Shaykh Abdallah Azzam''

(108) مصنف نے عزام کے گھر والوں کے انٹرویو لیئے۔ (عمان 2006)

(109) دیکھئے ایمن الزواہری کی ''The knights under the Prophet's banner''

(110) دیکھئے رومن اور سعید کی ''Al-Alim wal-mujahid wal-shahid al-Shaykh Abdallah Azzam'' (صفحہ نمبر 137)

(111) دیکھئے ''Abdallah Azzam, Hamas... Historical roots and charter''

(112) افغانستان کے سب سے مشہور فتویٰ میں بھی کہا گیا ہے کہ ''جو شخص فلسطین میں لڑ سکتا ہے وہ وہیں لڑے''

(113) دیکھئے جیمز ڈی فیرون کی ''Counterfactuals and Hypothesis Testing in Political Islam''

(114) دیکھئے ھیگیمر کی ''Classical' and 'Global' Jihadism in Saudi Arabia''۔

(115) دیکھئے ھیگھمر کی ''Jihad in Saudi Arabia''

MashalBooks.org

طالبان کے مالی وسائل

کیتھرین کولنز اور اشرف علی

اپریل 2010ء

خلاصہ

افغانستان اور پاکستان میں موجود جنگجو قوتیں صرف نظریات پر زندہ نہیں رہ سکتیں بلکہ انہیں دو انتہائی لازمی وسائل کی ضرورت ہوتی ہے جن میں ایک پیسہ اور دوسرا افرادی قوت ہے۔ جب تک امریکہ اور اس کے اتحادی طالبان اور اس کے جنگجوؤں کو ملنے والے مالی امداد میں قابل ذکر حد تک کمی نہیں کرتے اس وقت عسکریت پسندی کو شکست دینا اور افغانستان کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنا اور پاکستان میں جمہوریت کے لیے ضروری سیاسی استحکام حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس بات کو سمجھا جائے کہ آخر عسکریت پسندوں کو سرحد کے دونوں اطراف سے مالی مدد کیسے ملتی ہے تا کہ ان پوائنٹس کو شناخت کیا جائے جن پر دباؤ ڈال کر طالبان کے لیے مالی امداد کو کم کیا جا سکے اور طالبان اور ان کے ساتھیوں کو ان فنڈز سے محروم کر دیا جائے جن کی ان کو لڑائی کے لیے ضرورت ہے۔

تا حال دہشت گردی کے خلاف جنگ کے حوالے سے معاشی محاذ پر ریکارڈ کچھ حوصلہ افزاء نہیں ہے۔ امریکی انٹیلی جنس افسروں، امریکی ڈرگ انفورسمنٹ ایڈمنسٹریشن حکام، عالمی

MashalBooks.org

ریگولیٹرز، بیرونی ماہرین اور مقامی حکام سے کیے جانے والے انٹرویوز سے یہ اتفاق رائے سامنے آیا ہے کہ اس بارے میں حقیقی طور پر یہ کوئی نہیں جانتا کہ دہشت گردوں کے لیے کتنی رقم آ رہی ہے اور خاص طور پر یہ کہاں سے آ رہی ہے۔ منشیات کی تجارت اور دیگر جرائم جیسے پراسیسنگ لیبارٹریز کی حفاظت اور ان سے حاصل ہونے والا پیسہ سرمایے کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھا جاتا ہے تاہم ان سرگرمیوں سے حاصل ہونے والے پیسے کے حوالے سے اعداد وشمار میں اختلاف ہے۔ جس کے مطابق اس کام سے ستر ملین ڈالر لے کر پانچ سو ملین ڈالر تک رقم حاصل ہوتی ہے۔ اس طرح بیرونی ممالک سے ملنے والی امداد کے حوالے سے اعداد وشمار بھی مشکوک ہیں۔ سی آئی اے کے مطابق گذشتہ سال غیر ملکی گروہوں اور افراد نے ایک سو چھ ملین ڈالر دیے تاہم کچھ وفاقی تحقیقاتی حکام ان اعداد وشمار پر حقارت کی نگاہ ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس حوالے سے حقیقی اعداد وشمار کا تعین کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ پیسے کے بہاؤ کے حوالے سے جو نگرانی سسٹم ہے وہ اس قدر کمزور ہے کہ کسی قسم کے حتمی اعداد وشمار تک پہنچنا مشکل ہے۔

دہشت گردوں کی مالی امداد کے حوالے سے جس چیز پر وسیع پیمانے پر اتفاق رائے پایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ان جنگجوؤں کے خلاف مہم کا بنیادی پہلو یہ ہے کہ ان کو ملنے والی مالی امداد کو کم کیا جائے۔ عسکریت پسندی کا عمل یک پہلو نہیں بلکہ مختلف پہلوؤں پر مشتمل ہے جس میں سب کی اپنی قیادت، مقاصد اور مالی امداد کے ذرائع ہیں۔ عسکریت پسندوں میں وہ فرق ان کے مالی امداد کے ذرائع سے ظاہر ہوتا ہے۔ طالبان اور القاعدہ کے حوالے سے امریکی مانیٹرنگ ٹیم کے ڈائریکٹر رچرڈ بیرٹ کا کہنا ہے کہ جب مالی ذرائع کی بات کی جاتی ہے کہ طالبان اور اس کے متعلقہ گروہوں کو موقع پرست کے طور پر دیکھنا چاہیے۔ وہ پیسہ اکٹھا کرنے کے لیے مقامی سطح پر ہر سرگرمی میں ملوث ہوتے ہیں۔ وہ صرف منشیات کے ذریعے پیسہ اکٹھا نہیں کرتے بلکہ وہ کوئی بھی طریقہ اختیار کر سکتے ہیں۔

منشیات کی تجارت علاقائی سطح پر طالبان کی جانب سے پیسہ اکٹھا کرنے کا بنیادی طریقہ ہے۔ یہ گروپ جنوبی افغانستان میں سب سے زیادہ طاقت ور ہے جو کہ اس کا روایتی گڑھ اور ملک کا وہ حصہ ہے جہاں سب سے زیادہ افیون پیدا کی جاتی ہے جو کہ دنیا کی کل ہیروئن کا نوے فیصد فراہم کرتی ہے۔ حالیہ سالوں کے دوران طالبان اور سمگلروں کے درمیان تعلقات میں اضافہ ہوا ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ جنگجوؤں کے لیے رقم کی سپلائی میں کمی کے لیے ان سمگلروں کو

قابو کرنا بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ملک کے مشرقی حصے میں مالی تصویر کچھ مختلف ہے جہاں پوست کی پیداوار بہت کم ہے۔حقانی نیٹ ورک جس کا طالبان اور القاعدہ دونوں سے تعلق ہے وہ جرائم سے حاصل ہونے والے پیسے پر بڑے پیمانے پر انحصار کرتا ہے جس میں بھتہ حاصل کرنے اور اغوا برائے تاوان کا طریقہ شامل ہے۔مغربی پاکستان کی سرحدوں کے پار جو پاکستانی طالبان کا گڑھ اور حقانی نیٹ ورک کی بیرونی چوکی ہے وہاں پر اغوا اور سمگلنگ طالبان کے مالی ذرائع میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔القاعدہ جس کی مرکزی قیادت کے بارے میں یقین کیا جاتا ہے کہ وہ پاکستان کے قبائلی علاقے میں ہے اس کو منشیات کی تجارت سے بہت کم پیسہ ملتا ہے اور اس کا زیادہ تر انحصار خلیجی ریاستوں کے ڈونرز پر ہوتا ہے۔

امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے صرف حال ہی میں عسکریت پسندوں کے خلاف کامیابی حاصل کرنے کے لیے ان کی مالی معاونت کو روکنے کی حکمت عملی اپنائی ہے۔اس سلسلے میں افغان تھریٹ فنانس سیل قائم کیا گیا ہے جس کا بنیادی کام یہ معلوم کرنا ہے کہ عسکریت پسندوں کو مالی معاونت کس طرح حاصل ہوتی ہے اور ان کی مالی امداد کے سلسلے کو کس طرح بند کیا جاسکتا ہے۔جنگجوؤں کو پیسے کی سپلائی کے معاملے کو اب جس طرح اہمیت دی جانے لگی اس کا اندازہ اس با ت سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ امریکی فوج نے گذشتہ سال اس بات کی اجازت حاصل کر لی تھی کہ منشیات کے ایسے سمگلروں کو بھی پکڑے جن کے جنگجوؤں سے یقینی اور ثابت شدہ تعلقات ہیں جو کہ پینٹا گون کی اس پالیسی میں ایک بڑی تبدیلی ہے جس کے تحت افغانستان میں منشیات کی تجارت پر بالائی سطح پر بہت کم توجہ دی جاتی تھی۔

افیم کی تجارت کی تاریخ

افغانستان کی حالیہ اور مشکل بھری تاریخ کو منشیات کی تجارت کے عروج ،زوال اور د وبارہ عروج کے ذریعے بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ایک ملک جو کبھی پھل اور اناج برآمد کرتا تھا وہاں اب پوست کی کاشت جو کبھی مقامی سطح پر بہت چھوٹے پیمانے پر ہوتی تھی اب عالمی تجارت کی شکل اختیار کر چکی ہے جس سے اقوام متحدہ کے منشیات اور جرائم کے حوالے سے آفس کے مطابق صرف 2009ء میں تین ارب ڈالر کمائے گئے۔اس تبدیلی کا آغاز افغانستان میں 1979ء میں سوویت یونین کے حملے کے بعد ہوا۔جنگ کے اس عشرے کے باعث افغانستان اس قابل نہ رہا کہ اپنی

ضروریات خود سے پوری کر سکے۔نہری نظام تباہ ہوگیا۔مویشی مارے گئے ۔سڑکیں بھی برباد ہوگئیں ۔روایتی فصلوں کی جگہ افغان کسانوں نے پوست کی فصل اگانا شروع کردی تاکہ مہنگی خوراک باہر سے منگوانے کے لیے پیسہ کماسکیں۔پوست کی فصل بہت سخت جان ہوتی ہےاوراسے بہت کم پانی کی ضرورت ہوتی ہےاوراس سے بنائی جانے والی افیم کوآسانی کے ساتھ ٹرانسپورٹ کیا جاسکتا ہےاور مارکیٹ میں پہنچنے سے پہلےاس کے خراب ہونے کا بھی خطرہ نہیں ہوتا۔

سوویت یونین کی افغانستان سے واپسی کے باوجود پوست پر انحصار مکمل طور پر ختم نہ ہوا۔جنگی سرداروں نے خلاء کو پر کرتے ہوئے منشیات کی تجارت کو بھی اپنے کنٹرول میں لے لیا۔نوے کی دہائی کے وسط میں طالبان کے آنے کے باوجود منشیات کی تجارت پھلتی پھولتی رہی۔ **1999**ءتک افغانستان اس مقدار سے پندرہ گنازیادہ افیم پیدا کررہا تھاجووہ بیس سال پہلے پیدا کررہا تھا۔اس کے نتیجے میں یورپ ، روس اور دیگر مما لک کوسستی اور بے بہا ہیروئن ملنے لگی۔طالبان نے بین الاقوامی دباؤ کے پیش نظراور عالمی تنہائی سے نکلنے کے لیے **2000**ء میں پوست کی کاشت پر پابندی عائد کردی۔اس سے ہیروئن کی پیداوار میں ڈرامائی کمی ہوئی اوراس کی پیداواردوسال پہلے تک ساڑھے چار ہزارٹن سے کم ہوکرایک سوپچاس ٹن رہ گئی۔

تاہم یہ کمی بہت کم عرصہ رہی۔ **2001**ء میں امریکی قیادت میں ہونے والے حملے کے نتیجے میں طالبان حکومت ختم ہوگئی جس کے بعد منشیات کی تجارت میں دوبارہ تیزی آگئی۔جن کسانوں کوطالبان کی پابندی کی وجہ سے نقصان ہوا تھا وہ اپنے قرضے اتارنے کے لیے دوبارہ بڑے پیمانے پر پوست کاشت کرنے لگے۔نیویارک یونیورسٹی کے سکالراور رچرڈ ہالبروک کے سینئر مشیر بارنٹ آرروبن کے مطابق جوجنگی سردار طالبان کی حکومت کے خاتمے میں امریکہ کے ساتھ تھےانہوں نے اپنے اختیارات کے تحت پوست کی کاشت پرمحصول لیناشروع کردیااورافیم کے سمگلروں کاتحفظ کرنے لگے۔

طالبان اوراس سے متعلقہ گروہوں کا دوبارہ ظہور بنیادی طور پرمنشیات کی سمگلنگ سے اکٹھا ہونے والے پیسےاوردیگر جرائم کامرہون منت تھا۔جنگی سرداروں کےنقش قدم پر چلتے ہوئے علاقائی اور مقامی طالبان کمانڈروں نے اپنے اپنے علاقوں میں پوست کی کاشت پرمحصول لینا شروع کردیا اور منشیات کے سمگلروں کی حفاظت کے بدلے بھی رقم کا مطالبہ کرنے لگے۔ان عسکریت پسندوں نے جب ملک کے بڑے حصے پر قبضہ کرلیا تومحصول بڑھ گیا بالخصوص ان

علاقوں میں جو پشتون بیلٹ میں آتے تھے جو مشرقی افغانستان سے لیکر جنوب میں پوست کی کاشت کے بڑے صوبے ہلمند پر مشتمل ہے۔

منشیات کی تجارت اور طالبان کئی مختلف سطحوں پر افغانستان میں اہم کردار ادا کرتے رہے۔ وینڈا فلباب براؤن اپنی کتاب ''شوٹنگ اپ'' میں لکھتی ہیں کہ افیم کی معیشت سیاسی دارالحکومت کے لیے ایک اہم ذریعہ ہے کیونکہ یہ آبادی کے ایک بڑے حصے کو قابل بھروسہ اور پر کشش روزگار فراہم کرتا ہے۔ سابق امریکی نائب صدر جوزف بائیڈن سے لیکر جنرل پیٹریاس تک کئی امریکی حکام کا کہنا ہے کہ ستر فیصد یا اس سے بھی زیادہ طالبان جنگجو اس لیے ہتھیار اٹھاتے ہیں کیونکہ ان کے پاس روزگار کا اس کے علاوہ کوئی ذریعہ موجود نہیں۔ ان لڑاکوں کو ماہانہ لگ بھگ سو سے لیکر تین سو ڈالر تک معاوضہ ملتا ہے اور اس طرح یہ دس ڈالر دیہاڑی کے جنگجو ہوتے ہیں۔ ایک امریکی امدادی کارکن سارا چائس کا کہنا ہے کہ ان جنگجوؤں کے نزدیک یہ کام فائدے کے لیے نہیں کیا جاتا بلکہ یہ صرف گذارے کے لیے ہوتا ہے۔ ہر کوئی اس کی حمایت کرے گا۔

رنگروٹوں کے لیے لیبر پول کے حوالے سے افغان حکومت کو طالبان کے ساتھ مسابقت کا سامنا ہے۔ افغان حکومت نے جب 2009ء میں انٹری لیول فوجیوں اور خام رنگروٹوں کے لیے معاوضے میں اضافہ کیا تو ان ملازمتوں کے لیے درخواستوں کی بھرمار ہوگئی۔ اس طرح اب لڑائی کے علاقوں میں کام کرنے والے افغان فوجی اور پولیس اہلکار ماہانہ اڑھائی سو ڈالر معاوضہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اتحادی افواج کے ڈپٹی کمانڈر امریکی جنرل ڈیوڈ روڈرگز کا کہنا ہے کہ یہ معاوضہ طالبان کی جانب سے دیے جانے والے معاوضے سے اب بھی کم ہے تاہم فوج اور پولیس میں شمولیت سے تنخواہوں میں اضافے اور استحکام کا موقع میسر آتا ہے۔ تاہم اس کے باوجود اٹلی سے تعلق رکھنے والے نیٹو جنرل انچارج برائے پولیس تربیت بریگیڈیر جنرل کارمیلو برجیو کا طنز بھرے لہجے میں کہنا تھا کہ طالبان میں بھرتی ہونا زیادہ فائدہ مند ہے کیونکہ وہ زیادہ معاوضہ دیتے ہیں۔

امریکہ اور برطانیہ کی جانب سے افغانستان سے پوست کی فصل کے خاتمے کو کئی اطراف سے تنقید کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔ ان نقادوں میں ایک صحافی گریچن پیٹرز بھی شامل ہیں جن کا کہنا ہے کہ اس عمل سے کسانوں کا نقصان ہوتا ہے جو کہ منشیات کے اس کام میں سب سے نچلی سطح پر ہوتے ہیں اور اسی کی وجہ سے جب ان کا ذریعہ آمدنی ختم ہوتا ہے تو وہ طالبان میں شامل

ہو کر ہتھیار اٹھا لیتے ہیں۔ بیالیس طالبان جنگجوؤں سے کیے جانے والے انٹرویوز کے ایک سلسلے میں کینیڈین صحافی گریم سمتھ نے یہ پایا کہ ان لڑاکوں میں سے اسی فیصد نے اعتراف کیا کہ ان کا افیم کی انڈسٹری سے زاتی تعلق ہے جبکہ پچاس فیصد سے زائد کو پوست کے خاتمے کی کوششوں میں نشانہ بنایا گیا۔

اگرچہ طالبان کے جنگجو تو زندہ رہنے کے لیے کچھ کمانے کی تگ ودو میں ہیں جبکہ دوسری جانب وہ ہیں جو منشیات کی اس تجارت سے بے پناہ منافع کما رہے ہیں اور ساتھ ہی طالبان کی مالی مدد بھی کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کو ''مجرم سرمایہ دار'' کا نام دیا گیا ہے۔ ان میں ایک بنیادی مثال حاجی جمعہ خان کی ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ افغانستان میں منشیات کی تجارت کا ایک بڑا رنگ چلا رہا تھا جو کہ افیم خرید کر کے لیبارٹری میں اس سے ہیروئن تیار کرتا اور اس قابل تھا کہ وہ دو سال تک امریکی مارکیٹ کو ہیروئن سپلائی کر سکے۔ اپنی لیبارٹریوں اور منشیات کی سمگلنگ کے راستوں کی حفاظت کے لیے وہ طالبان کو بھاری معاوضہ دیتا تھا۔ جمعہ خان کے بارے میں مشہور تھا کہ اس کی پاکستان اور افغانستان میں وسیع جائیدادیں ہیں اور وہ اپنی سلطنت پاکستان کے جنوب مغربی شہر کوئٹہ سے چلاتا ہے۔ اکتوبر 2008ء میں امریکی اور برطانوی ایجنٹوں نے اسے دھوکے سے انڈونیشا بلا کر گرفتار کر لیا۔ اسے اگلے ہی روز امریکہ کے حوالے کر دیا گیا جہاں اس کے خلاف منشیات کی سمگلنگ اور ایک دہشت گرد تنظیم کی مالی امداد کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا۔ اس پر کئی اور سنگین واقعات میں فرد جرم بھی عائد کی گئی جن میں خود کش حملے میں گورنر نیمروز کے بیٹے اور چھ دیگر افراد کی ہلاکت کا واقعہ اور کابل کے سرینا ہوٹل میں حملہ شامل تھا۔ جمعہ خان دوسرا بڑا منشیات کا سمگلر تھا جسے مقدمے کے لیے امریکہ لایا گیا۔ 2007ء میں باز محمد نامی سمگلر کو منشیات کی سمگلنگ اور لاکھوں ڈالر کی ہیروین امریکہ لانے اور طالبان کی مالی امداد کے جرم میں پندرہ سال قید کی سزا سنائی گئی۔ منشیات کے اس بڑے سمگلر کا عجیب وغریب جواز یہ تھا کہ وہ امریکیوں کو ہیروئن کی لت میں مبتلا کر کے ان کے خلاف جہاد کر رہا ہے۔ امریکی اہلکار کیرن ٹینڈی کے مطابق اس کا حملہ غیر روایتی تھا اور منیشات کی تجارت سے حاصل ہونے والے بھاری منافع سے طالبان اور دیگر انتہا پسند گروپوں کی مالی مدد کی جاتی تھی۔

اگرچہ جمعہ خان اور باز محمد جیسے منشیات کے سمگلر اپنے تحفظ کے لیے طالبان کو بھاری معاوضہ دیتے تھے تاہم طالبان نے منشیات سے اپنی آمدنی کو بڑھانے کے لیے پوست کے کاشت

کاروں کے لئے ایک سکیم شروع کی ۔مقامی طالبان کمانڈر کسانوں کو بیج کی خریداری کے لیے قرضہ دیتے اور جب پوست کی فصل کاشت کے بعد کاٹ لی جاتی تو یہ قرضہ انہیں واپس کر دیا جاتا۔انہوں نے پوست کے کاشت کاروں سے دس فیصد محصول بھی لینا شروع کر دیا جو عشر کہلاتا تھا ۔اس کے علاوہ وہ منشیات کے سمگلروں سے اپنے علاقوں میں منشیات کی تجارت اور ان کی لیبارٹریوں جہاں کہ افیم سے ہیروئن بنائی جاتی تھی کے تحفظ کے لیے بھی معاوضہ لیتے۔اس بات کے بھی اشارے ملے کہ طالبان منشیات کی تجارت کے حوالے سے ''ویلیوایڈڈ'' چین کے مرحلے کی طرف بڑھ رہے تھے جس کے تحت لیبارٹریاں چلانے اور پراسیسنگ کے لیے درکار کیمیکلز کی سمگلنگ کا کام شامل تھا۔

منشیات کی تجارت کے خفیہ ہونے کی وجہ سے اس سے حاصل ہونے والے پیسے کے بارے میں یقینی تخمینہ لگانا بہت مشکل ہے ۔یہ مشکلات افغانستان میں اور بھی زیادہ ہو جاتی ہیں جہاں معیشت نقد کیش پر چلتی ہے اور بینکوں کا باقاعدہ نظام چند بڑے شہروں کے علاوہ کہیں موجود نہیں ۔قانونی اور غیر قانونی ہر قسم کا لین دین حوالے کے نظام کے ذریعے کیا جاتا ہے جو کہ بینکنگ کا ایک غیر رسمی طریقہ ہے جس میں سارا انحصار ذاتی تعلقات اور لائٹ ریگولیشن پر ہوتا ہے جو کہ جنوبی ایشیا میں صدیوں سے رائج ہے۔افغانستان کی اسی سے نوے فیصد سے زائد اکانومی بے قاعدہ ہے اور حوالے کے نظام کے تحت چلتی ہے۔اقوام متحدہ کے خصوصی مشیر برائے نارکوٹکس کنٹرول ژان لک لیماہو کے مطابق حوالے کے نظام جرائم پیشہ عناصر کا پیسہ کسی خوف وخطرے کے بغیر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاسکتا ہے۔لگ بھگ ساٹھ فیصد اس قسم کی رقوم کا تبادلہ منشیات کے پیسے سے متعلق ہوتا ہے اور افغانستان کے منشیات پیدا کرنے والے بڑے صوبوں ہلمند اور قندھار میں تمام حوالہ ڈیلر اس قسم کے لین دین میں ملوث ہیں۔

اگر چہ حوالہ کا نظام سستا ہے اور اس میں زیادہ تر انحصار اعتماد اور استحقاق پر کیا جاتا ہے تاہم یہ کوئی غیر دستاویزی نظام نہیں ۔اس میں ریکارڈ کا اندراج رسمی نہیں ہوتا لیکن بہت سے حوالہ ڈیلر لین دین کا کوڈ سسٹم کے ساتھ اندراج کرتے ہیں جو کہ سیٹلمنٹ پراسس کا حصہ ہوتا ہے۔امریکی اور افغان مالی تحقیقات کاروں نے غیر قانونی حوالہ ڈیلروں کے خلاف کریک ڈاؤن شروع کر دیا جس کے دوران ان کے ریکارڈ کو قبضے میں لیکر اس کی بنیاد پر مالی لین دین پتہ چلایا جاتا ہے۔حالیہ کامیابیوں کے باوجود جس میں سنٹرل بینک کے ذریعے افغانستان میں بڑی تعداد

MashalBooks.org

میں حوالہ ڈیلروں کی رجسٹریشن کی گئی ہے تاہم امریکی اور افغان حکام منشیات کے پیسے کے لین دین کے حوالے سے حقیقی اعداد و شمار تک پہنچنے سے قاصر ہیں کجا یہ کہ اس میں سے کتنا پیسہ جنگجوؤں کے پاس جا رہا ہے۔ تاہم اس کے باوجود کچھ حکام اعداد و شمار کا تخمینہ لگانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

امریکی ڈائریکٹر آف نیشنل انٹیلی جنس ڈینس بلیئر کے مطابق افغان طالبان نے **2008**ء میں منشیات کے ذریعے دس کروڑ ڈالر کمائے۔ وہ بتاتے ہیں کہ طالبان کی لڑائی کے لیے افغانستان کے اندر پیسے کی فراہمی کا سب سے اہم ذریعہ منشیات کی تجارت ہے۔ سی آئی اے اور پنٹا گون کے دفاعی حکام کا تخمینہ ہے کہ طالبان منشیات کی تجارت سے سالانہ سات کروڑ ڈالر کماتے ہیں جس کے بارے میں افغانستان اور افغانستان سے باہر بہت سے حلقوں کا کہنا ہے کہ یہ اعداد و شمار بہت کم ہیں۔ ایک امریکی اہلکار وینکل کے مطابق سات کروڑ ڈالر کا عدد بہت کم ہے۔ جن اعداد و شمار کے بارے میں وہ سنتے رہے ہیں وہ تیس کروڑ ڈالر کے لگ بھگ ہے۔

پیٹرزان اعداد و شمار میں مزید اضافہ کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ طالبان منشیات کی تجارت جیسے جرائم سے پچاس کروڑ ڈالر کے لگ بھگ کماتے ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ سی آئی اے کے اعداد و شمار میں وہ رقم شامل نہیں جو منشیات کے سمگلر اپنے دھندے کے تحفظ کے لیے طالبان کو دیتے ہیں اور یہ کہ بعض جنگجو اس کام میں براہ راست ملوث ہو کر جو کماتے ہیں جیسے افیم کی پراسسنگ اور مارکیٹنگ کا کام ہے جس سے ان کے حصے میں ڈرامائی حد تک اضافہ ہو جاتا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ ایک ڈرگ مارکیٹ جس کا مالیت تین ارب ڈالر ہے اس میں طالبان کے بارے میں یہ کہنا ہے کہ وہ صرف سات کروڑ ڈالر کما رہے ہیں ایک غیر حقیقی بات ہے۔

منشیات کی تجارت کے تحفظ کے حوالے سے دنیا بھر کے بارے میں رپورٹیں تیار کرنے والے ادارے یو این ڈی او سی کے اعداد و شمار تک میں غیر یقینی پائی جاتی ہے۔ اس ادارے کا کہنا ہے کہ جنگجوؤں کو منشیات کی تجارت سے سالانہ چالیس کروڑ ڈالر حاصل ہو رہے ہیں تاہم گذشتہ سال ایجنسی نے اپنے اعداد و شمار میں بہت تیزی سے کمی کرتے ہوئے اسے ساڑھے بارہ کروڑ ڈالر کر دیا اور اس کی کمی کی وجہ یہ بتائی کہ اس میں صرف پوست کاشت کرنے والے کسانوں سے لیا جانے والا محصول اور وہ رقم شامل کی گئی ہے جو طالبان کو منشیات کی تجارت کے تحفظ سے حاصل ہوتا ہے۔ کم کیے گئے اعداد و شمار میں وہ رقم شامل نہیں کی گئی جو لیبارٹریوں میں پراسسنگ اور اس

MashalBooks.org

کام کے لیے مطلوبہ کیمیکلز کی سمگلنگ کے بدلے طالبان کو حاصل ہوتی ہے یا طالبان سے منسلک جنگجوؤں کو جو رقم حاصل ہوتی ہے۔اقوام متحدہ کے ایک سینئر اہلکار تھامس پیچمان کے مطابق اگر ان تمام چیزوں کو بھی شامل کیا جائے تو اعداد و شمار ایک بار پھر گذشتہ سال والے چالیس کروڑ ڈالر تک پہنچ جاتے ہیں۔

تاہم حقیقی اور درست ترین اعداد و شمار کے حوالے سے پیچمان بدستور شکوک وشبہات کا شکار ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ ایسا کوئی اکاؤنٹنٹ موجود نہیں جو ان کا باقاعدہ حساب کتاب رکھ رہا ہو۔اس کے بجائے ان کے اعداد و شمار کی بنیاد اس بات پر ہوتی ہے کہ کتنے رقبے پر پوست کاشت کی جا رہی ہے، کتنی افیم پیدا کی جا رہی ہے اور فلاں سال میں ہیروئن کی قیمت کیا رہی ہے۔یہی ہماری سائنسی اپروچ ہے۔لیکن جب طالبان کی بات کی جاتی ہے تو اس بارے میں ایجنٹوں کی اطلاعات پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے جن میں ہر کوئی مختلف اطلاع دیتا ہے۔تاہم اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اعداد و شمار کو ساڑھے بارہ کروڑ ڈالر کہا جائے یا چالیس کروڑ ڈالر۔ان اعداد و شمار سے آپ کو ان کی قوت خرید کا پتہ چلتا ہے۔اس رقم سے آپ یو بوٹس یا جدید طیارے نہیں خرید سکتے بلکہ صرف ایسے ہتھیار حاصل کر سکتے ہیں جو ان کے لیے مونگ پھلی کے برابر ہوتے ہیں۔

کچھ ماہرین منشیات کے سمگلروں اور طالبان کے درمیان رابطوں کے مثبت پہلوؤں کی جانب دیکھتے ہیں۔وینکل جو افغانستان اور لاطینی امریکہ دونوں جگہوں پر کام کر چکے ہیں وہ افغان بغاوت کے ایک مجرمانہ سنڈیکیٹ سے ریوولوشنری آرمڈ فورسز آف کولمبیا (ایف اے آر کے یا فارک) میں تبدیل ہونے سے مارکسسٹ لیننسٹ گوریلا تحریک سے جنوبی امریکی مافیا میں تبدیل ہونے کا موازنہ کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ فارک کی طرف دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ ابتداء میں ایک انتہائی نظریاتی، انٹی اسٹیبلشمنٹ اور انٹی گورنمنٹ تحریک تھی لیکن جب وہ اس میں آگے بڑھتے رہے تو ان کا پھیلاؤ بھی بڑھتا گیا اور انہیں مجرمانہ عناصر کی طرف سے زیادہ پیسہ ملنے لگا۔یہ چیز انہیں نظریے سے دور لے گئی اور پھر یہی چیز فارک کا کمزور پہلو بنتا چلا گیا۔کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہی چیز اب آپ کو یہاں پر بھی دکھائی دیتی ہے۔آپ بہت سے طالبان کو دیکھ سکتے ہیں خصوصاً جنوب میں جو منشیات کے سمگلروں کے ساتھ ملوث ہو چکے ہیں۔

منشیات کی سمگلنگ سے آگے

MashalBooks.org

حالیہ سالوں کے دوران طالبان، حقانی نیٹ ورک اور اسی طرح کے گروپ منشیات کے علاوہ مختلف اقسام کے جرائم میں ملوث ہو چکے ہیں۔ کئی واقعات میں سرحد کے دونوں اطراف میں اس قسم کی سرگرمیاں جدید قسم کی مجرمانہ کارروائیوں میں بدل چکی ہیں جن سے ان گروپوں کو اتنا ہی پیسہ حاصل ہوتا ہے جتنا کہ منشیات کی تجارت سے حاصل ہوتا ہے۔ آرمی سپیشل فورسز کے کمانڈر میجر مائیک سلیوان کا کہنا ہے کہ طالبان اور مجرمانہ عناصر کے درمیان محض ایک لکیر ہے جو ٹمٹمار ہی ہے۔ میجر سلیوان افغانستان میں طالبان کے خلاف منشیات کے حوالے سے آپریشن کرتے رہے ہیں۔ طالبان اور ان کے حامی عناصر جس قسم کے جرائم میں ملوث ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

اغوا:

نومبر دو ہزار آٹھ میں نیویارک ٹائمز سے تعلق رکھنے والے ایک رپورٹر ڈیوڈ رہوڈ کو اس کے افغان ڈرائیور اور ٹرانسلیٹر سمیت اغوا کر لیا گیا جب وہ کابل سے باہر ایک طالبان کمانڈر کا انٹرویو کرنے جا رہے تھے۔ مغویوں نے صرف ایک ہفتہ افغانستان میں گذارا اور اس کے بعد انہیں سرحد پار پاکستان بھیج دیا گیا اور حقانی نیٹ ورک کے لیڈر اور اس کے بانی جلال الدین حقانی کے بیٹے سراج الدین حقانی کے حوالے کر دیا گیا۔ اگلے سات ماہ تک رہوڈ اور اس کے ساتھیوں کو پاکستان کے دشوار گذار مغربی علاقے میں رکھا گیا اور ان کی رہائی کے لیے دو کروڑ ڈالر کے لگ بھگ تاوان طلب کیا گیا۔ آخر کار رہوڈ اور اس کا مترجم ساتھی وہاں سے خود ہی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے جبکہ بعد میں تیسرا بھی فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ تاہم یہ بات اب واضح طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ سرحد کے دونوں طرف کے جنگجوؤں کے لیے لوگوں کو تاوان کے لیے اغوا کرنا معمول بن چکا ہے۔

بعض تجزیہ نگار اغواء برائے تاوان کے واقعات میں طالبان کے بڑے پیمانے پر ملوث ہونے کی کڑیاں گروپ کے اس ضابطہ اخلاق سے جوڑتے ہیں جس میں اغوا برائے تاوان کے واقعات کو جائز قرار دیتے ہوئے اعلان کیا گیا تھا کہ اگر مقدس جنگجو کسی غیر ملکی فوجی، صحافی یا امدادی کارکن کو اغوا کر کے اس کے بدلے تاوان طلب کرتے ہیں تو وہ اس میں حق بجانب ہیں۔ پاکستانی طالبان کی تنظیم تحریک طالبان پاکستان کے ترجمان مولوی عمر نے اس فتوے یا فیصلے کی حمایت کرتے ہوئے کہا کہ اگر وہ اغوا برائے تاوان کے واقعات کی مذمت کرتے ہیں لیکن اگر ایسا کسی اسلامی کاز کو بڑھانے کے لیے کیا جائے تو یہ بالکل ٹھیک ہو گا۔

MashalBooks.org

پاکستانی پولیس کے مطابق پاکستان میں موجود طالبان کے لیے اغوا برائے تاوان آمدنی کا واحد سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ پولیس کی جانب سے اگرچہ اغوابرائے تاوان کے دس میں سے صرف ایک واقعے کا الزام پاکستانی طالبان پر عائد کیا جاتا ہے لیکن اس کے لیے جو تاوان لیا جاتا ہے وہ ساٹھ ہزار ڈالر سے لیکر اڑھائی لاکھ ڈالر تک ہوتا ہے۔ پولیس کا کہنا ہے کہ پاکستانی طالبان نے گذشتہ سال ستر سے زائد افراد کو اغوا کیا جن میں سے کچھ مقامی پاکستانی تھے جیسے ٹی وی ایکٹر ارشد حسین وغیرہ جس کی فیملی نے کوئی ساڑھے گیارہ ہزار ڈالر کے مساوی تاوان ادا کر کے اس کی رہائی ممکن بنائی۔ امریکی حکام کے مطابق افغانستان میں بھی اسی طرح اغوا برائے تاوان کے واقعات میں اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔

عام طور پر اغوا برائے تاوان کے واقعات میں امیر تاجروں ، امدادی کارکنوں اور صحافیوں کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔ چند واقعات کے جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ ان واقعات میں کس قدر تیزی سے اضافہ ہوسکتا ہے۔ اغوا برائے تاوان طالبان کی حکمت عملی میں کس قدر تیزی سے بڑھ رہے ہیں اس کی حالیہ ترین مثال ایک اطالوی صحافی گیبریل ٹورسیلو کا اغوا ہے جسے اکتوبر دو ہزار چھ میں سے افغان صوبے ہلمند سے اغوا کیا گیا تھا جہاں وہ بائیس روز تک طالبان کی حراست میں رہا تھا۔ اپنی رہائی کے بعد صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے اس نے بتایا کہ طالبان خاص طور پر اس کی تلاش میں تھے اور جب انہوں نے اس بس کو روکا جس میں وہ سوار تھا تو اگرچہ اس نے افغانیوں جیسا روپ دھار کر لمبی داڑھی اور پگڑی کا استعمال کیا تھا لیکن طالبان نے اسے تمام مسافروں میں سے آسانی سے شناخت کرلیا اور اتار کرلے گئے۔ اطالوی حکومت نے اس بات کی تصدیق کرنے سے انکار کردیا کہ اس نے ٹورسیلو کی رہائی کے لیے اغوا کاروں کو اٹھائیس لاکھ ڈالر کا تاوان دیا ہے۔ کچھ عرصے بعد جنگجوؤں نے ایک اور اطالوی صحافی ڈینیل ماسٹر گیاکوموکو اغوا کیا اور وہ بھی بعدازاں رہا کردیا گیا اور مبینہ طور پر اس کی رہائی کے لیے بیس لاکھ ڈالر ادا کیے گئے جس کی تصدیق البتہ نہیں کی گئی۔ طالبان کے ترجمان عبدالحق حنیف نے تسلیم کیا ہے کہ اغوا برائے تاوان کے ذریعے طالبان خاصی آمدنی حاصل کررہے ہیں۔

دیگر طالبان کمانڈروں نے بھی اغوا برائے تاوان کے واقعات میں کشش محسوس کی۔ جولائی دو ہزار سات میں طالبان کمانڈر عبداللہ منصور نے جنوبی کورین مشنریوں سے بھری ہوئی ایک پوری بس کو اغوا کرلیا جن میں سے دو مشنریوں کو تو انہوں نے فوری طور پر قتل کردیا۔ کہا

جاتا ہے کہ جنوبی کورین مشنریوں کی رہائی کے لیے ان کی حکومت نے پچاس لاکھ ڈالر کا تاوان ادا کیا تاہم جنوبی کوریا کی جانب سے تاوان کی ادائیگی کا انکار کیا جاتا رہا۔اغوا کے واقعات سے سرکاری حکام بھی محفوظ نہیں۔مثال کے طور پر افغانستان میں پاکستان کے سفیر طارق عزیز الدین کو اغوا کیا گیا اور اس کی رہائی کے لیے غیر مصدقہ طور پر پاکستانی حکومت نے پچیس لاکھ ڈالر کی رقم بطور تاوان ادا کی۔

اغوا برائے تاوان کا دھندہ گذشتہ چند سالوں کے درمیان خاصا بڑھا ہے۔افغان صحافی عبدالسمیع یوسف زئی کے مطابق طالبان نے اغوا کے واقعات کا ٹھیکہ چھوٹے جرائم پیشہ گروہوں کو دے دیا کہ وہ مالدار اور بااثر لوگوں کو اغوا کرتے اور پھر مقررہ قیمت کے عوض کے طالبان کو فروخت کر دیتے جو ان کے عوض ان کے خاندانوں سے بھاری تاوان وصول کر کے ان کو رہا کرتے۔

سمگلنگ:

افغانستان اور عسکریت پسندوں کے زیر قبضہ علاقہ نہایت غریب علاقہ ہے تاہم ان علاقوں میں قیمتی معدنی وسائل کی بھرمار ہے۔ان وسائل میں قیمتی پتھر،لکڑی اور سنگ مرمر شامل ہے جنہیں لاہور اور اسلام آباد کے مہنگے گھروں میں چھتوں اور دیواروں پر لگایا جاتا ہے اور یہ معدنی دولت دونوں طرف کے طالبان کے لیے پیسہ کمانے کا اہم ذریعہ بن چکا ہے۔

لکڑی کا کام کرنے والی کمپنیاں حکومت کو دور رکھنے کے لیے انتہا پسند عناصر سے قریبی تعلقات رکھتی ہیں۔پاکستان کی سرسبز وادی سوات کسی زمانے میں پائن کے جنگلوں سے بھری ہوئی تھی تاہم اب آریانہ انسٹی ٹیوٹ فار ریجنل ریسرچ اینڈ ایڈووکیسی نامی گروپ کے سروے کے مطابق اس علاقے سے پاکستانی طالبان کے دوسالہ قبضے کے دوران اب تک دس کروڑ ڈالر کی لکڑی کاٹی جا چکی ہے۔سرحد کے پار افغانستان میں کنہڑ صوبے میں یہی کچھ کیا گیا جہاں کے گھنے جنگلات کا صفایا کر دیا گیا۔لکڑی کی سب سے مارکیٹ پاکستانی صوبے پختون خواہ کے صدر مقام پشاور میں ہے جہاں ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مارکیٹ غیر قانونی پائن، بلوط اور جنگلی زیتون کی لکڑی سے بھری ہوئی ہے۔

قیمتی پتھر اور نوادرات بھی طالبان کے خزانے کو بھرتے ہیں۔مثال کے طور پر ان جنگجوؤں میں پاکستان کے صوبے پختونخواہ کے دور دراز علاقوں اور ان سے ملحقہ علاقوں میں ایمرالڈ کی کانوں پر قبضہ کر لیا۔اگرچہ اس تجارت کی مالیت کا کوئی بھی اندازہ نہیں لگا سکتا لیکن تاہم

مقامی حکام کا کہنا ہے کہ اس میں سے خاصا بڑا حصہ براہ راست طالبان کو ملتا۔ایک واقعے میں بتایا جاتا ہے کہ دو سو کے قریب مزدوروں سے ایمر اللڈ کی کانوں کی کھدائی کرائی گئی اوران سے وعدہ کیا گیا کہ اس میں دو تہائی حصہ ان کو دیا جائے گا جبکہ باقی طالبان نگرانوں کا ہوگا تاکہ انہیں اس علاقے میں لڑائی کے لیے امداد مل سکے۔

بھتہ خوری:

افغان خود یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے ملک کو جس سب سے بڑے چیلنج کا سامنا ہے وہ کرپشن ہے۔ پتہ چلا ہے کہ محصولات کا ایک اور پرکشش ذریعہ یہ ہے کہ افغان کمپنیوں کو ملنے والے ٹھیکوں میں سے بھتہ وصول کیا جائے۔گذشتہ سالوں کے دوران ملک کی تیزی سے خراب ہوتی صورت حال کے باعث قانونی طور پر کاروبار کرنے والے تاجروں کے لیے بھی اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ وہ جنگجوؤں اور جرائم پیشہ عناصر کی جانب سے حملوں سے تحفظ کے لیے ایک مخصوص حصہ طالبان کو دیں۔

امریکی وزیر خارجہ ہلیری کلنٹن نے دسمبر دو ہزار نو میں امریکی سینٹ کی آرمڈ سروسز کمیٹی کو بتایا کہ اس بات کے واضح شواہد موجود ہیں کہ طالبان خلیجی ممالک سے ملنے والی امداد اور منشیات سے حاصل ہونے والی آمدنی کے لیے غیر ملکی ٹھیکوں میں سے بھی ایک بڑا حصہ وصول کر رہے ہیں۔

کانگرس کے تحقیقات کاروں کا شبہ ہے کہ باغی جنگجو افغانستان بھر میں پھیلے ہوئے دو سو سے زائد امریکی اڈوں کو سپلائی کے سلسلے میں دیے جانے والے بڑے بڑے فوجی ٹھیکوں میں سے پیسہ کما رہے ہیں۔ 2.16 ارب ڈالر مالیت کے ایک دو سالہ ٹھیکے جسے'' ہوسٹ نیشن ٹرکنگ کنٹریکٹ'' کا نام دیا گیا کے تحت چھ ٹھیکے داروں کو فی کس تین سو ساٹھ ملین ڈالر کا ٹھیکہ دیا گیا جن کا کام تھا کہ وہ افغانستان میں امریکی فوجی اڈوں پر ضرورت کی ہر چیز سپلائی کریں جیسے خوراک، پانی ،ٹوائلٹ پیپر اور ہتھیار وغیرہ۔ان میں سے زیادہ تر ٹھیکے داروں کے پاس تو ٹرک تک موجود نہیں اور وہ آگے ٹھیکے دار رکھ کر کام چلاتے ہیں جو مال کی سپلائی بھی کرتے ہیں اور ان کی حفاظت کا بندوبست بھی ان کے ذمے ہوتا ہے۔کانگرس کی تحقیقات کے مطابق ٹرکوں کے ذریعے سپلائی کے اس کام میں گھپلے ہی گھپلے ہیں۔ٹھیکہ در ٹھیکہ اور ٹھیکہ در ٹھیکہ کی تہیں ہیں جن میں شفافیت کا امکان بہت کم اور فراڈ کا بہت زیادہ ہے۔اس سلسلے میں فوج کا رویہ ایسے ہی ہے جیسے جان بوجھ کر آنکھیں بند کر لی گئی ہوں۔

کوئی بھی اس بارے میں یقینی طور نہیں کہہ سکتا کہ اس عمل کے دوران کتنا پیسہ طالبان اور دیگر جنگجوؤں کی جیب میں جا رہا ہے۔ایک تخمینے کے مطابق یہ مالیت سینکڑوں ملین ڈالر میں ہے۔میساچسٹس سے امریکی ایوان نمائندگان کے ایک ڈیموکریٹ رکن جان ٹیرنی جو کہ ہاؤس سب کمیٹی آن نیشنل سیکورٹی اینڈ فارن افیئر کے چیئرمین ہیں اور جو اربوں ڈالر کے ٹھیکوں کی تحقیقات پر مامور ہیں ان کا کہنا ہے کہ اگرچہ امریکی حکومت کی توجہ تمام تر اس بات پر ہے کہ منشیات کی سمگلنگ اور خلیجی ریاستوں سے طالبان کو کتنا پیسہ مل رہا ہے لیکن اسے اس بات کا بہت کم علم ہے کہ خود اتحادیوں کی موجودگی کی وجہ سے وہاں پر کس قدر کرپشن ہو رہی ہے۔ان کا کہنا تھا کہ امریکی پالیسی سازوں کو اس بات کا گہرائی سے جائزہ لینا چاہیے کہ افغانستان میں امریکہ کی اربوں ڈالر کی امداد اور ٹھیکوں کی مد میں دیے جانے والے اربوں ڈالر کا نتیجہ نکل رہا ہے۔اس صورت حال کے حوالے سے امریکہ میں اور بھی کئی سطحوں پر تحقیقات ہو رہی ہیں۔

کچھ ماہرین اس بناء پر امدادی ایجنسیوں پر تنقید کرتے ہیں کہ وہ اس بات پر نظر رکھنے میں ناکام ہیں کہ ان کا پیسہ کس طرح خرچ کیا جا رہا ہے اور جس سے افغان عوام مایوسی کا شکار ہیں کیونکہ انہیں اپنے ملک میں ہونے والے ترقیاتی کام بہت کم دکھائی دے رہے ہیں۔ایک ترقیاتی ورکر سارا کمال کا کہنا ہے کہ افغانستان میں بیرونی حکومتوں کی جانب سے بہت سا پیسہ آ رہا ہے لیکن زیادہ تر ڈونرز کو اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ ان کا پیسہ اس کام کے لیے خرچ بھی ہو رہا ہے جس کے لیے بھیجا جا رہا ہے۔وہ بس اس کو خرچ کرنا چاہتے ہیں۔

بھتہ خوری کی ایک اور مثال طالبان کی جانب سے اپنے زیر غلبہ علاقوں میں قانونی طور پر کاروبار کرنے والوں سے ٹیکس وصول کرنے کا عمل ہے۔اقوام متحدہ کی مالی واچ ڈاگ بیرٹ کا کہنا ہے کہ ان کاروباروں کی فہرست خاصی طویل ہے کہ جن سے طالبان ٹیکس وصول کرتے ہیں۔مثال کے طور پر مختلف سہولیات جیسے پانی اور بجلی کی فراہمی اور ٹرانسپورٹ کمپنیوں سے سڑکوں کے استعمال پر ٹیکس کی وصولی۔ان کا کہنا تھا کہ یہ بات کسی قدر عجیب ہے کہ یہ سہولتیں طالبان فراہم نہیں کرتے نہ وہ ان کو پیدا کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ اپنی ستر فیصد آمدنی ان پر ٹیکس عائد کر کے کماتے ہیں۔پاکستان کے قبائلی علاقوں میں بھی یہی صورت حال ہے جہاں مرکزی حکومت نے کبھی اپنا حقیقی اختیار استعمال نہیں کیا۔ان علاقوں میں طالبان مختلف ذیل میں لوگوں سے ٹیکس وصول کرتے ہیں جس میں ٹرکوں اور مسافر بسوں سے لیا جانیوالا ٹیکس، پٹرول

پمپوں سے پٹرول کی مفت وصولی اور گھروں سے لیا جانے والا ٹیکس شامل ہے۔قبائلی علاقوں کے علاوہ بعض صورتوں میں لاہور، کراچی اور کوئٹہ جیسے شہروں میں بھی بزنس مینوں، سرکاری حکام اور تاجروں سے طالبان کے مقامی نمائندوں کی جانب سے ٹیکس لیا جاتا ہے۔

عطیات:

افغانستان اور پاکستان کے لیے اوباما ایڈمنسٹریشن کے سرکردہ نمائندے رچرڈ ہالبروک نے اس بات کا عزم ظاہر کیا کہ طالبان اوران سے متعلقہ گروپوں کے لیے مالی امداد فراہم کرنے والے عناصر کا پتہ چلایا جائے گا۔متعدد بار اس سینئر سفارت کار نے یہ کہا کہ صرف منشیات ہی طالبان کی آمدنی کا واحد ذریعہ نہیں ہیں۔سینٹ کی خارجہ امور کی کمیٹی میں انہوں نے بیان دیا کہ طالبان کو سب سے زیادہ پیسہ خلیجی ممالک اور دیگر علاقوں میں موجود ان کے ہمدردوں کی جانب سے مل رہا ہے۔

دیگر ماہرین کا ماننا ہے کہ افغانستان کے باہر اور اندر سے ملنے والے عطیات طالبان کی مالی امداد کا اہم ترین ذریعہ ہیں تاہم وہ اس مالی امداد کی حقیقی مالیت تک پہنچنے سے قاصر ہیں۔اقوام متحدہ سے تعلق رکھنے والے بیرٹ کا کہنا ہے کہ اعداد و شمار کا تعین کرنا مشکل ہے۔تاہم اس نے تخمینہ لگایا کہ طالبان کی پندرہ فیصد امداد غیر ملکی ڈونر کی جانب سے ہو رہی ہے۔انہوں نے کہا کہ یہ پتہ چلایا جا سکتا ہے کہ پیسہ آ رہا ہے اور خلیجی ممالک سے آ رہا ہے لیکن ذریعے کے بارے میں معلوم کرنا بہت ہی مشکل ہے۔

پاکستان اور افغانستان کی بڑی بڑی دکانوں جیسے جیولر شاپس، میڈیکل سٹورز اور دیگر بڑے سٹورز میں ایک شیشے کا بکس رکھا ہوتا ہے جس میں طالبان کے حامی لوگ ان کے لیے چندہ ڈالتے رہتے ہیں۔اس کے علاوہ مساجد، مدارس اور انفرادی طور پر بھی پیسہ جمع کیا جاتا ہے۔بعض عورتیں اپنے زیورات دے دیتی ہیں جبکہ مالدار مرد بڑی بڑی رقمیں دے ڈالتے ہیں۔پاکستان کے ایک سیاسی کارکن ڈاکٹر سعید عالم محسود کا کہنا ہے کہ کچھ امیر پشتون تاجر چندہ مہم کے نتیجے میں جمع ہونے والے ایک لاکھ ڈالر تک طالبان کو عطیے میں دے چکے ہیں تا کہ ان کی اور پابندی کا شکار لشکر طیبہ کی مدد ہو سکے۔وہی لشکر طیبہ جس نے مبینہ طور پر ممبئی میں حملے کیے اور اس کے نتیجے میں ایک سو ساٹھ لوگوں کی جانیں چلی گئیں۔

سعودی عرب اور دیگر عرب حکومتوں کی جانب سے کنٹرول سخت کیے جانے کے باوجود

خلیجی ممالک میں موجود طالبان کے حامیوں اور ہمدردوں کی جانب سے بھی بہت سا پیسہ آتا ہے۔ کچھ عسکریت پسند عناصر متحدہ عرب امارت اور دیگر امیر ممالک میں خود فنڈ ریزنگ کرتے ہیں۔ طالبان کی کمان ملا عمر کی قیادت میں پاکستان کے شہر کوئٹہ میں ہوتی ہے تاہم وہ اپنے نمائندے خلیج میں بھیج کر عطیات وصول کرتے ہیں۔ بیرٹ اور ایک امریکی اہلکار کے مطابق بعض مرتبہ یہ فنڈ ریزر پاکستانی پاسپورٹ پر سفر کرتے ہیں۔ بیرٹ کا کہنا ہے کہ حقانی نیٹ ورک کے خلیجی ریاستوں میں اپنے نمائندے موجود ہیں۔ دیگر ماہرین کا کہنا ہے کہ محسود قبیلہ جس کی پاکستان کی وزیرستان ایجنسی میں غالب اکثریت ہے اپنے قبیلے کے ان لوگوں سے چندہ اکٹھا کرتا ہے جو خلیجی ریاستوں میں کام کرتے ہیں۔ عبداللہ محسود کی تقاریر کی ویڈیوز میں وہ کہتا ہے کہ یہ آپ لوگوں کا مذہبی فریضہ ہے کہ کافروں کے خلاف اور ان غاصبوں کے خلاف جنہوں نے مسلمانوں کی زمین پر قبضہ کر لیا ہے ان کے خلاف جہاد کریں لیکن اگر آپ ایسا نہیں کر سکتے تو اپنے مال کے ذریعے اس میں شرکت کریں۔ چنانچہ اسکے بعد ایک غیر ہنر مند کارکن جیسے ڈرائیور بھی سالانہ ایک سو پینتیس ڈالر تک چندہ ادا کرتا ہے جبکہ ہنر مند کارکن جیسے الیکٹریشن وغیرہ سالانہ چار سو ڈالر تک چندہ مہیا کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں اتنا ہی کافی ہوتا ہے کہ طالبان کے لیٹر ہیڈ پر یہ ادائیگی کر دی جاتی ہے۔

اب یہ پیسہ جہاد کے لیے چندہ ہوتا ہے یا نہیں، اس کا انحصار دینے والے کی نیت پر ہوتا ہے۔ صحافی گریچن پیٹرز بتاتی ہیں کہ انہوں نے کئی لوگوں کا انٹرویو کیا کہ جنہوں نے آزادانہ طور پر طالبان کو پیسہ دینے کا اعتراف کیا لیکن ان کا کہنا تھا کہ انہوں نے ایسا صرف افغانستان میں موجود اپنے خاندانوں کے تحفظ کے لیے کیا۔ گریچن پیٹرز کے مطابق طالبان سمجھتے ہیں کہ لوگ جہاد کے لیے یہ پیسہ دیتے ہیں لیکن وہ سمجھتی ہیں کہ وہ یہ پیسہ معاوضے کے طور پر دیتے ہیں۔

طالبان کیلئے پیسے کے خلاف کریک ڈاؤن:

نیویارک میں گیارہ ستمبر کے حملوں کے نتیجے میں امریکی حکومت یہ جان چکی ہے کہ دہشت گردوں کے پیسے کے حوالے سے اچھی انٹیلی جنس کے نتیجے میں دہشت گردوں کے نیٹ ورک اور یہ کہ ان کی کارروائیوں کو کس طرح روکا جا سکتا ہے، اس بارے میں جاننے میں مدد ملتی ہے۔ اس معاملے میں ابتدائی ترین توجہ القاعدہ پر ہوتی ہے جنہیں خلیجی اور عرب ممالک سے مختلف

مالی اداروں، کاروباروں اور دولت مند افراد سے مدد ملتی ہے۔اس سلسلے میں پہلی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان کے کل پرزوں کو شناخت کیا جائے اور اثاثوں کو منجمد کیا جائے۔اس سلسلے میں عملدر آمد کا نظام کمزور ہوتا ہے اور فنانسروں کے لیے اپنے سرمایے کو منجمد ہونے سے بچانا بہت آسان ہوتا ہے۔نائن الیون کمیشن نے اس ناکامی کے بارے میں ان الفاظ میں لکھا کہ دہشت گردوں کو سرمایے سے محروم کرنے کی کوشش کرنا ایسے ہی ہے جیسے سمندر میں سے نالہ نکال کر کسی خاص قسم کی مچھلی کو پکڑنا۔

بدقسمتی سے امریکی حکومت اور افغانستا ن میں اس کے اتحادی طالبان اور دیگر انتہاپسندوں کو سرمایے کی فراہمی کے حوالے سے کوئی واضح تصویر بنانے میں بہت سست رفتار رہے ہیں۔ابتداء میں سی آئی اے اور دیگر ایجنسیوں کی اس طرف یا تو توجہ بہت کم رہی ہے یا پھر وہ وسائل کی کمی کی وجہ سے اس پیچیدہ مسئلے کی طرف خود کو مرکوز نہیں کر سکے۔سی آئی اے افغانستان میں سات سو آفیسر اور ٹھیکیداروں کے ذریعے خاصا کام کرتی رہی ہے تاہم اس کی زیادہ تر توجہ باغیوں کے خلاف نیم فوجی آپریشنوں پر رہی اور یہ سب کچھ روایتی انٹیلی جنس جمع بندی کی قیمت پر کیا گیا۔کابل میں امریکی سفارت خانے کے ایک سینئر اہلکار نے سی آئی اے کی شکایت کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں ان کی گردن دبا کر سب کچھ نکالنا ہوگا اور اگر ہم نے پیسے کے حوالے سے کنٹرول حاصل نہ کیا تو ہم یہ جنگ کرپشن کے آگے ہار جائیں گے۔

یہ بات کہ پنٹاگون اور دیگر ایجنسیوں نے پیسے کی فراہمی کے مسئلے پر اتنی توجہ نہیں دی، اس کو متعدد سرکردہ امریکی سینیٹروں بشمول اکثریتی لیڈر ہیری ریڈ اور ڈیان فین سٹین، جے راک فیلر، کٹ بونڈ اور ایوان بے، نے نیشنل سکیورٹی ایڈوائزر جنرل جیمز جونز کو لکھے گئے ایک خط کی صورت میں اٹھایا جس میں کہا گیا کہ ہمارے قاتل دشمنوں کو جس طرح پیسہ مل رہا ہے وہی ان کی زندگی ہے اور اس کی عدم موجودگی یا بہت کم موجودگی کی صورت میں طالبان اور القاعدہ جیسے دشمن ایک قابل ذکر وجود کے طور پر باقی نہیں رہیں گے۔ان سینیٹرز نے جنرل جونز پر زور دیا کہ وہ دشمنوں کے پیسے کے نیٹ ورک کو پتہ چلایا جائے اور اسے نشانہ بنایا جائے۔

تاہم حالیہ مہینوں کے دوران امریکی حکومت نے ان وسائل میں اضافہ کر دیا جن کے ذریعے باغیوں کو پیسے کی فراہمی کے ذرائع کو نشانہ بنانا مقصود تھا۔اس سلسلے میں مختلف مشن اور حکمت عملیاں ترتیب دی گئیں۔ابتدائی مشن یہ تھا کہ باغیوں کو پیسے کی رسائی کے بارے میں انٹیلی

جنس کو اکٹھا جائے اور ان کا جائزہ لیا جائے تاہم اس کے بعد اس ہدف کو پھیلا دیا گیا۔

زیادہ تر معلومات ٹیلی فون ٹیپ کرنے کے نظام کے تحت لی گئیں جس کے لیے افغانستان کی خصوصی عدالت سے منظوری لی گئی۔ ایجنٹوں نے اس سلسلے میں خصوصی منظور شدہ افغان پولیس کی یونٹوں کے ساتھ کام کیا جس کے لیے مختلف حوالہ ڈیلروں کے ٹیپ شدہ فون گفتگو کی بنیاد پر سرچ وارنٹ لیے گئے۔ حوالے ڈیلروں پر چھاپے مارے گئے اور ان کے قبضے سے ایسا ریکارڈ حاصل کیا گیا جس سے منشیات کے سمگلروں اور جنگجوؤں کے آپسی تعلقات کی ایک واضح تصویر سامنے آتی تھی۔ ایک واقعے میں کابل کے حوالہ ڈیلر سے شہادتیں قبضے میں لی گئیں جن کو آگے قانون نافذ کرنے والے اداروں کے حوالے کیا گیا جن کے ذریعے آسٹریلیا، برطانیہ اور نیدرلینڈ میں فوجداری مقدمات قائم کیے گئے۔

مختلف کیسوں میں پیش رفت کے ساتھ ساتھ جو شواہد اور واقعات سامنے آتے رہے ہیں ان سے جنگجوؤں کی مالی امداد کے بارے میں بہت سے نئے قسم کے ذرائع اور طریقوں کا پتہ چلا۔ منشیات کے علاوہ ایسے بے شمار ذرائع سامنے آرہے تھے جن کے ذریعے طالبان اور دیگر عسکریت پسند گروپ اپنے لیے پیسہ حاصل کر رہے تھے۔ اس میں سمگلنگ بھی شامل ہے، اغوا بھی شامل ہیں۔ اس میں مختلف کاروباری افراد سے لیا جانے والا بھتہ بھی ہے اور قیمتی پتھروں کی سمگلنگ بھی اس میں ہے۔ اس میں چھوٹے جرائم سے لیکر بڑے جرائم سب شامل ہیں۔ ان تمام کامیابیوں میں افغان تھریٹ فنانس سیل (ATFC) اور DEA کا اہم کردار رہا ہے۔

بعض واقعات میں ATFC کی جانب سے اکٹھے کیے جانے والے شواہد کی مدد سے کئی فوجداری مقدمات قائم کیے گئے۔ بعض واقعات میں انٹیلی جنس امریکی فوج کے حوالے کی گئیں اور ان کے ذمے جنگجوؤں کی مالی مدد کرنے والے منشیات کے سمگلروں کا پتہ چلانے اور ان کے قلع قمع کی ڈیوٹی لگائی گئی۔ اگست 2009 کی ایک رپورٹ کے مطابق سینٹ کی خارجہ امور کی کمیٹی نے انکشاف کیا کہ فوج کوئی پچاس کے قریب ایسے منشیات کے سمگلروں کی فہرست بنا چکی ہے جو جنگجوؤں کو سرمایہ فراہم کرتے ہیں اور جن کو گرفتار یا ہلاک کرنے کا ہدف بنایا گیا ہے۔

منشیات کی تجارت کی طرف کئی سالوں تک توجہ نہ دینے کے بعد اب امریکی فوج اس مسئلے کو سنجیدگی سے لے رہی ہے کیونکہ کمانڈر اس بات کو جان چکے ہیں کہ جنگجوؤں کو شکست دینے کے لیے پہلے ان کو سرمایہ کی فراہمی روکنا ضروری ہے۔ اے ٹی ایف سی کے سربراہ مائر کا کہنا ہے کہ

پہلے طالبان کو سرمایے کی فراہمی کے حوالے سے زیادہ نہیں سوچا گیا لیکن اب ایسا کرنا ضروری ہے۔اب ضرورت اس امر کی ہے کہ یہ نہ پوچھا جائے کہ ''تم نے یہ رائفل کہاں سے لی ؟'' بلکہ یہ پوچھنا چاہیے کہ ''تم نے اس رائفل کے لیے پیسے کس طرح ادا کیے اور یہ پیسے کہاں سے آئے ؟''

منشیات اور باغیوں کے درمیان تعلق کی اس سے بہتر تصویر کشی اور کوئی نہیں ہوسکتی جو مئی 2009ء میں پوست کی کاشت کے سب سے بڑے صوبے ہلمند کے دارالحکومت لشکر گاہ سے پندرہ میل دو مرجاہ ضلع میں ہوئی۔کیپٹن مائیکل ایرون کا کہنا ہے کہ مرجاہ ضلع کے واقعے سے یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ اگر آپ باغیوں کو کمزور کرنا چاہتے ہیں تو ان کو اس وقت نشانہ بنائیں جب پوست کی فصل کاٹنے کا موسم ہوتا ہے تاکہ آپ کسانوں کو الگ تھلگ نہ کریں۔اس کا کہنا تھا کہ کسان تو صرف اپنے خاندان کی روزی روٹی کے لیے یہ فصل اگاتے ہیں اور انہیں کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ اس فصل سے یورپ میں بچے ہلاک ہوتے ہیں۔اگر آپ کو ان کو کوئی متبادل نہیں دیں گے تو آپ اپنے مشن میں کامیاب نہیں ہوں گے اور کسان پوست اگانے پر مجبور ہوں گے۔اب آپ کو مرجاہ کے واقعے کے بارے میں بتاتے ہیں جہاں امریکی ، افغان اور اتحادی کمانڈروں کی 216 رکنی فوج نے ساٹھ کے قریب جنگجوؤں کو ہلاک کر کے سوٹن ہیروئن ، افیم پیسٹ اور پوست کے بیج برآمد کر لیے جن کی مالیت چالیس لاکھ ڈالر کے لگ بھگ تھی۔فوجیوں نے کیمیکلز کے پچپن ڈرم بھی برآمد کیے جو منشیات کی مالیت کے ہی تھے۔منشیات کے تاجروں اور باغیوں کے تعلق کا واضح ثبوت اس شکل میں سامنے میں آیا کہ وہاں سے ہتھیار، خودکش جیکٹیں ، دھماکہ خیز مواد اور ایک غیر رسمی کلینک بھی ملا جہاں طالبان اپنے زخمیوں کا علاج کرتے تھے۔میجر سلیوان کے مطابق چالیس لاکھ ڈالر کی اس منشیات کی برآمد سے یقینی طور پر طالبان کو دھچکا پہنچا ہوگا کیونکہ اس میں سے بڑا حصہ ان کو ملنا تھا۔

اگرچہ طالبان کو پیسے کی فراہمی روکنا مسئلے کے حل میں سے ایک ہے لیکن امریکی اور افغان حکام کا کہنا ہے کہ اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ افغانستان اور پاکستان میں مالی لین دین کے قاعدوں کو ٹھیک کیا جائے اور خلیجی ملکوں سے کہا جائے کہ وہ بھی باغیوں کو پیسے کی فراہمی روکنے کے لیے اپنی کوششوں کو مضبوط بنائیں۔اقوام متحدہ کے حکام کا کہنا ہے کہ افغانستان کے مرکزی بینک کے ذریعے کچھ پیش رفت ہوئی ہے جس نے ملک کے اکثر حوالہ ڈیلروں کو رجسٹر کر لیا

MashalBooks.org

ہے اور امریکی تربیت یافتہ مالی تحقیقات کاروں کی ایک ٹیم بنائی ہے تاکہ منشیات کے سمگلروں اور ان سے ملے ہوئے دیگر کرپٹ حکام کے خلاف فوجداری مقدمات قائم کیے جائیں۔

کچھ حلقوں کا کہنا ہے کہ طالبان اور ان کے بھائی بندوں نے اپنی مالی معاونت پر اس حملے کے خلاف ردعمل ظاہر کیا ہے۔ اٹھارہ جنوری کو سات جنگجوؤں نے کابل کے وسط میں صدارتی محل اور وزارت انصاف اور مرکزی بینک سے پچاس قدم کے فاصلے پر ایک شدید حملہ کیا۔ یہ حملہ اصل میں باغیوں کی جانب سے پیغام تھا کہ ان کی مالی امداد کو روکنے کی کوئی بھی قسم کی کوشش کی گئی تو وہ کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ دہشت گردوں کو سرمایے کی فراہمی کی روک تھام کے حوالے سے امریکی اہلکار ڈیوڈ کوہن کے مطابق جنگجوؤں کا ہدف افغان سنٹرل بینک تھا جو کہ ملک کے مالیاتی قواعد تشکیل دیتا ہے۔

MashalBooks.org